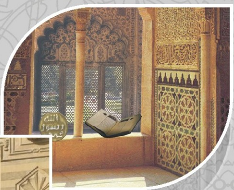
ہزار سال پہلے

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ

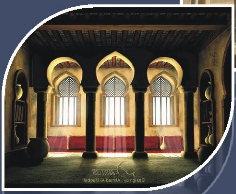
مع ضمیمہ

دار العلوم دیوبند کی یادیں اور مولانا گیلانی کی علمی خدمات

از: مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی زید مجدہ







ترتیب جدید و اضافات مفیدہ

عمر أنور بدخشانی
اُستاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

زمزم پبلشرز

ہزار سال پہلے

تالیف

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

ترتیب جدید و اضافات

محمد عمر انور

استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

للطباعة والنشر والتوزیع

پیش لفظ

مولانا سید مناظر احسن گیلانی صاحب رحمہ اللہ کا نام سب سے پہلے اس وقت سنا جب کہ میں درس نظامی کے تیسرے درجے میں تھا، اور اس تعارف کا سبب آپ کی وہ کتاب (''احاطۂ دار العلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن'') بنی جو کہ آپ کے زمانہ طالب علمی کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے، زمانہ طالب علمی کی یادیں دل ودماغ میں ہمیشہ ایک خوشگوار احساس بن کر ابھرتی ہیں جنہیں بسا اوقات بلا اختیار قلم بند کر لینے کو جی چاہتا ہے، آپ کی یہ کتاب بھی کچھ ایسی ہی ہے، پھر وہ کتاب ایک بار نہیں کئی بار پڑھی۔

کچھ ہی عرصے کے بعد آپ کی ایک اور کتاب ''برصغیر میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' پڑھنے کا اتفاق ہوا، یہ کتاب مشرق کے نظام تعلیم وتربیت میں سند کا درجہ رکھتی ہے، اور اس میں برصغیر کے تعلیمی نظام کی تاریخ کا مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد سے تو آپ کے انداز تحریر اور منفرد اسلوب کا ایسا چسکا لگا کہ یکے بعد دیگرے آپ کی تمام کتابوں کا مطالعہ کیا۔

آپ نے تقریباً تمام اہم موضوعات پر خامہ فرسائی کی، حدیث اور حجیت حدیث کے موضوع پر ایک مبسوط کتاب ''تدوین حدیث'' تحریر فرمائی، اس کی اہمیت اور مقبولیت دیکھتے ہوئے استاذ محترم ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر صاحب مدظلہم (مہتمم جامعہ بنوری ٹاؤن) نے عربی ترجمہ کیا، اور حال ہی میں یہ ترجمہ عالم اسلام کے مشہور محقق ڈاکٹر بشار عواد معروف بغدادی کے

مقدمہ اور توجہ سے بغداد سے شائع ہو چکا ہے، تصوف واحسان کے موضوع پر آپ کے مختلف مضامین ''مقالات احسانی'' کے نام سے شائع ہوئے جو کہ اب نایاب ہے، آخری بار یہ کتاب مجلس علمی کراچی کے اہتمام سے شائع ہوئی تھی، آپ نے سورۂ کہف کی تفسیر بھی تحریر فرمائی تھی جو کہ ''دجالی فتنوں کے نمایاں خدوخال'' کے نام سے اب شائع ہو چکی ہے، مذکورہ تینوں کتابیں جیسا کہ ماقبل میں ذکر ہوا سلسلہ وار مضامین تھے جو اس دور کے مجلات میں شائع ہوتے رہے، ان تینوں کتابوں کو آپ کے شاگرد مولانا غلام محمد صاحب (بی-اے، عثمانیہ) نے ترتیب وتبویب وعنوان بندی کا اہتمام کر کے شائع کروایا تھا، فقہ کے موضوع پر آپ نے ''تدوین فقہ'' کے نام سے کتاب تحریر فرمائی، جو کہ تاحال غیر مطبوع ہے، البتہ اس کا مقدمہ ڈاکٹر عبد الرشید جالندھری صاحب کی محنت سے چھپ کر شائع ہوا تھا، یہ مقدمہ بھی اب نایاب ہے، تدوین فقہ اور حدیث کے علاوہ آپ نے ''تدوین قرآن'' کے نام سے بھی مضامین لکھے تھے، معیشت کے عنوان سے آپ نے ''اسلامی معاشیات'' سپرد قلم فرمائی، سیرت کے موضوع پر ''النبی الخاتم'' جیسی شہرۂ آفاق کتاب لکھی، تذکرہ وسوانح کے موضوع پر آپ نے ''امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی''، ''شاہ ولی اللہ''، ''سوانح قاسمی''، ''مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی'' اور ''حضرت ابوذر غفاری'' تحریر فرمائی، آخر الذکر کتاب مولانا گیلانی کی پہلی تصنیف ہے جو کہ زمانہ طالب علمی کی یادگار ہے، اس کتاب کو پڑھ کر حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی:

> ''مقالہ نگار سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں لیکن اس مضمون کو دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ محقق نہیں ہو چکے ہیں تو محققیت متوقعہ کی دلیل ان کا یہ مضمون ضرور ہے'' [ملاحظہ ہو ''مقالہ اطلاقی تصوف'']

غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مولانا گیلانی رحمہ اللہ کی اکثر وبیشتر تصانیف ایسی ہیں جو مستقل کتاب کا موضوع اور نام سامنے رکھ کر نہیں لکھی گئیں، بلکہ آپ نے مختلف جرائد ورسائل میں جو مضامین لکھے تھے، انہی سلسلہ وار مضامین نے بعد میں کتابی صورت اختیار کر لی۔

آپ ایک منفرد اسلوب تحریر کے مالک تھے، تحریر کے اس انداز کے آپ ہی موجد تھے اور آپ ہی خاتم، آپ کی تصانیف اور مضامین کے بارے میں اہل علم کے ہاں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ ربط اور ترتیب سے خالی ہیں، اس وجہ سے وہ جدید طرز تصنیف کے معیار حسن کو نہیں پہنچتیں ہیں، اس ضمن میں آپ کے شاگرد خاص مولانا غلام محمد صاحبؒ (بی-اے، عثمانیہ) ''مقالات احسانی'' کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

''ان سارے کمالات کے ساتھ طبیعت پر جذب کا اثر کچھ اس درجہ غالب تھا کہ مولانا کی کوئی تحریر کامل طور پر مرتب و مربوط نہیں ملتی، علوم کا ورود اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ متعلق وغیر متعلق کا انتخاب ان کے محال ہو جاتا تھا، وہ تیزی سے قلمرانی فرماتے، فقروں کی تقسیم اور عنوانات کا قیام کا ان کو مطلق شعور نہ رہتا تھا، اور قلم روکنے سے پہلے ان کو خود اندازہ نہ ہوتا تھا کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ مضمون ہو جائے گا یا کتاب بن جائے گی، اور اس سب کے باوجود اپنے مسودات پر دوبارہ نظر کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ فرماتے تھے، ان کے مسودوں کی ترتیب وتدوین ان کے معتمد علیہ شاگردوں اور عقیدت مندوں کے سپرد ہوتی تھی یا ناشروں کے رحم وکرم پر منحصر رہتی''۔

آگے چل کر مزید تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا [گیلانی] خود فرماتے تھے کہ ان کی کوئی تصنیف بھی باضابطہ تصنیفی پروگرام کے ماتحت انجام نہیں پائی، یہی ہوتا رہا کہ کسی نے کسی مضمون کی فرمائش کی، مولانا لکھنے بیٹھ گئے، جب لکھ چکے تو وہ مضمون، مضمون نہ رہا بلکہ کتاب تیار ہو گئی، چنانچہ'' [برصغیر میں مسلمانوں کا] نظام تعلیم وتربیت'' اور خود'' النبی الخاتم'' وغیرہ اسی قبیل کی تصنیفات ہیں۔

اس قسم کی کتابوں کے علاوہ دوسری صورت یہ ہوتی رہی کہ کالج

کے لیکچرز کی تیاری یا ایم-اے اور پی ایچ-ڈی کے طلبہ کے مقالات کی رہبری کے سلسلہ میں مختلف موضوعات پر جو معلومات فراہم کرنا پڑیں، وہ اتنی زیادہ اور قیمتی تھیں کہ ہر موضوع کی ایک مستقل کتاب خود بخود تیار ہوگئی، الدین القیم، اسلامی معاشیات، تدوین حدیث اور تدوین قرآن وغیرہ سب اسی نوعیت کی تالیفات ہیں''۔

عالم اسلام کے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے اس بارے میں نقل کرتے ہوئے آپ کے یہی شاگرد لکھتے ہیں:

''مذکورہ صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مولانا کی تصنیفات جدید طرز تصنیف کے معیار حسن کو نہیں پہنچتیں مگر بقول عہد حاضر کے مشہور محقق محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ان تصانیف کو اسلوب نگارش اور ربط تحریر کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ ان میں علوم وحقائق اور استنباط واستخراج مسائل کا کس قدر گراں بہا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے''۔

اب زیر نظر کتاب کی طرف آیئے! مادر علمی جامعہ علوم اسلامیہ (علامہ بنوری ٹاؤن) کے کتب خانے میں راقم سطور چند کتابوں کو تلاش کر رہا تھا اسی دوران ایک پرانی اور بوسیدہ سی ہندوستان کی مطبوعہ کتاب ہاتھ لگی، کتاب اپنے نام اور موضوع کے اعتبار سے اگرچہ میرے لیے بالکل انوکھی تھی لیکن مصنف کا نام ہرگز نیا نہ تھا، اور پھر مضمون اتنا دلچسپ کہ تقریباً ایک یا دو نشست میں ہی پوری کتاب کا مطالعہ کر ڈالا، دوران مطالعہ اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ اگر اس کتاب کو از سر نو جدید ترتیب کے ساتھ طبع کیا جائے تو تاریخ کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

یہ مضامین مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے مسلمان جغرافیہ وتاریخ نویس مؤلفین

کی کتب کے مطالعے کے دوران موضوع کی مناسبت سے اپنے پاس قلم بند کر لیے تھے، پھر دارالعلوم دیو بند کے مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کے کہنے پر آپ نے یہ مضامین مجلہ ''دارالعلوم'' میں چھپنے کے لیے دیدیئے، بعد میں وہ رسالہ بند ہو گیا اور پھر دارالعلوم دیو بند کے طلباء کی کوششوں اور مولانا سید ازہر شاہ قیصر کی سفارش سے مختلف منتشر مضامین چھپ کر پہلی بار سامنے آئے۔

مقام حیرت ہے کہ مولانا گیلانیؒ پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں ہیں ان میں آپ کی تصانیف کے تذکرے میں کہیں پر بھی ''ہزار سال پہلے'' کا تذکرہ نہیں ملتا، حتیٰ کہ آپ کے انتہائی قریبی شاگردوں نے بھی اس کے ذکر سے احتراز فرمایا ہے، ہر ممکن کوشش کی گئی کہ کہیں سے بھی اس کا تذکرہ مل جائے لیکن تا حال کامیابی نہیں ہو سکی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ کتاب ہندوستان میں صرف ایک ہی بار ۱۹۵۱ء میں چھپی تھی اور وہ بھی محدود تعداد میں، اور دوسری بنیادی وجہ راقم سطور کی کوتاہی۔

دوران تالیف آپ نے جگہ جگہ ان مورخین وسیاح کے حوالے دیے ہیں جن کی کتب سے آپ نے یہ شذرات واقتباسات اکٹھے کیے تھے، ان پر ایک اجمالی نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ نے یہ مضامین لکھنے میں کتنی کتب سامنے رکھیں اور کس قدر محنت فرمائی، چنانچہ جن مورخین کی کتابوں سے آپ نے زیادہ تر استفادہ فرمایا ہے ان کی فہرست درج ذیل ہے:

① ابن خُرداذبہ، عبداللہ بن احمد بن خُرداذبہ (۲۰۵ھ-۲۸۰ھ)۔

② ابن عبدربہ اندلسی (متوفی ۳۲۸ھ)۔

③ شہاب الدین ابو عبداللہ یاقوت حموی (متوفی ۶۲۲ھ مطابق ۱۲۲۵ء)

④ ابن اثیر، علی بن محمد بن عبدالکریم (۵۵۵ھ-۶۳۰ھ)۔

⑤ ابن بطوطہ، محمد بن عبداللہ بن محمد (۷۰۳ھ-۷۷۹ھ)۔

⑥ ابن الفقیہ الہمدانی، احمد بن محمد بن اسحاق (متوفی ۳۴۰ھ)۔

⑦ابن القفطی، علی بن یوسف بن ابراہیم (۵۶۸ھ-۶۴۶ھ)۔

⑧ابن کثیر، اسمعیل بن عمر بن کثیر (۷۰۱ھ-۷۷۴ھ)۔

⑨ابن عساکر، علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ (۴۹۹ھ-۵۷۱ھ)۔

⑩ابن ابی اصیبعہ، احمد بن القاسم بن خلیفہ (۵۹۶ھ-۶۶۸ھ)۔

⑪ابن حوقل، محمد بن حوقل البغدادی (متوفی ۳۶۷ھ)۔

⑫ابن قدامہ مقدسی، سلیمان بن حمزہ بن احمد بن عمر (۶۲۸ھ-۷۱۵ھ)۔

⑬ابن سعد، محمد بن سعد بن منیع الزہری (۱۶۸ھ-۲۳۰ھ)۔

⑭قلقشندی، احمد بن علی بن احمد (۷۶۵ھ-۸۲۱ھ)۔

⑮مسعودی، علی بن الحسین بن علی (متوفی ۳۴۶ھ)۔

⑯ابوشامہ، عبدالرحمن بن اسمعیل بن ابراہیم (۵۹۹ھ-۶۶۵ھ)۔

⑰مقریزی، احمد بن علی بن عبدالقادر (۷۶۶ھ-۸۴۵ھ)۔

⑱جاحظ، عمرو بن بحر بن محبوب (۱۶۳ھ-۲۵۵ھ)۔

⑲علامہ شہاب الدین محمود آلوسی بغدادی (۱۲۷۳ھ-۱۳۴۲ھ)۔

⑳ کمال الدین دمیری، محمد بن موسیٰ بن علی (۷۸۷ھ-۸۲۳ھ)۔

㉑امیر شکیب ارسلان، شکیب بن محمود بن حسن (۱۲۸۶ھ-۱۳۶۶ھ)۔

㉒جرجی زیدان، جرجی بن حبیب زیدان (۱۲۷۸ھ-۱۳۳۲ھ)

㉓سید محبوب رضوی (متوفی ۱۹۷۹ء)۔

㉔بزرگ بن شہریار (۹۱۲-۱۰۰۹ء)۔

کتاب کی اس نئی طباعت میں عنوانات کا جابجا اضافہ کردیا گیا ہے، نیز سابقہ طباعت میں حاشیے بہت طویل تھے اور مستقل تاریخی مضامین پر مشتمل تھے چنانچہ انہیں اصل کتاب میں اس طریقے سے ملا دیا گیا ہے کہ کہیں پر بھی حاشیہ ہونے کا گمان نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے کوئی فنی

سقم پیش آیا، ہوسکتا ہے کہ اہل تحقیق حضرات اس سے اختلاف کریں اور تحقیق کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن جیسا کہ ماقبل میں مولانا گیلانی کی تصنیف میں عادت کا ذکر ہوا اس کے پیش نظر یہ ضروری تھا، بعض جگہ عربی اور فارسی عبارات کے تراجم نہیں تھے، قارئین کی سہولت کے لیے ان کا ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے، ہندوستان کے نسخہ میں عربی اقتباسات میں بیحد غلطیاں تھیں جنہیں اصل کی طرف مراجعت کر کے درست کرلیا گیا ہے جس کے لیے میں ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی صاحب کا شکر گزار ہوں، دیوبند اور اکابر دیوبند کے حوالے سے استاد محترم ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی صاحب نے اپنی مصروفیات اور مشاغل کے باوجود تفصیلی مضمون تحریر فرمایا یہ ان کی شفقت ہے، اللہ سے دعا ہے کہ اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

محمد عمر انور

فاضل و متخصص فی الفقہ الاسلامی

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری مدظلہ

الحمد لله حمدا كثيرا طيبا ، والصلوة والسلام على من جاء بالحق بشيرا ونذيرا ، وعلى اله وصحبه اجمعين ، أما بعد :

ازہر الہند دار العلوم دیوبند کے عالم اسلام پر بے پایاں احسانات ہیں دار العلوم دیوبند نے عالم اسلام کو کیا دیا؟ اگر کوئی مشاہدہ کرنا چاہے تو دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جائے وہاں کی دینی خدمات کا جائزہ لے تو بالواسطہ یا بلاواسطہ اسے دار العلوم دیوبند کا فیض ضرور نظر آئے گا۔ دار العلوم دیوبند نے امت مسلمہ کو ہر شعبہ میں ایسے رجال کار عطا جنہوں نے اپنے فن اور شعبہ میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو اس انداز سے نکھارا کہ وہ عالم اسلام کی بے مثال شخصیات میں شمار ہوئے اور ان کے کارناموں کو جودت وندرت کے تمغوں کے علاوہ لازوال کوشش کی سند بھی عطا ہوئی۔

دار العلوم دیوبند کے فرزندوں میں سے ایک عظیم فرزند حضرت علامہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ ہیں جن کی شخصیت پر مجھ جیسے ادنی طالب علم کا کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، کیونکہ شاید ہی کوئی ایسا علمی وادبی حلقہ ہو جس میں آپ کی تدریسی مہارت کی شہرت اور تحریری ذوق وکمال کا چرچا نہ پہنچا ہو، بلا مبالغہ آپ کی معلومات ومشاہدات کے علمی احاطہ کا اندازہ بھی کارے دارد! آپ ایک کثیر المطالعہ شخصیت تھے، آپ نے مطالعاتی اسفار اور سیاحت کے دوران مختلف تاریخی کتب سے جو عجائب وغرائب اور اس قدیم زمانے کی تہذیب، تمدن اور ثقافت کو سبق آموز محسوس فرمایا انہیں اپنے پاس قلم بند کرلیا، اور پھر یہ سلسلہ

دارالعلوم دیوبند کے مجلّے میں طویل عرصے تک چھپتا رہا، یہ ایک نہایت مفید، تاریخی اور معلوماتی سلسلہ تھا جس کو قارئین میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی، یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند کے تشنگان علوم نبوت کے بے حد اصرار پر مختلف شماروں میں بکھرے ہوئے تاریخی شذرات کو کتابی شکل دی گئی، اس طرح قدیم تہذیبی جھلکیوں کا حسین گلدستہ منظر عام پر آ گیا۔

لیکن یہ آج سے پچپن برس قبل کی بات ہے، عرصہ سے یہ قیمتی تاریخی سرمایہ قدیم کتب خانوں کے گوشوں میں دب کر رہ گیا تھا اسے جدید طباعت کے علاوہ ترتیب، تہذیب اور عناوین کی کچھ ضرورت بھی تھی جسے ہمارے استاذزادے عزالقدر برادرم مولوی محمد عمر انور بن مولانا محمد انور بدخشانی صاحب مدظلہ نے محسوس فرما کر اپنے والد کے علمی جانشین ہونے کا ثبوت دیا، چنانچہ یہ قیمتی خزینہ جدید اسلوب اور عصری تقاضوں کی رعایت کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کی اس کوشش کو قبول فرمائے، اور انہیں علمی ذوق کی مزید فراوانی نصیب فرمائے، اور انہیں علم وعمل کا جامع بنائے، آمین۔

وما ذلك على الله بعزيز

وصلى الله وسلم على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين

سید سلیمان یوسف بنوری
نائب رئیس
جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن

ڈاکٹر خورشید رضوی

دارالعلوم دیوبند کے نمایاں ترین فرزندوں کی مختصر سے مختصر فہرست میں بھی مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا، مولانا کا علم و فضل اور صلاح و تقوی کسی تعارف کا محتاج نہیں، تقریر و تحریر دونوں میں کمال حاصل تھا، آپ کے قلم سے نکلنے والے مقالات و کتب کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کے متنوع موضوعات طبیعت کی گونا گونی کا پتا دیتے ہیں۔

زیر نظر کتاب ''ہزار سال پہلے'' عالمی تہذیب و تمدن کے دلچسپ اور انوکھے پہلوؤں پر مولانا کے رشحات قلم سے عبارت ہے، کتاب کی اشاعت کو نصف صدی سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے مگر اس کے مندرجات کی دل نشینی ہنوز برقرار ہے، تاہم اب ایک مدت سے اس کی کمیابی نایابی کی حدود کو چھو رہی تھی، ایسے میں اس کی اشاعت تازہ ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں جس پر مرتب کتاب محمد عمر انور صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

اصل کتاب کا طرز نگارش اپنے زمانے کا تھا جس میں جدید ذوق کے مطابق ترتیب، تنسیق اور عنوان بندی کا اہتمام نہ تھا، طویل حواشی کا پھیلاؤ بھی کتاب کی خوانائی (Readability) میں حائل تھا، عربی فارسی کا مذاق چونکہ اس زمانے میں عام تھا اس لیے ان زبانوں کے اقتباسات کا ترجمہ ضروری نہیں سمجھا گیا تھا، محمد عمر انور صاحب نے بڑی محنت سے حواشی کو متن ہی میں مناسب مقام پر اس خوش اسلوبی سے سمو دیا ہے کہ پیوند کا احساس نہیں ہوتا، عربی فارسی عبارتوں کا ترجمہ شامل کر دیا ہے، اور مختلف عنوان قائم کر کے کتاب کی تبویب و ترتیب نو کر دی ہے، اس طرح ایک یادگار کتاب نہ صرف زندہ بلکہ پہلے سے بڑھ کر موثر بھی ہو گئی ہے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

از

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر

صاحبزادہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

دیو بند نے اپنی زندگی کے گزشتہ نوے سال میں علماء، صلحاء اور فضلاء کی جو ایک کثیر جماعت پیدا کی اور جو اپنے علمی فضائل، بہترین خصائل، اچھے کردار، پختہ سیرت اور علمی و عملی صلاحیتوں کی بنا پر ماضی میں مسلمانوں کی مذہبی اور قومی زندگی کی ایک زبردست خدمت گزار ثابت ہو چکی ہے اور مستقبل میں جس کا وجود آب و ہوا کی ناموافقت اور موسم کی قدرارتی ناسازگیوں کے گھپ گھپاؤں میں ایک روشن چراغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے مخدوم و محترم صاحب العالی والمناقب حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی دام ظلہ اس جماعت کے ایک ممتاز فرزند ہیں۔ حضرت مولانا اپنی قیمتی تصانیف، بے شمار علمی خدمات، تدریسی خصوصیات، اعتدال فکر، پاکیزگی مذاق اور علوم حدیث و قرآن اور ان سے متعلقہ مضامین کے علاوہ عصری معلومات اور دور حاضر کی علمی تحقیقات کے ایک نامور سرمایہ دار اور مسلم الثبوت استاد ہونے کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ جس طرح چاند اور سورج کی روشنی، چاند اور سورج کی سب سے بڑی تعریف اور سب سے بڑا تعارف ہے اور اس روشنی کی موجودگی میں دونوں خارجی تعارف کے محتاج نہیں۔ اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی کے علوم و افکار ان کے تعارف کا سب سے بڑا

ذریعہ ہیں اور اہل نظر و بصر کے لیے ان کا یہی سرمایہ علم و فن ایک کارآمد ذریعہ تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت مولانا صوبہ بہار کی مردم خیز سرزمین کے ایک درشاہوار ہیں۔ ضلع مونگیر کا خوش نصیب قریہ ''گیلانی'' ان کا وطن مالوف ہے۔ آپ ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو اپنے مادری وطن موضع استھانواں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی مکتبی تعلیم موضع گیلانی میں اپنے چچا مولانا حکیم حافظ حافظ سعید ابوالنصیر گیلانیؒ سے حاصل کی۔ ۱۳۲۴ھ میں مولانا برکات احمد صاحب کی خدمت میں ٹونک تشریف لائے اور وہاں درس نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند پہنچے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ سے بخاری اور ترمذی پڑھی، صحیح مسلم سیدنا الامام حضرت مولانا الشاہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، اور ابوداؤد حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ و مولانا سید اصغر حسین صاحب سے پڑھی۔

حضرت مولانا سید حسین صاحب، مدنی مدظلہ العالی سے نسائی اور دیگر اساتذہ سے دورۂ حدیث کی باقی کتب پڑھیں۔ فراغت کے بعد یہاں ڈیڑھ سال مجلات ''القاسم'' و ''الرشید'' دیوبند کی ادارت کا کام انجام دیتے رہے، آخر میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں شعبہ تعلیمات سے تعلق قائم ہوا اور اب وظیفہ یاب ہو کر اپنے وطن گیلانی میں خانہ نشین ہیں۔ ۱۳۳۲ھ میں دورۂ حدیث کا امتیازی نمبروں میں امتحان پاس کیا تھا۔

دیوبند کے دوران قیام میں آپ کو وقت کے جدید علماء و محققین سے علمی فوائد حاصل کرنے کا بہترین موقعہ ملا۔ ایک طرف یہ نامی گرامی اساتذہ تھے، جن کی بارگاہ سے ہر وقت علم و فضل کے نادر ذخیرے بہترین اور سرمائے مستحق اصحاب کو بڑی سخاوت و سیر چشمی کے ساتھ تقسیم ہوتے رہتے تھے اور دوسری طرف مولانا مناظر احسن گیلانی سا شاگرد جن پر حق تعالیٰ شانہ کی رحمت ربانیہ نے علم کے دروازے کھول تھے۔ کیمیاء کا اگر دنیا میں کوئی وجود ہے تو وہ وجود چند ضروری اجزاء کو باہم ملانے اور انہیں مقررہ طریقہ پر آنچ پہنچانے اور پھونکنے سے پہلے وجودی

شکل اختیار نہیں کرسکتا۔ یہ اجزاء ہاتھ لگ جائیں اور کیمیاء ساز کو انہیں آنچ پہنچانے کا سلیقہ بھی آتا ہوتو پھر سونے کے توڑے اور روپوں اشرفیوں کا ڈھیر کیمیاء گر کی اپنی قسمت کا حصہ بن سکتے ہیں۔

دارالعلوم کے ان سرآمد روزگار اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا باہم اجتماع کیمیائے علم و فن کا ایک مجرب اور بار بار آزمودہ نسخہ تھا۔ نسخے کے سارے اجزاء مہیا ہو گئے اور انہیں صحیح طریقہ پر ترکیب دی گئی تو اس کے نتیجہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی، ان کے علوم ونظریات، ان کی قوت تحریر وتقریر، ان کی وسیع علمی معلومات اور علوم قرآن وحدیث میں ان کا جچا تلا فکر یہ اپنے ایک وجود ہے بہت سے فائدہ دینے والی کیمیاء اور اپنی قدر و قیمت میں سونے چاندی اور لعل و جواہر سے بھی بدر جہا بہتر اور لازوال دولت پیدا ہوئی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کو اپنے ان تمام اساتذۂ دیو بند کے علمی احسانات کا اعتراف ہے۔ خصوصاً حضرت علامۃ العصر مولانا السید محمد انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے فیضان علمی کے جذبہ ممنونیت سے ان کا قلب لبریز ہے۔ مجھے اپنے ایک گرامی نامہ میں حضرت مولانا نے حیدر آباد سے لکھا تھا کہ میں کیا عرض کروں:

اگر خار است و اگر گل ہمہ پروردہ تست

''زندگی میں وہی چند لحات تولمعات جہات تھے جو حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اللہ العزیز کے صحبت طیبہ میں گذرے۔ یوں تو فقیر نے بہتوں سے پڑھا اور استفادہ کا شرف حاصل کیا ہے، لیکن اپنی پڑھی ہوئی چیزوں سے کام لینے کا ڈھنگ آستانہ انوری میں آیا۔ جن دنوں القاسم والرشید میں ابتدائی مشق مضمون نگاری کی کر رہا تھا تو ایک نہیں متعدد مضامین حضرت شاہ صاحب کو سنانے اور اصلاح لینے کے بعد پریس میں دیتا تھا۔ وہ اصلاحیں کیا ہوتی تھیں، زمین آسمان بنتی تھی اور آسمان عرش کا پایہ حاصل کرتا تھا''۔

[مکتوب مولانا گیلانی از حیدر آباد، مورخہ ۱۹ اگست ۴۴ء]

دیوبند میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد فوراً ہی حضرت المخدوم مولانا حبیب الرحمن العثمانی سابق صدر مہتمم دارالعلوم کی جوہر شناسی اور قدردانی نے انہیں دارالعلوم کے دو علمی پرچوں القاسم اور الرشید کی ترتیب وتحریر پر مامور کردیا۔ یہ دونوں پرچے اپنے اپنے وقت میں ملک کے ممتاز علمی رسالوں میں شمار کیے جاتے تھے اور دیوبندی جماعت کے تمام فضلاء و محققین اپنی تازہ بتازہ علمی تحقیقات انہی رسائل کے صفحات پر پیش کرتے تھے۔ الرشید والقاسم کے مضامین نگاروں میں حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی، حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی، حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی، حضرت مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندی، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب انصاری، حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب، مولانا محمد میاں (منصور الانصاری) مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی، مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی، مولانا عبدالرحمن صاحب خورجوی وغیرہ قابل ذکر ہیں اور مولانا محمد طیب صاحب، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا میرک شاہ صاحب کاشمیری۔ مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی، مولانا شائق احمد عثمانی بھاگلپوری، مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی جماعت دیوبند کے ان نوخیز فضلاء کے ابتدائی مضامین بھی انہیں رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں پرچوں کا معیار علمی کیا تھا اور ان کی ترتیب وتحریر کی ذمہ داریاں کیا اہمیت رکھتی تھیں!

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے القاسم والرشید کی ادارت کے مختصر دور ہی میں اپنے تحقیقی اور علمی مضامین، ندرت بیان اور والہانہ اسلوب نگارش سے یہ ثابت کردیا کہ علم وفضل کے نیلگوں آسمان پر ایک نئے ستارے کی ضیاء باری اور ضوفشانی کا اہتمام ہے۔ بزم مہ وانجم آج ایک نئی شان سے دوبالا ہے اور ستاروں کی ساری دنیا اپنے ایک نئے ساتھی کی آمد کا انتظار کررہی ہے اور دارالعلوم دیوبند کے کسی چھوٹے موٹے سے کمرہ میں ایک ایسی شخصیت زیر تربیت ہے جو

اپنے علم وفضل کے زمانہ شباب میں حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، امام رازی وغزالی، ابن جوزی، ابن خلدون وشاہ ولی اللہ (رحمہم اللہ) کی وسعت معلومات اور تبحر علمی کی یاد تازہ کر دے گی۔

اس دور میں بہت سے مضامین ومقالات کے علاوہ ''کائنات روحانی'' اور ''سیرت ابوذر غفاری'' کے نام سے دو کتابیں بھی حضرت مولانا کی دیوبند سے شائع ہو کر مقبول عوام و خواص بنیں۔ پھر حضرت مولانا عثمانیہ یونیورسٹی کے تعلق ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد تشریف لے گئے۔ حیدرآباد میں کم وبیش ۲۵ سال حضرت مولانا کا قیام رہا، جہاں عثمانیہ یونیورسٹی میں آپ کی تدریسی خدمات اپنا ایک خاص معیار رکھتی تھیں۔ آپ کے حلقہ درس سے بہترین علماء اور اہل قلم حضرات نے تربیت پائی اور وہ اپنے ذوق اور حضرت مولانا کی بزرگانہ توجہات سے بڑے سے بڑے علمی منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کرا دینے کے قابل بن گئے۔

حیدرآباد میں حضرت مولانا مناظر احسن کی درسی خدمات گزشتہ حیدرآباد کی علمی زندگی کی ایک شاندار علامت تھی۔ جس طرح بغداد وغرناطہ اور قرطبہ وقاہرہ میں اسلامی خلافتوں اور حکومتوں کے زیرِ عہد میں دنیا کے بڑے بڑے علماء دین کھنچ کھنچ کر وہاں پہنچ گئے تھے اور ان کی درسگاہوں سے علم وفن کے چشمے ابل رہے تھے، اسی طرح حیدرآباد کو اپنے وقت کا بغداد سمجھئے اور مولانا مناظر احسن کو اس گہوارۂ علمی کا امام الحرمین یا امام غزالی۔

مولانا کی تصنیفی زندگی تو دیوبند ہی سے شروع ہو گئی تھی، لیکن اس زندگی پر جوانی کی پھبن حیدرآباد ہی میں آئی۔ صدق، معارف، برہان، الفرقان، ترجمان القرآن اور ملک کے دوسرے علمی رسائل کے صفحات گواہ ہیں کہ سینکڑوں مقالات مولانا کے قلم سے نکلے اور ان رسائل میں شائع ہو کر علم وادب میں ایک بیش بہا اضافہ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ آپ کی مقبول ترین تصانیف، نظام تعلیم وتربیت، الدین القیم، النبی الخاتم، تدوین حدیث، مسئلہ سود وغیرہ حیدرآباد ہی کی یادگار ہیں اور ان مطبوعہ تصانیف کے علاوہ بہت سے مسودات ابھی حضرت مولانا کے پاس محفوظ ہیں جن کی طباعت واشاعت امت کی موجودہ نسل کے اہل علم اور اہل مذاق افراد کے

احساس فرض سے بطور خاص مطالبۂ عمل کرتی ہے۔ یقین رکھئے کہ حضرت مولانا کا جو سرمایہ علم وفضل کتابوں اور رسالوں میں چھپ کر باہر آچکا ہے، مقدار میں اس سے بہت زائد اور معیار میں اس سے بلند تر ذخیرہ ابھی مسودات ہی کی شکل میں محفوظ ہے۔ پہلے دور جو میں شراب پی اور پلائی گئی تھی وہ بھرے ہوئے جام وسبو کے اوپر اوپر سے لنڈھادی گئی تھی وہ چیز جسے شاعرانہ زبان میں دردتہ جام کہئے یا بادہ گساران بدمست کے الفاظ میں تلچھٹ ہی تلچھٹ کہہ کر پکاریئے وہ ساری کی ساری پیرمغاں کے پاس سربمہر محفوظ ہے:

گماں مبر کہ بپایان رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

پھر حضرت مولانا ان علمی، درسی اور تحقیقی کمالات کے علاوہ تقریر وخطابت کا ایک خاص انداز بھی رکھتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ نہ صرف ان کی تقریروں میں زبان وبیان کی لطافتیں اور استدلال وانضباط کی قوتیں نوعروس بہار کے قدرتی حسن کی طرح یوں پھٹی پڑتی ہیں کہ ان پر تصنع و تکلف کا کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ جس طرح بہار موسم کی خوشگواری، شجر وثمر کی ایک نئی زندگی، بادل شمال کی مستانہ روی اور غنچہ وگل، لالہ ونرگس اور نسرین ونسترن کے فلک شگاف قہقہوں کا ایک دوسرا نام ہے، اسی طرح مولانا مناظر احسن کی تقریر، لب ولہجہ کی مٹھاس، الفاظ کی صحیح نشست وبرخاست، مضامین کی آمد، معلومات کی وسعت اور اسلوب وانداز کی جدت وندرت کی جامع ہے۔ جناب ماہر القادری مدیر فاران نے کہا تھا کہ نواب بہادر یار جنگ نے جن کی سیف زبانی اور شعلہ بیانی سے اب تک سینہ باطل میں ایک تلاطم کی سی کیفیت طاری ہے، کہا تھا کہ

> ''میں نے تقریر مولانا مناظر احسن گیلانی سے سیکھی ہے۔ میلادالنبی ا کے جلسوں میں جب مولانا حیدرآباد میں تقریریں فرماتے تھے تو موٹر لیے ان کے پیچھے دوڑتا رہتا تھا۔''

اور نواب بہادر یار جنگ کے یہ الفاظ مولانا کی تقریر کے حق میں ''تحسین سخن شناس''

کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کے بعد مولانا کی تقریر کسی اور تبصرہ کی محتاج نہیں رہتی۔

مولانا ممدوح اب عثمانیہ یونیورسٹی کی خدمت سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن میں قیام پذیر ہیں اور اس وقت فکر ومطالعہ کے مستقل مشاغل کے ساتھ بڑا کام بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی تاریخ حیات کی تالیف وتحریر ہے۔ حضرت مولانا سوانح قاسمی کو اپنی تصنیفی زندگی کا ایک خاص فریضہ سمجھ کر لکھ رہے ہیں اور جاننے والے جان سکتے ہیں، جس تصنیف پر مولانا مناظر احسن سا نامور مصنف اپنی دماغی پرواز کا سارا یہ سرمایہ صرف کردینے کا تہیہ کرچکا ہو وہ ضبط تحریر میں آجانے کے بعد اپنے حسن کی رعنائی، نقش ونگار کے بانکپن، چشم وابرو کی خوبصورتی اور آتش رخسار سرخ کی تمازت سے کیا کچھ نہ کردے گی؟

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست؟
یک چمن گل، یک نیستان نالہ، یک خم خانہ مے

میں یہاں اس اظہار واقعہ پر اپنے لیے فخر محسوس کرتا ہوں کہ مولانا گیلانی سے جناب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے سوانح قاسمی کے جمع وترتیب کی فرمائش کی اور حضرت مہتمم صاحب کو اس ضروری خدمت کی طرف اس عاجز وناکارہ نے توجہ دلائی۔ کم وبیش ایک صدی کے ماہ وسال کے الٹ پھیر کے بعد سیدنا مولانا نانوتوی کے حالات زندگی اور افکار ذہنی کی اشاعت سے تساہل دیوبند کی علمی زندگی کا ایک دردناک سانحہ تھا اور مجھے جب کبھی اس کمی کا خیال آتا تو یقین رکھئے کہ میں اپنے ضمیر کو اپنی جگہ شرمندہ پاتا تھا، لیکن ''دیر آید درست آید'' والے مقولہ کے صحیح معنی اس وقت معلوم ہوئے جب مولانا گیلانی نے اس ضروری خدمت کے لیے بطوع ورغبت اپنی آمادگی ظاہر فرمائی۔ مولانا نانوتوی کے تجدیدی کارناموں اور فلسفیانہ وحکیمانہ افکار کی تشریح وتذکیر کا حق بلاشبہ مولانا گیلانی کو پہنچتا تھا اور یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ قدرت نے جس کام کے لیے مولانا گیلانی کا انتخاب فرمایا تھا وہ کام ایک واہمہ کی حیثیت سے بھی کسی اور کے دماغ میں پیدا ہوسکتا ہے؟ حق تعالیٰ حضرت مولانا کو اس علمی خدمت کی تکمیل کا موقعہ اور امت کو اس عظیم

الشان کارنامہ کی قدر کی توفیق دے۔

میں نے اس تحریر کے شروع میں کہا تھا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی جماعت دیوبند کے ایک ممتاز فرزند ہیں اور دیوبندی علوم ونظریات نے جن صاف دماغوں کو اپنا آشیانہ بنالینے کے قابل سمجھا ہے، مولانا گیلانی انہی گراں منزلت اور عالی مرتبت حضرات میں سے ہیں اور اب اخیر میں مجھے یہ عرض کردینے میں صاف گوئی سے کام لینا چاہئے کہ مولانا گیلانی علماء دیوبند کی جامعیت علوم، پختگی فکر، معارف رسی، حقائق شناسی اور سادہ و پر خلوص زندگی کے ایک آخری یادگار ہیں۔ مرزا (مظہر جانجاناں) صاحب علیہ الرحمۃ کی روح مجھے اشارہ کرتی ہے کہ سوء ادب کا خیال نہ کر اور یہاں بے تکلف میرا یہ شعر پڑھ دے:

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

سید محمد ازہر شاہ قیصر
عفا اللہ عنہ وعن والدہ المرحوم
شاہ منزل دیوبند
۲۰ مئی ۱۹۵۰ء

فہرست مضامین

پیش لفظ ۵
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری ۱۲
ڈاکٹر خورشید رضوی ۱۴
مولانا ازہر شاہ قیصر ۱۵
فہرست مضامین ۲۳
تمہید مولانا سید مناظر احسن گیلانی ۳۱
ہندوستان ۳۹
سلطان شہاب الدین غوری ۳۹
سندھ کی مہم ۳۹
کتے کے برابر چیونٹیاں ۴۱
اہل ہندوستان کا درندوں کے درمیان رہن سہن ۴۱
سندھ کا شہر منصورہ ۴۲
ملتان ۴۳
ملتان کا بڑا بت ۴۴
مکران ۴۶
اہل بدھ مت کا قبول اسلام ۴۶
ساحلی علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کی سیاسی حیثیت ۴۷

اہل ہند کی مسلمانوں سے عقیدت ۵۱
مسلمان سیاحوں کی بے تعصبی اور راست بیانی ۵۷
ہندوستان کے جوگی ۵۸
مسلمانوں میں اجنبی زبانوں کے سیکھنے کا شوق ۶۱
جانوروں کی بولی کا علم ۶۲
فصل خصومات کا حیرت انگیز طریق ۶۵
ہندوستانی رسم ورواج ۶۷
لمبی داڑھی کا رواج ۶۸
ڈکار کو معیوب سمجھنا ۶۹
شراب سے پرہیز ۷۰
چوری کی سزا ۷۱
شادی کا طریقہ اور تعدد ازدواج کی اجازت ۷۱
بدکاری کی سزا ۷۳
عدالتی نظام ۷۳
رفاہ عام کے کاموں کا رواج ۷۳
سیلون کی ایک عجیب رسم ۷۴
ہندوستانیوں اور چینیوں کا تقابل ۷۵
ہندوستانیوں کی پارچہ بافی ۷۶
ودیالوں کا رواج ۷۶
اہل ہند کی اصنام پرستی ۷۷
علیحدہ علیحدہ کھانے کی رسم ۷۹
ہندوؤں کے سمندری سفر نہ کرنے کے عام خیال کی تردید ۸۰

چھوت چھات کی تردید ۸۲
قدیم ہند میں گوشت خواری کا رواج ۸۴
گوشت سے موجودہ احتراز کا سبب ۸۸
اہل ہند کا اظہار تفاخر ۹۰
سرزمین ہند کی زرخیزی اور موسموں میں اعتدال ۹۲
آدم کی دلچسپ تعریف ۹۵
قرآن میں آم کا ذکر ۹۷
ہندوستان میں سواری کے جانور ۹۸
ایک ہاتھی کے دلچسپ واقعات ۹۹
ہندوستان وسندھ کے جنگی ہاتھی ۱۰۱
ہندوستانی حکمرانوں کی معاشرت ۱۰۳
پیشہ ور عورتوں کا رواج ۱۰۴
قدیم ہندوستان میں پردہ کا دستور رامائن اور مہابھارت کی روشنی میں ۱۰۵
جوئے کا عام رواج اور اس کے حیرت انگیز واقعات ۱۰۸
ستی کی رسم ۱۱۰
تناسخ اور خودکشی کا رواج ۱۱۰
کالی پر انسانی قربانیاں ۱۱۵
ننگے فقیروں کی ہیئت کذائی ۱۱۶
لٹیروں کی چیرہ دستیاں ۱۲۰
چین ۱۲۵
ہندوستان اور چین کا تقابل ۱۲۵
دونوں ملکوں کا اختلاف مذاق ۱۲۶

چین میں حصول علم کا مذاق ۱۲۶
اہل چین کی تہذیبی ومعاشرتی خصوصیات ۱۲۷
پتھر کے کوئلے کا استعمال ۱۳۱
چین میں نوٹ کا رواج ۱۳۱
چینی تہذیب کا یورپی اقوام پر اثر ۱۳۲
چینیوں کی آدم خوری ۱۳۳
بدکاری کی اجازت اور اس کے اڈے ۱۳۵
عام اسلامی ممالک ۱۳۹
جنات وانہار کا مذاق عام اور اس کا عجیب منشاء ۱۳۹
بصرہ کی نزہت گاہیں ۱۴۱
حضرت انس رضی اللہ عنہ کا باغ ۱۴۲
بخارا اور ماوراء النہر وغیرہ کی زرخیزی ۱۴۳
صحرائے افریقہ میں آبپاشی کے ذرائع ۱۴۵
شہروں میں آب رسانی کے طریقے ۱۴۶
اپنے شوق سیاحت کی نسبت ابن حوقل کا بیان ۱۴۸
زمین کی نقشہ کشی ۱۴۹
ناواقفیت سے نابودیت پر استدلال ۱۵۰
عروں کی چاؤں سے واقفت کا عجیب واقعہ ۱۵۰
زراعت وباغبانی میں مسلمانوں کی حیرت انگیز ترقی ۱۵۳
صاحب روح المعانی کے ساتھ پیش آمدہ ایک واقعہ ۱۵۴
اشیاء کی ارزانی اور عام فراغ بالی ۱۵۸
مسلمانوں کی مہمان نوازی اور تعمیری مذاق کی خصوصیات ۱۶۹

عجیب وغریب مہمان نوازی ۱۷۰
حکومت آصفیہ کی آخری یادگار ۱۷۱
مہمان نوازی کے لیے سرائے میں مویشی ۱۷۲
جانوروں اور پرندوں کو پالنے کا شوق ۱۷۳
اہل ماوراء النہر کی مہمان نوازی ۱۷۵
مسلمانوں کا تعمیری ذوق ۱۷۷
مسلمانوں میں وسعت مکانی کے اسباب ۱۸۲
ابن حوقل کے ساتھ پیش آمدہ دلچسپ واقعہ ۱۸۴
اہل گیلانی کی مہمان نوازی ۱۸۶
گجرات کے مسلمانوں کی مسافر نوازی ۱۸۷
تعمیری اخراجات ۱۸۸
مسجد کی ہیئت ۱۸۹
سردی اور گرمی کا عجیب وغریب نظام ۱۹۰
اس زمانے کا تعمیری مواد ۱۹۱
مٹی کے مکانات کی حکمت ۱۹۴
کچے مکانات ۱۹۵
مکانات کی تعمیر میں روشنی اور ہوا کا خاص خیال ۱۹۶
جنوں اور دیوؤں کی تعمیر ۱۹۶
قبر کو کچا رکھنے کی حکمت ۱۹۷
مسافر خانوں اور سراؤں کی تعداد ۱۹۹
پانی پلانے کا انتظام اور رفاہ عام کے اوقاف ۱۹۹
زمانہ طالب علمی کے قصے ۲۰۰

مفت میں ٹھنڈا پانی ۲۰۳
مختلف ممالک میں وقف کے مصارف ۲۰۳
دمشق میں خروب کی سبیل ۲۰۵
طرابلس میں سنوسیوں کے زاویے ۲۰۶
بری اور بحری راستوں کی حفاظت کا انتظام ۲۰۸
سرحدوں کی فوجی چھاؤنیاں ۲۱۳
اورنگزیب کے پوتے کا بسایا ہوا شہر عظیم آباد ۲۱۷
مسلمانوں کا علمی شغف اور امراء کی فیاضیاں ۲۱۹
علم کا انہماک ۲۲۱
حکمرانوں کی طرف سے اہل علم کی ہمت افزائی ۲۲۲
تیمور کی علم دوستی ۲۲۳
اہل یورپ کا طالب علم کے ساتھ برتاؤ ۲۲۳
اس زمانہ کے لباس اور کھانے پینے کی تفصیلات ۲۲۵
ایک دلچسپ قصہ ۲۲۷
حجاج کی کثرت خوری ۲۲۷
ابن ہبیرہ کی کثرت خوری ۲۲۸
سلیمان بن عبدالملک کی پرخوری ۲۲۹
ہزار درہم کا ایک پیالہ ۲۳۰
ہندوستان میں کثرت خوری کے قصے ۲۳۱
ہشام بن عبدالملک کے لباسی تکلفات ۲۳۵
بنی آدم کے لباس کا سفر پتے سے سونے چاندی تک ۲۳۵
مسلمانوں کا کھانے اور پہننے میں معیار ۲۳۶

عہد صحابہ میں خز کپڑے کی مقبولیت ۲۳۸
خز کی تشریح ۲۳۸
حضرت حسن بصریؒ کا کھانے میں معمول ۲۳۹
سبزی اور ترکاریوں کا استعمال ۲۳۹
شکر کو ڈلی کی شکل میں ڈھال لینے کا رواج ۲۴۱
چینی کی اشاعت مسلمانوں کے ذریعہ ۲۴۲
ایران کی لذیذ ترین مچھلی ۲۴۳
مہرہ کے مویشیوں کی خوراک ۲۴۴
فارس کے دسترخوان اور باورچی خانے ۲۴۵
اسلام کی بنیادی تعلیم اعتدال ۲۴۵
کپڑے کی حیرت انگیز پائیداری ۲۴۷
کابل اور بصنّی کی پارچہ بافی ۲۵۰
مسلمانوں میں شراب سے بے رغبتی ۲۵۱
سسلی کے مسلمانوں کی عادات قبیحہ ۲۵۵
سسلی کے دو فرقے اور ان کے درمیان اختلافات ۲۵۶
خراسانی مسلمانوں کا دینی جذبہ ۲۵۸
مسلمانوں کے زوال کے آثار ۲۵۹
مسلمان مؤرخین کی انصاف پسندی ۲۶۰
مسلمانوں کی تباہی کے اسباب ۲۶۱
اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے حقوق ۲۶۳
مسلمانوں پر غلام اور لونڈیاں بنانے کا ایک غلط اعتراض ۲۶۴
ایران اور پارسی قوم ۲۶۶

آتش کدوں کی راکھ سے سیاہی کا کام ۲۶۷
فرغانہ کی معدنیات اور پتھر کا کوئلہ ۲۶۸
پتھر کے کوئلوں کا سب سے پہلے استعمال ۲۶۹
بندرگاہ عمان کی ایک اسٹرائک ۲۶۹
مختلف ممالک اسلامیہ کی لسانی خصوصیات ۲۷۱
ناموں میں تصرف کی عادت ۲۷۲
مختلف علاقوں کے خصوصی نام ۲۷۲
ضمیمہ: دیوبند اور اکابر دیوبند از ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی ۲۷۳
مادر علمی کی صدا ۲۷۳
تاریخ دارالعلوم دیوبند کے بنیادی ماخذ ۲۷۵
دارالعلوم دیوبند اور اکابر دیوبند ۲۷۶
کتب خانہ ۲۷۹
کتب خانے میں مطالعہ پر پابندی ۲۸۰
درسی تقریریں ۲۸۱
اکابر دیوبند کی زندگی ۲۸۳
مولانا محمود حسنؒ کے یہاں دعوت ۲۸۴
حافظ احمد کا اصرار ۲۸۵
اکابر دیوبند کی تواضع ۲۸۵
جہاد ۲۸۶
تجارت و حسن معاملہ ۲۸۷
مولانا گیلانی کی علمی خدمات ۲۸۸

تمہید

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

"ماقدرہ اللہ فسوف یکون" (جو اللہ نے تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا) کے تجربات سے تو ساری زندگی ہی بھری ہوئی ہے، مگر اس قانون کے ظہور کی نوعیت بعض دفعہ عجیب ہوتی ہے۔

بعض تعلیمی ضرورتوں کے لیے مسلمان جغرافیہ نویسوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا، ان کتابوں میں بعض دلچسپ چیزیں نظر آئیں۔ وہ خود بھی دلچسپ تھیں اور قیل وقال (پرانی تعلیم کی خوبی یا عیب کچھ بھی اسے سمجھئے" قال اقول" نام کی کتاب ہی مشہور ہوئی۔ میر باقر نے ملاؤں کا نام ہی "لم لا یکونیون" یعنی "لم لا یکون کذا" یعنی "کیوں ایسا نہیں ہوسکتا"؟ نام رکھ دیا تھا) چون وچرا کی مشق مدرسوں میں جو کرائی جاتی ہے، اسی مشق کا شائد نتیجہ یہ ہے کہ مختلف نتائج کی طرف ان کو پڑھ کر دماغ منتقل ہوتا چلا جاتا تھا، بغیر کسی ترتیب کے بطور یادداشت کے ان معلومات کو بھی اور جن نتائج کی طرف ان معلومات سے ذہن منتقل ہوتا تھا، دونوں کو خاکسار قلم بند کرتا چلا گیا۔ یادداشتوں کا یہ مجموعہ کئی سال سے پڑا ہوا تھا، حیدرآباد کے ایک ناشر کی نظر سے گذرا تو انہوں نے شائع کرنے کا ارادہ بھی کیا مگر اس ارادے کے کچھ ہی دن بعد حیدرآباد تاریخ کے ایسے دور میں داخل ہو گیا کہ نہ ناشر صاحب کا وہاں پتہ تھا اور نہ ان کے تجارتی کتب خانہ کا۔

اسی عرصے میں دارالعلوم دیوبند کے رئیس الاہتمام مولانا محمد طیب صاحب (ایدہ اللہ بروح منہ) کا ایما ہوا کہ "دارالعلوم" کے نام سے ماہوار رسالہ جو نکلتا تھا، اس کے لیے کوئی مضمون بھیج دوں، حالات اس وقت ایسے تھے کہ کسی مستقل مضمون کے لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان ہی منتشر یادداشتوں کا جو مجموعہ پڑا ہوا تھا مولانا کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ قسط وار مجلہ "دارالعلوم" میں وہ چھپنے لگا۔ اس عرصہ میں "دارالعلوم" کا ماہوار پرچہ بھی بند ہو گیا۔ غیر مطبوعہ مسودہ اس کے دفتر میں پڑا رہا۔ کچھ دن بعد سیدنا الامام الاستاذ حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز کے قرۃ العین، فلزۃ الکبد مولانا سید ازہر شاہ قیصر کا نوازش نامہ فقیر کے نام آیا کہ دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کی ایک جماعت یادداشتوں کے اس مجموعہ کو شائع کرنا چاہتی ہے۔ انہوں نے باصرار تمام سفارش بھی فرمائی کہ اجازت دے دی جائے۔

حضرت الاستاد شیخ الہند نور اللہ ضریحہ کی یہ بات یاد آئی جسے اکثر حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "اپنے مخدوم زادوں اور اپنے استاد زادوں سے جتنا ڈرتا ہوں، کسی سے نہیں ڈرتا۔" مولانا ازہر شاہ صاحب اس فقیر بے نوا کے مخدوم زادے بھی ہیں اور استاد زادے بھی، میرے لیے ان کے حکم کی تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا۔ اشاعت کی منظوری دے دی گئی۔ فقیر کے پاس اوّلاً ہے ہی کیا، مگر جو کچھ بھی ہے، بہت بڑا موثر حصہ اس کا ان ہی کے گھر کا دیا ہے:

اسی گھر سے ملا جو کچھ ملا ہے
مری جھولی میں ورنہ کیا دھرا ہے

عربی مدارس کے طلبہ بھی کچھ کام کر سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں فقیر کے احساسات کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ اس کی امید نہ تھی کہ دارالعلوم کے جن طالب علموں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا ارادہ کیا ہے وہ پورا ہوگا۔ مگر اس عرصے میں خبریں ملتی رہیں کہ اشاعت کی مختلف منزلوں سے کتاب گذر رہی ہے، تا آنکہ پروف کے کچھ اوراق بھی میرے پاس آ گئے۔ کتاب کی اشاعت سے زیادہ اس کی خوشی ہوئی کہ بہر حال دارالعلوم دیوبند کے ان طلبہ نے زندگی کا ثبوت تو پیش کیا۔

باقی خود کتاب کیا ہے، کیسی ہے، متفرق یادداشتوں کے کسی مجموعہ کی جو حالت ہو سکتی ہے وہی حال اس کا ہے۔ تاہم میں خیال کرتا ہوں کہ معلومات اور معلومات سے بھی زیادہ ان سے نکالے ہوئے نتائج پڑھنے والوں میں ان شاء اللہ تعالیٰ کچھ نہ کچھ اثر اپنا ضرور چھوڑیں گے۔ اگر میرا یہ حسن ظن پورا ہوا تو جواز اشاعت کی اسے ایک اچھی افادی وجہ قرار دوں گا۔ مرتب وضخیم کتابیں تو لوگ پڑھتے ہی رہتے ہیں، کیا ہوا اگر مذاق بدلنے کے لیے کسی پراگندہ دفتر پر بھی نظر ڈالی جائے:

در باغ عقل تخم بہ ترتیب کاشتند
صحرائے عشق بیں کہ چہ مستانہ رستہ است

زیادہ تر تو اس میں مسلمان جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کے معلومات ومشاہدات ہی ملیں گے، لیکن ان یادداشتوں کو قلمبند کرتے ہوئے کسی دوسری کتاب کی وقت پر کوئی مناسب بات اگر یاد آ گئی تو اس کو بھی میں نے درج کیا ہے۔ ابن سعد یا قلقشندی وغیرہ کی کتابوں سے جو چیزیں لی گئی ہیں ان کی نوعیت یہی ہے۔

آخر میں کتاب کے پڑھنے والوں سے یہ عرض کرنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس کتاب کی تصنیف جس شخص کی طرف منسوب کی گئی ہے وہ بے چارہ نہ تو کوئی پیشہ ور مصنف ہے اور نہ تاریخ وجغرافیہ کا باضابطہ طالب علم۔ پرانے قسم کے عربی مدارس کے دقیانوسی ملاؤں میں سے ایک ملا ہونے کے سوا اس کی کوئی دوسری حیثیت نہیں ہے، ان ہی مدارس میں طالب العلمی کی زندگی پوری ہوئی، اور طالب العلمی کے بعد معلمی کا کام جامعہ عثمانیہ میں انجام دیتا رہا۔ وہاں بھی وہی قرآن، فقہ وحدیث کلام وغیرہ کی کتابیں شعبہ دینیات میں پڑھاتا رہا۔ اس لیے عصری خصوصیتوں سے اگر اس کا کام عاری اور خالی نظر آئے تو اس پر نہ تعجب کرنا چاہئے اور نہ اس کو مورد شناعت وطعن بنانا چاہئے۔ قوم نے جس طرح کی تعلیم دلوائی یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

تعارف کی ان سطروں کے بعد جی چاہتا ہے کہ ایک خاص مسئلہ کے ذکر پر اپنے اس مقدمہ کو ختم کردوں۔ جس زمانے میں یادداشتوں کا یہ مجموعہ قلم بند ہوا ہے، اس وقت ملک کے دو

بڑے طبقوں کے درمیان ان زہرہ گداز، جاں سوز، روح گسل واقعات کا ظہور نہیں ہوا تھا جنہیں شاید کبھی سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ مگر ان ہی کو دیکھنا پڑا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے سلجھے ہوئے تعلقات جو صدیوں سے دونوں قوموں میں قائم تھے، اچانک ان ہی کو کس الجھانے والے نے الجھادیا۔

آپ کو اس کتاب میں بھی مشاہدات و معلومات کا ایک ذخیرہ ملے گا جن سے سمجھا جاسکتا ہے کہ آج ہی نہیں ہمیشہ سے مسلمانوں نے سرزمین ہند اور اس کے باشندوں کو کتنی قدرو عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس ملک کی عام مروجہ بت پرستی جو شاید سب سے زیادہ مسلمانوں کے لیے باعث گرانی ہوسکتی تھی، مگر حضرت عبداللہ بن مسعود صحابی رضی اللہ عنہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک مورخ کی وہ توجیہہ خاص طور پر قابل توجہ ہے، جس کا ذکر ہندوستان کی بت پرستی کے متعلق انہوں نے کیا ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ اپنی آسمانی مقدس کتاب قرآن کے متعلق شروع سے مسلمانوں کے اہل علم طبقہ میں اس دعویٰ کو حسن قبول حاصل رہا ہے کہ منجملہ دوسری زبانوں کے قران میں ہندی زبان کے بعض الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ اتقان وغیرہ کتابوں میں ان ہندی الفاظ کی آپ کو فہرست بھی مل سکتی ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ واقع میں ہندی زبان یا ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں میں سے کسی زبان کے وہ الفاظ ہیں بھی یا نہیں؟۔ لیکن اس سے مسلمانوں کی اس پاک ذہنیت کا تو اندازہ ہوتا ہے جو ہند اور ہند کی خبروں کے متعلق ابتداء ہی سے وہ رکھتے تھے۔

کیا ایسی زبان جسے وہ ناپاک یا ملیچھوں کی زبان سمجھتے ہوں، اس کے الفاظ کی گنجائش اپنے مقدس قرآن میں ان کا دل پیدا کرسکتا تھا؟ بخاری جیسی کتاب جس کا درجہ تقدس واحترام میں قران کے بعد ہی مسلمانوں میں مانا جاتا ہے، اس میں آپ کی ایسی روایتیں مل سکتی ہیں کہ ہندوستان کی نسبت کی تصریح کے ساتھ یعنی ہندوستان کی فلاں دوا کو چاہئے کہ لوگ استعمال کریں۔ یہ حکم ان کے پیغمبر نے اپنی امت کو دیا ہے اور آثار و اخبار کی عام کتابوں میں جو ذخیرہ

اس باب میں پایا جاتا ہے، ان کے لیے تو ایک مستقل مضمون ہی میں گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس سے زیادہ آخر آپ کیا چاہتے ہیں کہ کعبہ کی دیوار کا جو پتھر ''حجر اسود'' کے نام سے موسوم ہے، اس کے متعلق مسلمانوں کی کتابوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ عرب میں یہ پتھر ہندوستان سے آیا تھا۔ (یہ نتیجہ اس بنیاد پر نکالا گیا ہے کہ جنت سے حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں سب سے پہلے اس پتھر کو اپنے ساتھ لائے اور وہاں سے عرب پہنچا، دیکھو عینی شرح بخاری وغیرہ) واقعہ کی نوعیت سے مجھے بحث نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کے ان احساسات کو دکھانا چاہتا ہوں، جو ہندوستان کے متعلق عموماً ابتداہی سے ان میں پائے جاتے تھے۔

اور میں تو کہتا ہوں کہ مقیم بن حماد کے حوالہ سے ہمارے ہاں کی عام کتابوں مثلاً عقد الفرید وغیرہ میں ہندوستان کے ایک راجہ کا جو خط بنام سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نقل کیا جاتا ہے جس کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اپنا تعارف کراتے ہوئے اس ہندی حکمران نے لکھا تھا کہ:

> ''یہ خط راجہ راجگان (ملک الاملاک) کی طرف سے ہے جو ایک ہزار راجگان کا بیٹا ہے (یعنی ہزار پشتوں سے راجہ ہے) اور ہزار راجواڑوں کی لڑکیاں اس کے عقد ازدواج میں ہیں اور اس کے فیل خانے میں ہزار ہاتھی ہیں اور وہ ایسے دو دریاؤں کا مالک ہے جن کے پانی سے عود الوہ (خوشبو جلانے کی لکڑیاں) اور جائفل، کافور وغیرہ جیسی چیزوں کی پیدائش ہوتی ہے۔ جن کی خوشبو کی لپٹ بارہ میل تک پہنچتی ہے''۔ [عقد الفرید صفحہ ۱۴۳ ج ا]

خدا جانے اس خط کی نوعیت کیا ہے، لیکن کم از کم اس سے اس کا تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان اور اس کے حکمرانوں کی شان وشوکت عظمت و دولت کے متعلق ابتداء اسلام ہی میں مسلمانوں کے اندر عقیدت کے کیسے عجیب وغریب جذبات وخیالات پائے جاتے تھے۔

اور یہی کیا جمال الدین القفطی نے اپنی کتاب تاریخ الحکماء میں بھی اس لطیفہ کا جو ذکر

کیا ہے کہ دنیا کے پانچ بادشاہوں یعنی ① چین ② ہند ③ ترک ④ ایران ⑤ روم۔ ان کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ساری دنیا کے حقیقی حکمران بس یہی پانچوں ہیں۔ باقی ان کے سوا جو بھی ہیں وہ اتباع لھما ان ہی پانچوں میں سے کسی ایک تابع اور طفیلی ہیں، پھر ان عالمی سلاطین کی خصوصیتوں کو بتاتے ہوئے جمال الدین نے نقل کیا ہے کہ:

"وكانوا يسمون ملك الهند ملك الحكمة لفرط عنايتهم بالعلوم" [صفحہ ۱۷۵]

ترجمہ: اور ہندوستان کے بادشاہ کی خصوصیت یہ سمجھتے تھے کہ وہ حکمت و دانش کا بادشاہ ہے، کیونکہ علوم وفنون کی طرف غیر معمولی اور حد سے گذری ہوئی توجہ ہند کے بادشاہوں کو ہے۔

واللہ اعلم بالصواب! تاریخ کے کس دور کا یہ قصہ ہے، لیکن مجھے تو یہ بتانا ہے کہ ہندوستان کے متعلق مسلمانوں کا سینہ کتنا کھلا ہوا تھا، اس کی یہ کتنی کھلی دلیل ہے۔ کرہ زمین کے پانچ بادشاہوں میں ایک بادشاہ ہندوستان کا بھی بادشاہ تھا، صرف یہی نہیں بلکہ انسانیت کا سب سے بڑا امتیاز یعنی "علم" اس کی قیادت بھی اسی ملک کے حکمرانوں کو حاصل تھی۔ بتایا جائے کہ اعتراف فضل وکمال کی اس سے بہتر شہادت اور کیا ہوسکتی ہے۔ قفطی نے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ:

"دنیا کی تمام پرانی قوموں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ حکمت و دانش اور مختلف علوم وفنون میں ہندوستان کے لوگ آگے بڑھے ہوئے تھے۔"

[صفحہ ۱۷۵]

پھر جس زمانہ میں اپنی یہ کتاب قفطی لکھ رہا ہے، یعنی ساتویں صدی ہجری (تیرہویں عیسوی) میں ہندوستان کے متعلق جو مسلمانوں کا عام احساس تھا، اس کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے:

"ہر زمانہ میں یہ ماننا چاہئے کہ ہندوستان کو حکمت و دانش کے سرچشمہ ہونے

کی حیثیت حاصل رہی ہے اور عدل و انصاف کا بھی، نیز سیاست کا بھی مرکز یہ ملک بنا رہا ہے''۔

اس کے بعد اس ملک کے خصوصی فنون مثلاً ریاضیات، موسیقی وغیرہ کا تذکرہ کر کے ہندی طریقہ حساب کی تعریف کر کے اپنے ذاتی تاثر کو ان لفظوں میں درج کیا ہے:

''یہ حساب کرنے کا مختصر ترین طریقہ ہے۔ ایسا طریقہ جسے بہت آسانی کے ساتھ سیکھ لیا جا سکتا ہے۔ وہ باآسانی گرفت میں آجاتا ہے''۔

آخر میں لکھتا ہے:

''اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ہندوستان کے لوگوں کی طبیعتیں کتنی تیز اور ذکاوت سے لبریز ہیں، بات سے بات پیدا کرنے اور مختلف چیزوں میں سے سب سے اچھی چیز کے انتخاب کا کتنا اچھا سلیقہ ان میں پایا جاتا ہے''۔

[صفحہ ۱۷۵]

خواہ کچھ بھی سمجھا جائے، لیکن مسلمانوں کی جتنی کتابوں کے پڑھنے کا موقعہ اب تک مجھے ملا ہے، ان میں زیادہ تر اسی قسم کی شہادتیں اور مسلمانوں کے اعترافات پائے جاتے ہیں۔ ابوالفداء کی تاریخ میں ہندوستان کے مختلف طبقات اور مذاہب و ملل کا ذکر کر کے آخر میں ''البراہمہ'' کا عنوان قائم کرتے ہوئے ان کی خصوصیتوں کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''ان لوگوں کے نزدیک فکر (دھیان وگیان) کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، ان کا خیال ہے کہ محسوس اور غیر محسوس (غیب وشہادت) کے درمیان واسطہ کا کام فکر (دھیان وگیان) سے لیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بڑی محنت، ریاضت ومجاہدے سے کام لیتے ہیں، تاآنکہ محسوسات سے منتقل ہو کر غیر محسوس (غیب) سے تعلق پیدا کر لیتے ہیں اور اس نادیدہ عالم کا ان پر انکشاف ہوتا ہے، بسا اوقات وہ اسی غیب کی خبریں بھی دیتے ہیں یا ارادے میں اتنی

قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ کسی زندہ کے قتل کا ارادہ اس کے قتل کے لیے کافی ہو جاتا ہے"۔ [صفحہ ۹۴]

اور بھی اسی قسم کی باتیں اس نے نقل کی ہیں:

ہندوستان پہنچنے اور اس کو وطن بنالینے کے بعد ہندوؤں کے مذہب و دین کے متعلق مسلمانوں کی جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی تنقیدی یا مناظراتی کتاب نہیں پائی جاتی، یہ قصہ اس وقت شروع ہوا جب ہندوستان کی حکومت ایک ایسی قوم کے قبضہ میں چلی گئی، جس کی حکمرانی کی بنیاد ہی "فرق واحکم" (بانٹو اور حکومت کرو) پر قائم تھی۔ تحفت الہند کے جواب وسوال کا سلسلہ اسی کے بعد شروع ہوا۔

اسی سے اندازہ کیجئے کہ مہاراجہ پٹیالہ کے پاس جب مسٹر جارج فریڈرک کمشنر انبالہ بطور مہمان کے تشریف لائے اور بہادر گڑھ کے قلعہ میں مہاراجہ نے ان کو اتارا تو عین محل کے پاس ایک "مسجد" کو دیکھ کر کمشنر صاحب بہادر نے فرمایا کہ اورنگزیب تو مسجدوں کو ڈھواتا ہے، آپ نے اپنے محل کے پاس اس مسجد کو کیسے قائم رہنے دیا؟۔

مہاراجہ نے جواب میں کہا کہ جس ڈھنگ سے اس وقت آپ نے اورنگزیب کا ذکر کیا میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد میرا ذکر بھی لوگ اسی طرح کریں۔

[صفحہ ۶۲ تاریخ ریاست پٹیالہ مولف خلیفہ محمد احسن وزیر ریاست]

اگرچہ یہ جزئی واقعہ ہے، لیکن بیسیوں کلیات کو جن میں آج ہندوستان پھنسا ہوا ہے، آپ حل کر سکتے ہیں۔

فقط والسلام

مناظر احسن گیلانی

۲۶ مئی ۱۹۵۰ء، گیلانی (بہار)

ہندوستان

سلطان شہاب الدین غوری

ہندوستان کے لحاظ سے یہ وہ زمانہ ہے کہ دارالاسلام بنا کر مسلمانوں کے بسانے کے اس ملک کا فاتح ابھی کفر کی آغوش اور کفر کے اصلاب میں محوخواب تھا۔ میری مراد سلطان شہاب الدین محمد سام الغوری انار اللہ برہانہ سے ہے۔ ابن حوقل جو میرے اس مضمون کا سب سے بڑا ماخذ بلکہ محرک ہے ۳۳۶ھ میں پیدا ہوا۔ یعنی چوتھی صدی ہجری کا یہ مصنف اور سیاح ہے۔ وہی سلطان مرحوم کے مرز بوم غور کے متعلق لکھتا ہے:

"اما الغور رفانها دار کفر نذکرها فی الاسلام لان بها مسلمین"

[ابن حوقل]

ترجمہ: باقی غور تو یہ ابھی کفر ہی کا علاقہ ہے، اسلامی ممالک کے سلسلہ میں اس کا ذکر میں اس لیے کر رہا ہوں کہ کچھ مسلمان اس علاقہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔

سندھ کی مہم

اور گو مہم سندھ کے نام سے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے پندرہ سال بعد ہی ایک مہم ہندوستان کی طرف مسلمانوں کی روانہ ہو چکی تھی۔ لیکن باوجود اس کے ابن حوقل کے زمانہ تک

ہندوستان کے متعلق مسلمانوں کے معلومات اور تاثرات کا حال یہ تھا جیسا کہ ابن حوقل ہی نے سندھ اور اطراف سندھ، کچھ ملتان اور اس کے آس پاس کے قصبوں اور شہروں کا ذکر کر کے جن کے نام اب قریب قریب محو ہو چکے ہیں، یہ لکھا ہے کہ:

"وهذه مدن الهند التى عرفتها ولها بواطن واماكن كفرزان وقنوج فى المفاوزوهى كلمطه واودغشت فى اقطار نائيه واماكن سحيقه لايصل اليها تاجرا لامن اهلها لانقطاعها وكثرة الآفات المقتطعة لقاصدها" [ابن حوقل صفحہ ۲۲۷]

ترجمہ: یہ ہیں ہندوستان کے شہر جنہیں میں جان سکا ہوں۔ ان کے سوا ملک کے اندرونی علاقے بھی ہیں۔ مثلاً فرزان، قنوج جو ریگستانوں کے اندر ہیں۔ ان کی حالت بجنسہ مغربی افریقہ کے دور دست علاقوں کی ہے۔ یعنی لمطہ اور اودغشت وغیرہ۔ ہندوستان کے ان اندرونی شہروں میں کوئی تاجر نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ اگر خود ان ہی ہندوستانیوں میں سے ہو تو اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ (اسلامی ممالک سے) ہندوستان کے یہ اندرونی شہر بالکل منقطع ہیں اور راستہ میں بکثرت ایسی آفتوں سے ان لوگوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے جو اندرون ملک کے ان شہروں کا ارادہ کرتے ہیں۔

فرزان کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا کہ کس شہر کی طرف اشارہ کر رہا ہے واللہ اعلم، اب اس نام کی کوئی آبادی کہیں موجود بھی ہے یا نہیں، البتہ قنوج کو ابن حوقل جانتا ہے، مگر کیا جانتا ہے؟ ''المفازۃ'' یعنی صحرائے سندھ کے درمیان ایک شہر اس کو بتاتا ہے۔ خیال گذرتا ہے کہ سندھ تک مسلمان یلغار کر کے پہنچ گئے تھے۔ حالانکہ یہاں تک بھی پہنچنا آسان نہ تھا۔ کرمان سے مکران تک عظیم ''مفازۃ'' یعنی صحرائے ریگ کو عبور کر کے وہ یہاں تک پہنچے تھے، مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اندلس پہنچ کر موسیٰ بن نصیر فاتح افریقہ نے بحر محیط کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ ''تیری موجیں اجازت نہیں دیتیں، ورنہ اللہ کا کلمہ بلند کرتے ہوئے میں آگے ہی بڑھتا چلا جاتا۔ لیکن مجبوراً واپس ہوتا ہوں۔''

کچھ اسی طرح جنوب میں بحر عرب اور بحر ہند کی موجیں شمال میں ہمالہ کی بلند چوٹیاں، سامنے ایک لق ودق ریت اور بالو کا غیر آباد صحرا، اسی کو دیکھ کر آگے بڑھنے کی ہمت مدتوں ان میں پیدا نہیں ہو سکی۔ ماسوا اس کے جیسا کہ ابن حوقل نے بھی اشارہ کیا ہے کہ اس ملک میں وہی تاجر داخل ہو سکتا ہے جو ان ہی میں سے ہو۔ چھوت چھات، جات پات کے مسئلہ نے ہندوستان میں مسافروں کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑی ہوگی۔ بلکہ الہمذانی جو تیسری صدی ہجری کا مصنف ہے اس کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یاروں نے بعض عجیب وغریب ڈراؤنی باتیں بھی مشہور کر رکھی تھیں۔

کتے کے برابر چیونٹیاں

اس نے ایک موقع پر لکھا ہے:

"وبین خراسان وارض الهند نمل مثل الكلاب السلوقية"

ترجمہ: خراسان اور ہندوستان کے درمیانی راستہ میں ایک قسم کی چیونٹیاں ہیں جو تازی کتوں کے برابر بڑی ہوتی ہیں۔ [ابن الفقیہ، صفحہ ۳۲۵]

پھر اس کی تفصیل بھی لکھی ہے کہ کس طرح لوگوں پر حملہ کرتی ہیں اور ان کے حملہ سے بچنے کی تاجروں نے کیا صورتیں اختیار کر رکھی ہیں۔

اہل ہندوستان کا درندوں کے درمیان رہن سہن

ہندوستان کے متعلق جہاں تک سننے میں آیا ہے، اس وقت تک یورپ کے عوام میں اسی قسم کی باتیں مشہور ہیں، مختلف حضرات جو یورپ سے تعلیم پا کر واپس آئے ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ عام طور پر لندن تک کے عوام عموماً دریافت کرتے ہیں کہ آخر ہندوستانی سانپوں اور شیروں کے درمیان کیسے رہتے ہیں؟ میرے ایک دوست جو جامعہ عثمانیہ میں سائنس کے استاد تھے، وہ کہتے ہیں، میں بھی ان کو باور کراتا رہتا تھا کہ شام ہوتے ہی ہم لوگ اپنے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ اتفاقاً کسی دن دروازہ کھلا رہ جائے تو شیر ہمارے بچوں کو اٹھا کر لے بھاگتے ہیں اور سانپوں

کا تو یہ حال ہے کہ ہم لوگ پلنگ پر لیٹے نہیں کہ بکثرت سوراخوں سے سانپ نکل نکل کر ادھر ادھر صحن میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ سر راس مسعود مرحوم بھی اپنا ایک قصہ کہتے تھے۔ غالباً لندن ہی کا، کہ عورتوں اور مردوں کا ایک مجمع تھا، مجھے خدا جانے کیا سوجی، کسی کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ ''جس حال میں مجھے آپ لوگ دیکھ رہے ہیں، اس پر میرے بزرگوں کو قیاس نہ کیجئے'' واللہ اعلم، ان کا بیان تھا کہ میں نے جب ان کو باور کرایا کہ پہلے آدمی جو درخت سے اتر کر زمین کی زندگی گذانے کے عادی ہوئے وہ میرے دادا تھے۔ ورنہ ان سے پہلے سب درختوں ہی پر رہتے تھے۔ تو لوگ چاروں طرف سے جمع ہو کر بطور تماشا کے مجھے دیکھنے لگے۔ یعنی ایک ایسے آدمی کو دیکھ رہے تھے جس کی کل دو پشت زمین پر رہنے کی عادی ہوئی ہے۔

بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن حوقل کے زمانہ تک سندھ وملتان اور اس سے بھی جو بالائی علاقے ہیں، نیز ساحلِ سمندر کی بندرگاہیں اور ساحل سے قریب کے شہروں سے تو مسلمان خوب واقف تھے۔

سندھ کا شہر منصورہ

وہ سندھ کے مرکزی شہر منصورہ (جس کا نام سندھیوں کی زبان میں برہمن آباد تھا) کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے۔ وہاں کے امیر کا، عام باشندوں کا، ان کے طرزِ رہائش کا، موسم کا، پیداوار کا، سب ہی کا تذکرہ اس نے کیا ہے۔ مسلمانوں کا جو خاندان اس کے زمانہ میں منصورہ کا امیر تھا اس کے متعلق ابن حوقل نے لکھا ہے کہ:

"وملکھم من قریش من ولد ھبار بن الاسود قد تغلب علیھا اجدادة وساسوھم ساسیة اوجبت رغبة الرعیة فیھم وایثارھم علی من سواھم غیر ان الخطبة لبنی العباس"

ترجمہ:ان کا بادشاہ قریشی نسل سے ہے۔ یعنی ہبار بن اسود کی اولاد ہے۔ اس شہر پر اسی قریشی بادشاہ کے بزرگوں نے قبضہ جمالیا تھا اور پھر وہاں کے باشندوں پر ایسی حکومت ان

لوگوں نے کی، جس کی وجہ سے رعیت ان کی طرف مائل ہوگئی اور دوسروں پر ان لوگوں کو وہاں کے باشندے ترجیح دینے لگے۔ البتہ خطبہ اس شہر میں عباسیوں ہی کے نام سے پڑھا جاتا ہے۔

[ابن حوقل، صفحہ ۲۲۸]

یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں کا عام لباس تو اس ملک میں وہی ہے جو عام عراق والوں کا لباس ہے، لیکن صرف شاہی خاندان کے لوگ۔

"یقارب زیهم زی ملوك الهند فی الشعور والقراطق"

ترجمہ: بال اور کرتے ان کے ہندوستان کے راجگان کی وضع کے قریب قریب ہیں۔ [ابن حوقل صفحہ ۲۲۸]

ملتان

اسی طرح سے ملتان کا تذکرہ بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ لکھا ہے کہ مسلمان اس شہر کو "فرج بیت الذہب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یعنی "سونے کے گھر کا شگاف" گو وجہ تسمیہ اس کی ابن حوقل نے یہ بتائی ہے کہ:

"لانها فتحت فی اول الاسلام وکان بالمسلمین ضیق وقحط فوجدوا فیها ذهباً کثیراً فاتسعوا"

ترجمہ: ملتان اس زمانہ میں فتح ہوا تھا جب اس ملک میں اسلام ابتداءً داخل ہوا تھا۔ اس وقت مسلمان سخت تنگی میں مبتلا تھے اور قحط کا شکار ہوگئے تھے۔ ملتان جب فتح ہوا تو سونے کا ایک بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا، جس سے فراغ بالی پیدا ہوگئی۔

"ہندوستان سونے کی چڑیا ہے" شاید اسی کا ترجمہ مسلمانوں نے ان الفاظ میں کرلیا ہو۔ اسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک اس تمام علاقہ میں یعنی سندھ، ملتان وغیرہ میں زیادہ تر بدھ مت کے پیرو آباد تھے۔ وہ چند مجہول الاسم شہروں کا نام لے کر لکھتا ہے کہ:

"فمن صیمور وقامهل من بلد الهند ومن قامهل الی مکران

فللبدھة والکفار فی حدود السندھم البدھ والبدھة قبائل مفترشة مابین حدود طوران ومکران والملتان ومدن المنصورة"

[ابن حوقل، صفحہ ۲۳۱]

ترجمہ: صیمور اور قامہل جو ہندوستان کے (ساحلی) شہر ہیں۔ قامہل سے مکران تک بدھ لوگ آباد ہیں۔ اسی طرح سندھ کے علاقوں میں بدھ ہی آباد ہیں۔ اسی طرح طوران اور مکران وملتان میں بدھ قبائل کے لوگ پھیلے ہوئے ہیں۔

طوران، مکران ہی کے قریب بلوچستان کے کسی علاقہ کا نام تھا۔ لکھا ہے کہ اس کا امیر بھی الگ ہے، جس کا نام ابوالقاسم البصری ہے۔ اسی طرح ملتان کے حالات میں لکھتا ہے کہ:

"امیرھم قرشی من ولد اسامة بن لؤی قد تغلب علیھا اولوہ"

[ابن حوقل صفحہ ۲۳۰]

ترجمہ: ملتان کا امیر بھی ایک قریشی ہے اسامہ بن لوی کی اولاد میں ہے۔ ملتان پر اس کے بزرگ قابض ہوگئے تھے۔

پنجاب میں قریشی یا قرشی کی نسبت اپنے ناموں کے پیچھے استعمال کرنے والے حضرات کیا ان ہی سندھی وملتانی سلاطین و امراء سے کوئی نسبی تعلق رکھتے ہیں؟ واللہ اعلم بالصواب۔

ملتان کا بڑا بت

اسی ملتان کے سلسلہ میں اسی ابن حوقل نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہاں ایک عظیم اور بہت بڑا بت خانہ ہے، جس میں ایک دیوہیکل مورتی ہے۔ غالباً یہ بدھ ہی کا بت ہے۔ ابن اثیر میں ہے:

"کل مایعبد فھو عندھم بدٌ"

ترجمہ: ہر وہ چیز جو پوجی جاتی ہے ہندوستانیوں کے یہاں "بد" کہلاتی ہے۔

بعضوں کا یہ خیال کہ بت کا لفظ اسی "بدھ" کا ایک تلفظ ہے، میرے خیال میں بھی

قابل قبول ہے۔ مگر دلچسپ قول اس ملتانی ''بد'' کے متعلق ابن اثیر نے یہ نقل کیا ہے کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ حضرت ایوب علیہ السلام کی مورتی یعنی صنم یا مجسمہ ہے۔

دوسری کتابوں میں بھی "البدالاعظم" کے نام سے مورخین نے ملتان کے اس بت کو موسوم کیا ہے۔ اس بت کا پورا نقشہ اور حلیہ بھی ابن حوقل نے کھینچا ہے۔ دلچسپ دو باتیں لکھی ہیں۔ ایک تو وہی جو سلاطین اسلام کا ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ دوامی سلوک رہا، وہی دوامی اور عام سلوک جسے یاد کر کے بے ساختہ میری زبان پر شاعر کا یہ شعر جاری ہو جاتا ہے:

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو
تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

یعنی اسی بت کا ذکر کر کے رقمطراز ہے:

"وامیر الملتان ینفق علی السدنۃ منہ"

ترجمہ: جو آمدنی امیر ملتان کو ہوتی ہے اس میں سے وہ اس بت خانہ کے پجاریوں پر بھی خرچ کرتا ہے۔ [ابن حوقل، صفحہ ۲۲۹]

اور دوسرا لطیفہ جو اس نے لکھا ہے وہ یہ ہے کہ گو ہندوستان کی لامحدود مخلوق کے مقابلہ میں اس امیر ملتان کے پاس کوئی ایسی فوجی قوت نہیں ہے جس سے حملہ کرنے والوں کی وہ مدافعت کر سکتا ہو، لیکن ترکیب یہ اس نے اختیار کر رکھی ہے کہ:

"اذا قصدھم الھند للحرب وانتزاع ھذا الصنم منھم اتوا الصنم فاظھروا کسرہ واحراقہ فیرجعون ولولا ذلک لخربوا الملتان"

ترجمہ: جب ہندوستان کے باشندے ملتان کے اس مسلمان امیر کی طرف جنگ کے ارادے سے حملہ کرتے ہیں اور اس مورتی کو (جو ملتان میں تھی) اس سے چھین لینا چاہتے ہیں تو مسلمان اس مورتی کے پاس آ کر کچھ ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ (بڑھنے والے اگر آگے بڑھے تو) تو ان کے اس بت کو وہ توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے اور جلا دیں گے۔ (اس حال کو دیکھ کر) نرغہ کرنے والے واپس ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسی صورت نہ ہوتی تو

ملتان کو ہندوستان والے تباہ و برباد کر چکے ہوتے۔ [ابن حوقل]

پھر آگے پیچھے خدا جانے کتنے شہروں کے نام اس نے لیے ہیں۔ مثلاً قلری، بلری، انزی، مسودھی، بانیہ وغیرہ اور عجیب بات یہ لکھی ہے کہ:

"ولسان اهل المنصورة والملتان ونواحيها العربية والسندية"

ترجمہ: منصورہ اور ملتان اور جو علاقے ان کے آس پاس ہیں، ان کی زبان عربی اور سندھی ہے۔ [ابن حوقل صفحہ ۲۳۲]

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ عربی زبان ہندوستان کے سندھی خطہ تک پہنچ چکی تھی۔

مکران

پھر مکران کا تذکرہ کر کے بتایا ہے کہ وہاں بھی ایک الگ امیر ہے جس کا نام عیسیٰ بن معدان ہے۔ پایہ تخت کا نام اس کے کیز ہے۔ شاید اسی کو آج کل کوئٹہ کہتے ہیں۔ پھر آگے قندابیل وغیرہ نامی شہروں کا ذکر کر کے یہاں بھی یہی بتاتا ہے کہ:

"فيه مسلمون و كفار من البده"

ترجمہ: یعنی اس علاقہ میں بھی مسلمان اور بدھ متی والے رہتے ہیں۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری تک یہ سارا علاقہ بدھ مذہب والوں سے بھرا ہوا تھا اور غالب قرینہ بھی یہی ہے کہ بتدریج ان ہی بدھوں نے اسلام قبول کیا ہے۔

اہل بدھ مت کا قبول اسلام

بدھ مذہب والوں کا اسلام سے عجیب تعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وسط ایشیا کا سارا علاقہ کابل، قندھار، سندھ، سرحد، اسلام سے پہلے ان کے باشندے عموماً بدھ متی کے پیرو تھے۔ پھر بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام کے آنے کے بعد ساتھ ہی بغیر کسی کشمکش کے اچانک انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ آج تک دنیا کو اس پر حیرت ہے۔

البلاذری نے تو تصریح کی ہے کہ کچھ نہیں معلوم کہ یہ کیسے مسلمان ہوئے۔ گو بعض جستہ

جستہ جستہ واقعات تاریخوں میں ملتے ہیں، لیکن بالکل ناکافی۔

مسٹر آرنلڈ نے بھی یہاں پہنچ کر اپنی مشہور کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' میں سپر ڈال دی ہے۔ میرا اس باب میں ایک خاص نظریہ ہے، جس طرف اپنی کتاب ''النبی الخاتم'' میں، میں نے بعض اجمالی اشارے بھی ہیں۔ کاش کوئی اس مضمون کو اپنی تحقیقاتی جدوجہد کا موضوع بناتا۔ بڑے بڑے اسرار اس پر فاش ہوسکتے ہیں۔ تاتاری بھی عموماً بودھسٹ تھے۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ چین اور خصوصاً جاپان کے بودھوں میں کام نہیں کیا گیا۔ اس وقت بڑا نادر موقع آ گیا ہے۔ انانیت کا بت جاپان کا ٹوٹ چکا ہے۔ انگریزی زبان سے وہ اتنے قریب ہو چکے ہیں کہ اسی زبان کو ذریعہ بنا کر ان کو اس آڑے وقت اسلام کی دعوت دے کر آدمی بنایا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ وہ آدمی بننے کا حق رکھتے ہیں۔

وسط ایشیاء کے متعلق یہ خیال کہ فوجی حملوں سے وہ مسلمان ہوئے، مختلف وجوہ سے غلط ہے۔ ابھی غور کا حال آپ پڑھ چکے ہیں کہ چوتھی صدی تک کفر پر وہ مصر رہا۔ لیکن اسلام کی تلوار نے مسلمان ہونے پر اس کو چار سو سال تک مجبور نہیں کیا۔ حالانکہ چاروں طرف ان کے مسلمان ہی مسلمان تھے۔

ساحلی علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کی سیاسی حیثیت

غرضیکہ چوتھی صدی ہجری تک مسلمان اس ملک کے متعلق بہت ہلکی سی واقفیت رکھتے تھے۔ البتہ ساحلی علاقوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت سے مختلف ہندو راجاؤں کے علاقوں میں بسنا شروع ہوگئے تھے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں بھی مسلمان ہندوستان میں جس شرط کے ساتھ بستے تھے وہ عجیب وغریب ہے۔ ابن حوقل سواحل ہند کے شہروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''کھمبایت سے صیمور تک بلھرا کا علاقہ ہے جو کتاب الامثال کا مصنف ہے۔

اور اپنے علاقہ کے نام کی نسبت سے مشہور ہے۔ جسے (افریقہ میں) غانہ (گھانا) کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ علاقہ کا نام ہے۔ اسی طرح کوغہ (کانگو) وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔''

معلوم نہیں ''کتاب الامثال'' سے ابن حوقل کی کیا مراد ہے۔ شاید کلیلہ دمنہ کی داستان جس میں گیدڑوں کا ذکر بطور مثال کے کیا گیا ہے اور سارے قصے جانوروں ہی کی زبان سے ادا کیے گئے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ جدید تحقیقاتی مضامین میں تو ثابت کیا گیا ہے کہ اصل نام اس کتاب کا ''ہپدیشا'' یا ''ایدیش'' یا ''پندنامہ'' تھا۔

بہر حال اسی بلھرا کے علاقہ میں جو مسلمان آباد تھے، ان کے متعلق ابن حوقل کا اور اس کے علاوہ دوسرے بعض مورخین کا بھی یہی بیان ہے کہ:

"وفیہا مسلمون ولا یلی علیہم من قبل بلھرا الذی فی زماننا ھذا الامسلم یستخلفہ علیہم"

ترجمہ: بلھرا کے علاقے میں کچھ مسلمان بھی آباد ہیں۔ ان مسلمانوں پر بلھرا کی طرف سے اس زمانہ میں وہی آدمی حاکم ہوسکتا ہے جو مسلمان ہو۔ بلھرا کا وہ حاکم ان مسلمانوں پر نمائندہ ہوتا ہے۔ [ابن حوقل، صفحہ ۲۲۷]

جس کا مطلب یہی ہوا کہ حکومت کی جانب سے اس زمانہ میں بھی ہندوستان کے ان گنے چنے مسلمانوں کو اپنے اوپر خود مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کا اختیار دیا جاچکا تھا۔ بلکہ ابن حوقل ان مسلمانوں کے متعلق جو اس زمانہ میں غیر اسلامی حکومتوں کے علاقوں میں آباد تھے، سب ہی کا یہی حال بتاتا ہے، اس کے الفاظ ہیں:

"وکذلک العادۃ وجدتھا فی کثیر من بلدان الاطراف التی تغلب علیھا الکفر کالخزر والسریر واللان وغانہ وکوغہ"

ترجمہ: اور یہی حال (یعنی مسلمانوں پر خود مسلمان حکمران ہیں) یہ بات میں نے بہت سے ان ممالک میں پائی جن پر کفر کا غلبہ ہے۔ مثلاً خزر، سریر، لان، گھانا، کانگو وغیرہ ہیں۔

پھر اسی کی کچھ اور تفصیل ان الفاظ میں کرتا ہے:

"لا یقبل المسلمون فی جمیع هذه الضلع حکم وان یحکم علیهم الا مسلم منهم ولا یتولی حدودهم ولا یقیم علیهم شهادة الاالمسلمون وان قلوا" [ابن حوقل، صفحہ ۲۲۸]

ترجمہ: ان تمام علاقوں میں مسلمان کسی حکم اور فیصلہ کو اس وقت تک تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، جب تک کہ ان پر خود مسلمان ہی حاکم نہ ہو۔ ان پر حدود اور سزاؤں کے نفاذ کا یا ان پر شہادت اور گواہی دلانے کا حق مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ خواہ اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں پر مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے طبقہ کی حکمرانی کو ان علاقوں میں بھی مسلمان قبول نہیں کرتے تھے، جہاں انتہائی اقلیت قلیلہ میں وہ ہوتے تھے۔ اسی نے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ:

"وبلاد بلهرا مساجد یجمع فیها الجمعات ویقام بسائرها الصلوات بالاذان علی المنائر والاعلان بالتکبیر والتهلیل"

ترجمہ: بلہرا کے علاقہ میں مسلمانوں کی مسجدیں بھی ہیں، جن میں جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے اور دوسری معمولی نمازیں بھی پڑھی جاتی ہیں۔ نماز کے لیے میناروں پر اذان بھی ہوتی ہے اور تکبیر و تہلیل، اعلان کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ [ابن حوقل صفحہ ۲۲۸]

اور اس نوعیت کی دوسری کتابوں میں مثلاً بزرگ بن شہریار کی کتاب ''عجائب الہند'' میں لکھا ہے کہ بلہرا کی حکومت میں مسلمانوں کا جو مسلمان افسر ہوتا تھا، اس کا لقب ہنرمن تھا۔ بزرگ ابن شہریار جس زمانہ میں اس علاقہ میں پہنچا ہے، اس وقت وہاں ہنرمنی کے اس عہدے پر جو سرفراز تھا، اس کا نام عباس بن ماہان بتایا ہے۔ [عجائب الہند صفحہ ۱۴۳]

اسی کتاب میں دوسری جگہ الہنرمن کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں:

"والهنرمن هو مثل القاضی فی بلاد الاسلام ولا یکون الهنرمن الا

من المسلمین" [عجائب الہند، صفحہ ۱۶۱]

ترجمہ: اسلامی علاقوں میں جو حیثیت قاضی کی ہوتی ہے وہی حیثیت ہنرمن کو (بلھرا) کے علاقہ میں حاصل ہے، لیکن ہنرمن مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے طبقے سے نہیں ہوسکتا۔

بظاہر "ہنرمن" ہنرمند کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتی ہے۔ خیال گذرتا ہے کہ مسلمانوں کی جو اخلاقی عظمت ہندوستانی حکمرانوں کے قلوب میں قائم ہوگئی تھی۔ شاید اسی سے متاثر ہوکر انہوں نے اپنے مذہبی پیشوا یعنی "برہمن" کے وزن پر مسلمانوں کے پیشوا کو "ہنرمن" کے لفظ کا خطاب دیا ہو، واللہ اعلم بالصواب۔

اسی نے لکھا ہے کہ ہندوستانی قوانین کی رو سے کسی جرم کی خواہ کچھ بھی سزا مقرر ہو، لیکن مسلمان جب اس جرم کے مرتکب ہوتے تھے تو ان کو ہنرمن کے سپرد کردیا جاتا تھا۔ اس لیے سپرد کردیا جاتا تھا، تاکہ:

"یعمل بما یوجبه حکم الاسلام"

ترجمہ: اسلامی قوانین کی رو سے ان پر حکم لگائے۔ [عجائب الہند، صفحہ ۱۶۱]

کیا زمانے کا انقلاب ہے کہ جس زمانے میں مسلمان ہندوستان میں انگلیوں پر بھی بمشکل گنے جاسکتے تھے، اس وقت تو انہوں نے اس ملک میں یہ اختیار اور اقتدار حاصل کرلیا تھا کہ مسلمانوں پر مسلمانوں ہی کی حکومت قائم ہوگی اور مسلمانوں پر ان کے دین ہی کا قانون نافذ ہوگا۔ لیکن آج جب ان کی تعداد اسی ملک میں کروڑوں سے بھی متجاوز ہوچکی ہے، اس مسئلہ کے خیال کو بھی اپنے دماغ میں لانے کی ہم جرأت نہیں کرسکتے۔ دوسروں سے منوانا تو دور کی بات ہے، خود مسلمانوں میں بھی اس پر اتفاق و اجماع ہونا آسان نہیں ہے۔ یہی طے ہونا مشکل ہے کہ اس قسم کے اختیارات کا مطالبہ حکومت کے سامنے مسلمانوں کو پیش کرنا بھی چاہیے یا نہیں۔ دلوں میں کمزوری ہے، محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اس مطالبہ کو کون تسلیم کرے گا، اور سچ پوچھیے تو اصلی کمزوری دلوں ہی کی کمزوری ہے۔ لیکن باوجود قلت تعداد اور مادی ضعف کے جن مسلمانوں نے

ان حقوق کو حاصل کیا تھا، ان کی اندرونی قوت کا اندازہ ابن حوقل ہی کی اس چشم دید شہادت سے ہوسکتا ہے، وہ لکھتا ہے:

''ان ہی علاقوں میں سے بعض علاقوں میں ایسے مسلمانوں سے بھی میری ملاقات ہوئی ہے جن کی پارسائی اور اخلاقی برتری کا یہ حال ہے کہ اپنے مقدمات میں غیر مسلم طبقات کے افراد بھی عموماً ان کو اپنا گواہ مقرر کر کے حکومت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور مقدمہ کا فریق ثانی بھی عموماً ان کی شہادت کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی کسی خاص گواہ کی گواہی پر فریق ثانی کو اگر اعتراض بھی ہوتا ہے تو اس کی جگہ گواہی میں پھر مسلمان ہی کو پیش کر دیا جاتا ہے اور اسی کے بیان پر مقدمہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۲۲۸]

لیکن آج ان ہی حقوق کے حاصل کرنے کا ذریعہ مسلمان جن چیزوں کو بنا رہے ہیں، اب میں ان کے متعلق کیا بیان کروں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ جو چیز دیکھی جا رہی ہے، اسے سنایا کیا جائے۔ غیر بھی اعتماد کرتے تھے ایک حال اسی قوم کا اسی ملک میں یہ تھا اور آج اسی قوم کا اس ملک میں یہ حال ہے کہ ہر مسلمان دوسروں کی دھجیاں بکھیر رہا ہے۔ عزت و ناموس خود مسلمانوں کی مسلمانوں کے ہاتھ برباد ہو رہی ہے۔ باطنی قوت کے اس افلاس کے بعد ظاہر میں طاقت پیدا کرنے کی کوشش قطعاً ایک غیر منطقی کوشش ہے۔

اہل ہند کی مسلمانوں سے عقیدت

جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں، مسلمانوں کے ساتھ اس ملک کے غیر مسلم باشندوں کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ جن چیزوں میں خصوصیت کے ساتھ ہندوستان والوں کو دعویٰ تھا، مثلاً سانپ کے زہر کا ازالہ، جھاڑ پھونک، منتر، جنتر وغیرہ۔ بزرگ بن شہریار نے کولم پلی (جنوبی ہند کے ایک ساحلی شہر) کے تذکرے میں ناگ سانپ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

"ان بکولم بلی رجل مسلم یسمّٰی بالھندیة بنجی وھو صاحب الصلوة یرقی نھشة ھذہ الحیة" [عجائب الہند]

ترجمہ: کولم پلی میں ایک مسلمان ہے جسے ہندوستانی زبان میں بنجی (یعنی بانگی) کہتے ہیں۔ یہ ان کی نماز سے تعلق رکھتا ہے (یعنی مؤذن ہے) وہی ناگ سانپ کے زہر کا ازالہ اپنے جھاڑ پھونک سے کرتا ہے۔

پھر یہ لکھ کر کہ زہر جب مار گزیدہ کے جسم میں اچھی طرح سرایت کر جاتا ہے تو اس وقت گو اس بنجی یعنی مؤذن کی جھاڑ سے نفع نہیں ہوتا، لیکن عام حالات میں مریض عموماً شفایاب ہو جاتا ہے۔ آخر میں بیان کیا ہے کہ گو اس ملک میں بکثرت ایسے لوگ ہیں جو اس خاص سانپ (الناغران) یعنی ناگ اور اس کے سوا دوسرے سانپوں کے زہر کا ازالہ جھاڑ پھونک سے کرتے ہیں۔

"الا ان رقیة ھذا المسلم لا تکاد تخطئ" [عجائب الہند صفحہ ۱۲۰]

ترجمہ: لیکن اس مسلمان مؤذن کا جھاڑ بہت کم خطا کرتا ہے۔

واللہ اعلم! واقعہ کی صحیح نوعیت کیا تھی، لیکن اس قصہ سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے مؤذنوں تک کے متعلق اس ملک کے باشندوں کا یہ اعتقاد تھا کہ اس کا عمل ان کے جھاڑنے والوں کے عمل سے زیادہ مؤثر اور مفید ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بیان سلیمان تاجر کا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنے اخلاق کا کتنا وزن اہل ہند کے قلوب پر ڈال دیا تھا۔ اس قصے سے اندازہ کیجئے۔ بلھرا جس کا ذکر ابھی گذرا ہے، سلیمان اسی راجہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرنے کے بعد جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

"بلھرا کا راجہ اس ملک کا سب سے بڑا بادشاہ ہے اور تمام راجگانِ ہند اس کے فضل وشرف کو مانتے ہیں۔ اگرچہ ہندوستان کا ہر راجہ اپنے اپنے علاقہ کا مستقل حکمران ہے، لیکن بلھرا کی سیادت سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلھرا کے سفیر جب کسی راجہ کے پاس پہنچتے ہیں تو سفیر کے سامنے راجہ

ڈنڈوت کرتے ہیں۔ یہ عظمت کے اظہار کا طریقہ ہے۔''

سلیمان کی کتاب میں "صلوالرسله تعظیماً" کے الفاظ ہیں۔ میں نے ڈنڈوت صلوٰۃ کا ترجمہ کیا ہے۔

پھر بلھرا کے متعلق اور مختلف باتیں یعنی اس کا سکہ کس قسم کا ہے۔ سن کی ابتداء کس زمانہ سے ہوئی، آخر میں لکھتا ہے کہ:

''بلھرا خاندان کے راجگان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بسا اوقات پچاس پچاس سال تک ایک ایک راجہ کو حکومت کرنے کا موقعہ اس گدی پر مل جاتا ہے۔''

اور یہ برکت ان حکمرانوں کو کس ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے؟ سلیمان راوی ہے کہ:

"تزعم اهل مملكة بلهرا انما يطول مدة ملكهم واعمارهم فى الملك لمحبتهم للعرب" [سلیمان صفحہ ۲۷]

ترجمہ: بلھرا کی حکومت والوں کا خیال ہے کہ ان کی حکومت کی مدت اور ان کی عمر کی درازی کا سبب یہ ہے کہ عرب سے یعنی مسلمانوں سے وہ محبت کرتے ہیں۔

سنا آپ نے اس ملک والوں کا عقیدہ؟ چونکہ عرب یعنی مسلمانوں کے ساتھ بلھرا خاندان کے راجگان محبت کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ ان کی عمروں کو بڑھا دیتا ہے۔ یہ تھا محبوبیت کا وہ مقام جو مسلمان اپنے اخلاق کی بدولت ان ممالک میں حاصل کر لیتے تھے جہاں وہ بے چارے صرف مسافروں اور تاجروں کی حیثیت سے پہنچتے تھے کہ نہ صرف وہی بلکہ ان کی قوم تک دوسروں کی محبوب بن جاتی تھی اور کیسی محبوب کہ خدا کی ساری مہربانیوں کو اسی محبت کا نتیجہ قرار دیتی تھی۔ کیا بجائے مغربی طریقوں کے مسلمان دوسری قوموں کی محبت کو اپنی پرانی راہوں سے نہیں حاصل کر سکتے!

میں نے جیسا کہ عرض کیا کہ یہ حال کچھ ایک بلھرا اور اس کے ملک کے باشندوں ہی کا نہیں تھا۔ ابن حوقل کے حوالہ سے یہ بات گذر چکی ہے کہ جہاں کہیں بھی اس زمانہ میں مسلمان

پہنچتے تھے، کچھ ایسا اثر اس ملک کے باشندوں اور حکمرانوں پر ڈال دیتے تھے کہ بخوشی ورضا وہاں کے حکمران مسلمانوں پر حکومت کرنے کا اختیار خود مسلمانوں کے سپرد کر دیتے تھے۔

سلیمان تاجر ہی نے چین کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:

''شہر خانفو (جو کہ شنگھائی کے قریب ہے) جو چین کے مسلمان تاجروں کا مرکزی مقام تھا، یہاں بھی چین کے بادشاہ نے مسلمانوں پر حکومت اوران کے متعلق فصلِ خصومات کے اختیارات کو ایک مسلمان ہی کے سپرد کر رکھا ہے۔''

اس کے بعد لکھا ہے کہ یہی مسلمانوں کا ''والی'':

"اذا کان فی العید صلی بالمسلمین وخطب ودعا لسلطان المسلمین وان التجار العراقیین لا ینکرون من ولایته شیئاً فی احکامه وعمله بالحق و بکتاب الله عز وجل و احکام الاسلام"

ترجمہ: عید کے دن مسلمانوں کو وہی نماز پڑھاتا ہے اور خطبہ پڑھاتا ہے اور مسلمانوں کے سلطان (خلیفہ) کے لیے دعا کرتا ہے۔ عراق کے مسلمان تجار چینی حکومت کے اس ''مسلم والی'' کی حکومت اور اس کے احکام کا انکار نہیں کرتے اور حق پر اس کا عمل ہے۔ اللہ کی کتاب کے مطابق اور اسلامی قوانین کے مطابق وہ فیصلہ کرتا ہے۔ اس پر بھی کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ [سلیمان صفحہ ۱۴]

جنہوں نے یورپ سے سیاست کا علم سیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ سیاست کا علم صرف ان ہی کی ذات قدسی صفات میں منحصر ہے۔ ان کو سننا چاہیے کہ وہی عید کی نماز اور جنازوں کی نماز پڑھانے والے، خطبہ دینے والے، مسجد کے ملانے، بے تیغ وتفنگ، اقلیت کی انتہائی شکلوں میں بھی وہ کچھ حاصل کر لیتے تھے۔ جسے آج شاید سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

اس سلسلہ میں بزرگ بن شہریار نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض ایسی رعایتیں ان ممالک میں مسلمانوں کو حاصل تھیں جن سے خود اس ملک کے باشندے محروم تھے۔ اس نے لکھا ہے کہ:

''ذہب (سونے) والے ملک اور جاوہ کے بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی بھی ہو، ایک خاص شکل ہی کے ساتھ بیٹھ سکتا ہے۔ اس نشست کا نام ان کی اصطلاح میں برسیلا ہے۔ چارزانو ہوکر لوگوں کو ان بادشاہوں کے سامنے بیٹھنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ان کے ملک کے لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ خواہ وہ کسی درجہ کا آدمی ہو۔ نشست کے اس خاص طریقہ کو ترک کر کے راجہ کے سامنے بیٹھنے کی اگر کوئی جرأت کرے تو سخت سزا کا مستوجب ٹھہرتا ہے۔''

بظاہر اس سے مراد ہندوستان ہی ہے۔ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مسلمان ہندوستان کو ''سونے کے گھر کا شگاف'' اور کبھی ''خانہ زر'' بھی کہتے تھے۔ بزرگ بن شہریار کے دوسرے بیانوں سے معلوم ہوتا تھا کہ کبھی کبھی اس لفظ کا اطلاق بلھرا کے ملک پر کرتے تھے ممکن ہے کہ اس زمانہ میں سونا اس علاقہ سے نکلتا ہو۔ اب بھی ہندوستان میں سونے کی کانیں ریاست حیدرآباد اور ریاست میسور میں پائی جاتی ہیں۔ جاوہ کا لفظ ترجمہ میں، میں نے لکھا ہے۔ اصل کتاب میں "بلاد الزائج" ہے۔ لیکن دوسرے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی تجار جاوہ کا تلفظ زائج کے کرتے تھے۔

لیکن اسی کے ساتھ اسی کا بیان ہے کہ:

"الی الیوم رسم ان یجلس المسلمون بین ایدیھم کما یشتھون ویجلس غیرھم علی الرسم الاول برسیلا فان غیر جلسته کانت علیه الغرامة" [عجائب الہند صفحہ ۱۹۶]

ترجمہ: اس وقت تک یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ ان غیر مسلم راجگان کے سامنے مسلمان جس طرح چاہیں بیٹھ سکتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے سوا دوسرے لوگ مذکورہ بالا قاعدہ کے مطابق بیٹھنے پر مجبور ہیں، جس کا نام برسیلا ہے۔ نشست کے اس خاص طریقہ کے خلاف راجہ کے سامنے اگر کوئی بیٹھنے کی جرأت کرے تو اسے جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

اور میرا خیال تو یہ ہے کہ اس عہد کے یہی مصنفین جن کی کتابوں سے اخذ کر کے میں ان معلومات کو پیش کر رہا ہوں، اس زمانہ کے مسلمانوں کے عام اخلاقی معیار کی بہترین شہادتوں کا کام دے سکتے ہیں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ عموماً لوگوں کا عام حال یہ ہے کہ دوسری قوموں کا یا دوسروں کے اوطان و اقالیم کا جب ذکر کرتے ہیں تو بہت کم انصاف سے کام لیتے ہیں۔ دیکھا یہی جاتا ہے کہ لوگ اپنے ملک پر مشکل ہی سے دوسرے ممالک کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کی ایک وجہ بھی ہے۔ اصل واقعہ تو یہ ہے کہ اپنا ملک ہو یا دوسرے کا، اپنا دیس ہو یا پردیس۔ جب سب ہی کا حال یہ ہے کہ جہاں بھی جو جلایا جاتا ہے، مرنے ہی کے لیے جلایا جاتا ہے۔ یورپ ہو یا امریکہ، ایشیا ہو یا افریقہ، ہند ہو یا سندھ، چین ہو یا جاپان۔ جہاں کہیں بھی زندگی کا بخار، عناصر کے کسی خاص ریزے یا مادے کے کسی خاص ٹکڑے پر چڑھتا ہے تو ظاہر ہے کہ دم ہی لے کر اترتا ہے۔ ایسی زندگی جس کی ہر بہار کے پیچھے خزاں کے دھکے ہوں، اور ہر شادی کے نقارے کے ساتھ غم کا نوحہ شروع ہو جاتا ہو، ہر صحت کو مرض دھمکیاں دے رہا ہو۔ الغرض جہاں ہر بقا کا انجام فنا ہو، وہاں یہ سوال کہ اس دنیا کا کونسا خطہ اچھا ہے اور کونسا برا۔ تھوڑی دیر کی غفلت کا ذریعہ تو بن سکتا ہے۔ لیکن حقیقت جب سامنے آتی ہے تو سوئزرلینڈ یا کشمیر کے مرغزاروں اور صحرائے افریقہ کے واحستانوں میں سچ پوچھئے تو کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

ریگستانی صحراؤں کا قاعدہ ہے کہ کہیں کہیں بیچ میں ان کے نخلستان پیدا ہو جاتے ہیں۔ عربی میں ان کو "واحات" کہتے ہیں۔ میں نے اسی سے "واحستان" کا لفظ بنایا ہے۔

تاہم آدمی جس خطہ میں پیدا ہو جاتا ہے یا پیدا کر دیا جاتا ہے۔ چاہتا ہے کہ جتنے دنوں بھی یہاں جینا ہے کسی نہ کسی طرح ان دنوں میں اس علاقہ کے ماحول کو حتی الوسع اپنے اندرونی احساسات کے مطابق بنالیا جائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ آدمی کی اسی نفسیاتی کاریگری کا نام حب الوطنی ہے اور حب الوطن کے اس خود آفریدہ جذبہ کی تسکین کے لیے دوسرے ممالک اور اقالیم

کے مقابلہ میں اپنے وطن کی ترجیح وتفضیل کے وجوہ تلاش کرتا رہتا ہے پھر جیسا کہ اس دنیا کا کوئی شہر ایسا نہیں ہے جس میں شر کا پہلو نہ پیدا ہوتا ہو، یہی حال اس عالم کے شرور اور برائیوں کا بھی ہے کہ غور کرنے کے بعد کسی نہ کسی حیثیت سے کچھ خیر کے پہلو بھی ان میں نکل ہی آتے ہیں۔

عام قاعدہ ہے کہ شر کے پہلوؤں سے قطع نظر کر کے خیر ہی کے پہلوؤں سے اپنے وطن کے متعلق آدمی تسلی حاصل کیا کرتا ہے۔ اسی قسم کے مصنفین میں جن کی کتابوں سے میں اپنی اس تصنیف میں کام لے رہا ہوں۔ ایک مصنف علامہ مقدسی بھی ہیں۔ ان کی مشہور کتاب اس سلسلہ میں ''احسن التقاسیم'' نامی ہے۔ ایک موقع پر بلوچستان ومکران کے مفازہ کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ یہ بڑا خطرناک مفازہ، (ریگستانی ٹاپو بیابان) ہے۔ بلوچی اور قفص قوم کے ڈاکو عموماً یہاں قافلوں پر چھاپے مارتے ہیں۔ آئندہ کسی موقعہ پر ان ظالموں کے مظالم کا شاید ذکر بھی آئے۔ اس وقت کہنا یہ ہے کہ مقدسی کی ملاقات اسی مفازہ کے خاص اس مقام پر جہاں ڈاکو جمع ہو کر قافلوں پر حملوں کی تیاریاں کیا کرتے تھے، ایک شخص سے ہوئی جو صرف توت کے چند درخت اور انگور کی چند بیلوں کی پرورش میں وہاں مشغول تھا۔ مقدسی نے لکھا ہے کہ میں نے پوچھا کہ ''میاں تمہارا دل یہاں نہیں گھبراتا؟'' بوڑھا آدمی تھا۔ بولا کہ ''چند سال ہوئے میں نیشاپور گیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ میرا قیام بھی وہاں رہا۔ لیکن لوگوں کی گہما گہمی، آمدورفت، غل غپاڑے سے میرا دل اتنا پریشان ہوا کہ وحشت کے اس حال پر زیادہ دن تک صبر نہ کرسکا اور سکون کی زندگی گذارنے کے لیے میں پھر اسی ریگستانی گوشے میں پناہ گزین ہو گیا ہوں۔

لیجئے! ایک ایسے وحشت کدہ میں بھی آدمی کا جب جی چاہتا ہے تو سکون وعافیت کا پہلو پیدا کر لیتا ہے۔

مسلمان سیاحوں کی بے تعصبی اور راست بیانی

بہرحال سچ پوچھیے تو اس جذبہ کا شعوری یا غیر شعوری تقاضہ ہوتا ہے جو عموماً اپنے ملک کے مقابلہ میں دوسرے ممالک کی خوبیوں کا اعتراف آدمی دل کھول کر نہیں کرتا۔ لیکن اسلام کے

ان مصنفین کی کتابوں کو پڑھ کر میں تو حیران ہو کر رہ گیا کہ خلاف دستور انہوں نے انتہائی فیاضیوں سے کام لیتے ہوئے ایسے ممالک کی تعریفیں کی ہیں جن کے باشندوں سے نہ ان کا کوئی دینی تعلق تھا نہ نسلی۔ اور تعلق کیا معنی؟ ان کے مذہب کی رو سے جہاں کے باشندے کافر اور بے دین تھے، لیکن بایں ہمہ کوئی ملک ہو، اس کے باشندوں کا مذہب و دین کچھ ہی ہو، کسی نسل کے لوگ ہوں، جو بھلائیاں اس ملک میں ان کو نظر آئی ہیں بغیر کسی جنبہ داری اور عصبیت کے دل کھول کر اس کا اظہار ان مصنفین نے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعات کے اظہار کے سلسلہ میں ان کے قلم سے جہاں ایسی باتیں نکل گئی ہیں جنہیں ان ممالک کے نقائص و عیوب ہم قرار دے سکتے ہیں۔ ان کی واقعیت میں بھی شک وشبہ کی بہت کم گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

چونکہ اس وقت ہندوستان کا ذکر چھڑا ہوا ہے، اس لیے جی چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں اسی کے متعلق بعض خاص چیزوں کا تذکرہ کروں۔

اس سلسلہ میں سب سے پرانی کتاب سلیمان تاجر کی سمجھی جاتی ہے۔ یعنی دوسری صدی ہجری کے کل سینتیس سال بعد کی یہ کتاب معلوم ہوتی ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ چوتھی صدی ہجری تک تجار اور سیاحوں کو اندرون ہند میں گھسنے کے مواقع باآسانی جب میسر نہیں آتے تھے تو دوسری اور تیسری صدی کے ابتدائی سالوں میں اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ مگر پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان مسلمان سیاحوں نے ہندوستان کے متعلق صحیح معلومات کا ذخیرہ کسی نہ کسی طرح جمع ہی کر لیا تھا اور زیادہ تر یہ معلومات ان کے مشاہدات سے ہی ماخوذ ہیں۔ جس کا پتہ خود ان کے بیانات سے ملتا ہے۔

ہندوستان کے جوگی

سلیمان تاجر ہندوستانی جوگیوں اور نفس کشی کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقعہ پر لکھتا ہے کہ:

''بلاد ہند میں رہتے جوگیوں کا ایک طبقہ پایا جاتا ہے۔ یہ سیلانی لوگ ہوتے

ہیں۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ انسانوں سے ان کا میل جول بہت کم ہوتا ہے۔ عموماً یہ جنگل کی جڑی بوٹیاں یا جنگلی پھلوں کو کھا کر گذارا کرتے ہیں۔ اپنے نسلی عضو میں لوہے کا ایک چھلا ڈال لیتے ہیں تا کہ عورتوں کے کام کے باقی نہ رہیں۔ بعض ان میں بالکل ننگ دھڑنگ ہی رہتے ہیں۔ کچھ لوگ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو دھوپ میں ننگے کسی کپڑے کے بغیر کھڑے ہونے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی شیر کی کھال بدن پر ڈال لیتے ہیں۔"

الغرض اسی قسم کی باتوں کو بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ:

"فقد رأیت رجلاً منھم کما وصفت ثم انصرفت وعدت بعد ست عشرۃ سنۃ فرأیتہ علی تلک الحال. فتعجبت کیف لم تسل عینہ من حر الشمس" [سلیمان صفحہ ۵۱]

ترجمہ: جیسا کہ میں نے بیان کیا اسی قسم کے ایک آدمی کو میں نے خود دیکھا تھا۔ پھر سولہ سال بعد جب میں واپس ہوا تو اس شخص کو بجنسہ اسی حال پر میں نے پایا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس کی آنکھ اس عرصہ میں دھوپ کی حرارت سے بہہ کیوں نہ گئی۔

جس سے معلوم ہوا کہ سلیمان خود ہندوستان آیا تھا اور واقعات کا مشاہدہ اس نے خود کیا ہے۔ بلکہ اس فقرے سے تو اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آمد و رفت کا سلسلہ عربی تاجروں کا ملک ہند میں جاری تھا۔ سولہ سال کے بعد پھر وہ اس ملک میں واپس ہوا ہے اور بھی دوسرے مقامات پر اسی قسم کی باتیں اس نے لکھی ہیں۔ یہ تو سب ہی بیان کرتے ہیں، جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ ہندوستان میں کسی ایک راجہ کی حکومت قائم نہیں ہے۔ سلیمان کے الفاظ ہیں کہ:

"بل کل واحد ملک بلادہ"

ترجمہ: بلکہ ہر راجا اپنے علاقہ کا حکمران ہے۔ [سلیمان صفحہ ۵۱]

صرف سواحل بحر ہند کے راجاؤں کی سلیمان نے ایک طویل فہرست دی ہے۔ جس

میں بعض الفاظ تو سمجھ میں آتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کے متعلق پتہ نہیں چلتا کہ اس کی مراد کیا ہے۔ بلھرا کا ذکر تو خیر گذر ہی چکا ہے۔ سلیمان نے لکھا ہے کہ بلھرا کے علاقہ کو کم کم کہتے ہیں شاید کوکن کی یہ خرابی ہو، لکھا ہے کہ:

"وحوله ملوك كثيرة يقاتلونه"

ترجمہ: بلھرا کے اردگرد، آس پاس میں بہت سے راجہ ہیں جو اس سے جنگ کرتے رہتے ہیں۔ [سلیمان صفحہ ۲۸]

پھر ان ہی ملوک میں ملک الجزر کا نام لیتا ہے۔ جس سے غالباً گجرات کا راجہ مقصود ہے۔ پھر ایک ملک الطافق کا تذکرہ ہے۔ واللہ اعلم اس سے کیا مراد ہے؟ دریائے تاپتی جس علاقہ میں بہتا ہے یعنی خاندیس مقصود ہے یا کیا ہے اتنا پتہ دیا ہے کہ اس راجہ کے علاقہ کی عورتیں تمام ہندوستان کی عورتوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ حسین ہیں۔ پھر رہمی نامی راجہ کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ رہمی میں اور ملک الجزر میں برابر جنگ ٹھنی رہتی ہے اور یہ کہ بلھرا سے بھی رہمی کا مقابلہ ہوتا رہتا ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ رہمی غالباً کاٹھیاواڑ کے خطہ کی تعبیر ہے۔ بہر حال، کچھ ہی ہو۔ ان مورخین کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے اور یوں بھی دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان بے شمار حکومتوں اور ریاستوں کی شکل میں بٹا ہوا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان جو کچھ تھا آج اس کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔ جنوبی ہند کی تاریخ مولوی محمود خان بنگلوری نے جو لکھی ہے اس میں میسور کی ایک مستند تاریخ سے یہ نقل کیا ہے کہ:

''جب میسور کے راجہ نے تنجن گڑھ کی تیرتھ کو جانا چاہا تو اس کو راستے میں دو دوسرے رجاؤں سے اجازت لینی پڑی۔''

[بحوالہ تاریخ میسور صفحہ ۲۲، تاریخ جنوبی ہند، صفحہ ۳۰۰]

اور اس راستہ کا فاصلہ کتنا تھا، مولوی محمود خان کا بیان ہے کہ:

''میسور اور تنجن گڑھ کا درمیانی فاصلہ کل سولہ میل کا ہے۔''

سمجھا آپ نے کل سولہ میل کے اندر اندر دو راجدھانیاں واقع تھیں۔

مجھے بتلانا یہ ہے کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان مسلمان سیاحوں کی نظر واقعات کی تحقیقات میں کتنی گہری تھی۔

مسلمانوں میں اجنبی زبانوں کے سیکھنے کا شوق

ان ہی سیاح مورخین کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں قریب کی نہیں بلکہ ہندوستان سے دور اندلس تک کے مسلمان ہندوستانی زبان سیکھتے تھے اور اس میں گفتگو کرتے تھے۔ بزرگ بن شہریار نے ابوالزہراء البرختی ناخدا کا جو پہلے ایک ایرانی مجوسی تھا، اور بعد کو مسلمان ہوگیا تھا، اسی کی زبان ایک بڑا طویل قصہ نقل کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ہمارا جہاز طوفان میں گھر گیا تھا۔ لوگ پریشان تھے۔ کپتان کی نگاہوں سے بچ کر ایک اندلسی مسلمان جو قادس کا رہنے والا تھا، جہاز میں سوار ہوگیا تھا اور مدتوں جہاز کے ایک گوشہ میں پڑا رہا۔ لوگوں کی پریشانی دیکھ کر باہر نکلا اور کپتان کے پاس پہنچا۔ بزرگ نے اس موقع پر لکھا ہے کہ:

"فسلم علیه بالهندیة فرد علیه"

ترجمہ: ہندوستانی زبان میں اس اندلسی مسلمان نے کپتان کو سلام کیا۔ کپتان نے اسی زبان میں اس کو جواب دیا۔ [عجائب الہند صفحہ ۲۴]

اجنبی زبانوں کے سیکھنے کے اس شوق ہی کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ بزرگ ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے ہزار سال پہلے ہندوستان کی کسی زبان میں قرآن کا ترجمہ بھی ہو چکا تھا۔ بزرگ بن شہریار نے ابومحمد الحسن بن عمرو بن حمویہ کے حوالہ سے ایک طویل روایت درج کی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ہندوستان کا ایک راجہ جو کشمیر اعلیٰ اور کشمیر اسفل کے درمیانی علاقہ کا راجہ تھا اور مہروک بن رائق اس کا نام تھا۔ اس نے ۲۷۰ھ میں منصورہ کے امیر عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز الہباری کے پاس خط لکھا کہ اس کے پاس ایک ایسا آدمی بھیج دیا جائے:

"یفسر له شریعة الإسلام بالهندیة"

ترجمہ: جو شریعت اسلام کے احکام ہندی زبان میں بیان کر سکے۔

منصورہ کے امیر نے ایک مسلمان کو بھیجا، جس کے متعلق لکھا ہے کہ:

"عرف لغاتهم على اختلافها"

ترجمہ: ہندوستان کی مختلف زبانوں کو جانتا تھا۔

راجہ کے پاس یہی مسلمان چند سال رہا اور اسلام سے راجہ کو پورے طور پر اس نے واقف بنا دیا۔ اسی سلسلہ میں اس کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ:

"انه سالہ ان يفسر له القران بالهندية ففسره له"

ترجمہ: راجہ نے اس سے خواہش کی کہ ہندی زبان میں اس کے لیے قرآن کی تفسیر کر دے۔ [عجائب الہند صفحہ ۳]

اسی کا بیان ہے کہ:

"انتهيت من التفسير الى سورة يٰسين"

ترجمہ: یعنی سورہ یٰسین تک قرآن کی تفسیر ہندی زبان میں اس نے پوری کر دی تھی۔

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو شاید قرآنی ترجمہ کے متعلق اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ترجمہ کا سب سے پہلا فخر سرزمین ہند ہی کی کسی زبان کو حاصل ہوا تو اس کا مشکل ہی سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ غالباً اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسری تیسری صدی کے ان سیاحوں کی کتابوں میں جو عربی زبان میں لکھی گئی ہیں ہندی زبان کے الفاظ کا ایک ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ گو خالص ہندی شکل میں وہ الفاظ باقی نہیں رہے۔ مثلاً تلاؤ کو تلاج، ڈینگی یعنی کشتی کو دونیج، ناگ کو ناغران، ہنڈول کو ہندول، پلنگ کو بلنج، وغیرہ وغیرہ بیسیوں الفاظ ان کتابوں میں ملتے ہیں۔

جانوروں کی بولی کا علم

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان مسلمان مصنفین نے ہندوستان اور ہندوستان کے باشندوں کے متعلق جو باتیں بیان کی ہیں ان سے پرانے مسلمانوں کی وسعت قلبی کا عجب ثبوت ملتا ہے۔ اگر حسن ظن سے کام نہ لیا جائے تو اسے ان مسلمانوں کی شاید خوش اعتقادی

سمجھی جاسکتی ہے۔ ایک واقعہ نہیں، متعدد واقعات ان ہی کتابوں میں ایسے منقول ہیں جن کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً بزرگ بن شہریار نے بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں بکثرت ایسے اہل کمال پائے جاتے ہیں جو علم زجر میں کمال رکھتے ہیں۔ یہاں پر علم زجر سے کیا مراد ہے؟ آئندہ جس واقعہ کو اس کے بعد بیان کیا ہے اس سے تو میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ جانوروں کی بولیوں کا علم خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان والوں کو حاصل ہے۔ کیونکہ آگے قصہ یہ بیان کیا ہے کہ:

''سیراف (اس ایرانی بندرگاہ کا ذکر آئندہ مختلف مقامات پر آئے گا۔ اس زمانہ کی یہ سب سے بڑی تجارتی بندرگاہ تھی) بہرحال اسی سیراف کے ایک تاجر نے بیان کیا کہ صابور نامی مقام سے وہ لویارہ براہِ خشکی جارہا تھا۔ وہاں کے مقامی راجہ سے تاجر نے درخواست کی کہ اس کے ساتھ بطور بدرقہ کے حفاظت کا سامان کردیا جاوے۔ راجہ نے ایک آدمی اس تاجر کے ساتھ کردیا جو راجہ کے دربار کے پائک (پیادوں) میں تھا۔ تاجر کہتا ہے کہ ہم اور وہ دونوں جب روانہ ہوئے اور صیمور (چیمور) سے باہر نکل آئے تو ایک تلاج (تلاؤ) کے کنارے بیٹھے۔ یعنی پانی کا تالاب تھا اور ایک گرام یعنی باغ بھی وہیں پر تھا۔ مطلب یہ تھا کہ کچھ کھاپی لیں۔ ہمارے ساتھ کھانے میں کچھ چاول بھی تھے۔ اتنے میں ایک کوے کی آواز آئی۔ اس پر میرے ہندی رفیق نے کہا کہ ''جانتے ہو، یہ کوا کیا کہہ رہا ہے؟'' میں نے کہا کہ ''نہیں۔'' ہندی رفیق نے کہا کہ ''کوا کہہ رہا ہے کہ جس چاول کو تم لوگوں نے کھایا ہے اس میں میرا بھی کچھ حصہ تھا اور میں اس کو ضرور کھا کر رہوں گا۔''

سیرافی تاجر کا بیان ہے کہ ہندی کے اس بیان پر مجھے تعجب ہوا، کیونکہ ہم لوگ تو اس چاول کو کھا چکے تھے۔ کچھ بھی باقی نہ چھوڑا تھا۔ آخر ہم وہاں سے آگے روانہ ہوئے، چلے جارہے تھے۔ ابھی دو فرسخ بھی راہ طے نہ ہوئی ہوگی کہ

اچانک ہمارے سامنے پانچ ہندوستانی آدمی آتے ہوئے دکھائی دیے یا شاید چھ تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر میرا جو ہندی رفیق تھا، میں نے دیکھا کہ وہ پریشان ہورہا ہے اور اضطراب کی حالت میں ہے اور مجھ سے کہنے لگا کہ ''میں ان لوگوں سے لڑوں گا؟'' میں نے کہا ''کیوں؟'' اس نے کہا کہ ''مجھ میں اور ان لوگوں میں پرانی دشمنی ہے۔'' ہم یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ ان آنے والوں نے خنجر کھینچ لیے اور بیچارے میرے رفیق پر پل پڑے۔ حتیٰ کہ اسے جان ہی سے مار ڈالا اور اس کے پیٹ کو پھاڑ دیا۔ ان کی اس حرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس بے چارے کے پیٹ میں جو کچھ تھا، سب باہر نکل آیا۔ اس حال کو دیکھ کر میرے ہوش جاتے رہے۔ کچھ ایسا بدحواس ہوا کہ چلنے کی سکت مجھ میں باقی نہ رہی۔ بے ہوش ہوکر گویا میں گر پڑا۔ میری عقل بجا نہ تھی۔ لیکن ان قاتلوں نے مجھے تسلی دی اور سمجھایا کہ تم مت ڈرو، کیونکہ ہماری دشمنی تو اس شخص سے تھی۔ تم سے ہمارا کیا تعلق۔ یہ کہہ کر جس راہ سے آئے تھے اسی پر واپس چلے گئے۔ جب کچھ دور نکل گئے تب میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی کوا اترا اور مقتول رفیق کے شکم سے جو چاول باہر نکل پڑے تھے، انہیں چن چن کر کھا رہا تھا۔ [بزرگ بن شہریار، صفحہ ۱۰۶]

اسی بزرگ بن شہریار نے موسیٰ صندا پوری کے حوالہ سے تقریباً اسی قسم کی ایک اور روایت نقل کی ہے کہ:

''میں صندا پور کے راجہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، دیکھا کہ راجہ کچھ ہنس رہا ہے۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا میرے ہنسنے کی وجہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم؟ راجہ نے کہا کہ دیکھو وہ سامنے دیوار پر گرگٹ بیٹھی ہوئی۔ یہ مجھ سے کہہ رہی ہے، ایک پردیسی مسافر تمہارے پاس آرہا ہے۔ راجہ کی اس حماقت

پر مجھے تعجب ہوا اور میں نے اسی وقت چاہا کہ اس کے پاس سے اٹھ جاؤں۔ لیکن اس نے اصرار کیا کہ بیٹھے رہو اور جو بات تم سے کہی گئی ہے اس کے نتیجہ کو بھی تو دیکھ لو۔ اس کے اس کہنے پر میں بیٹھا رہا۔ ہم گفتگو میں مشغول ہی تھے کہ اچانک راجہ کے آدمیوں میں سے ایک آدمی آیا اور اطلاع دی کہ صندا پور کی خلیج میں عمان کا ایک جہاز ابھی پہنچا ہے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک جماعت تاجروں کی کپڑوں اور عرق گلاب وغیرہ لیے ہوئے آرہی ہے۔''

[بزرگ بن شہریار، صفحہ نمبر ۱۵۸]

فصل خصومات کا حیرت انگیز طریقہ

اور اس سے بھی دلچسپ تر بیان سلیمان تاجر کا ہے۔ یعنی ہندوستانی عدل و انصاف کی تعریف کرتے ہوئے اس نے اپنا ذاتی تجربہ یہ بیان کیا ہے کہ:

''ہندوستان میں کسی ایسی بات کا کسی پر دعویٰ اگر کوئی کرتا ہے، جس کے ثابت ہو جانے کے بعد مدعا علیہ کا قتل ہو جانا وہاں کے قانون کی رو سے ضروری ہو تو مدعی سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا آگ والے امتحان میں اس کو ڈالنا تم پسند کرتے ہو؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ ہاں! تب لوہے کے کسی ٹکڑے کو آگ میں خوب گرم کرتے ہیں۔ جب وہ بالکل لال ہو کر خود آگ کا ایک انگارہ بن جاتا ہے تب مدعی علیہ سے کہا جاتا ہے کہ ہاتھ آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ پر ایک خاص قسم کے درخت کے سات پتے رکھ دیئے جاتے ہیں اور پھر اس کے ہاتھ پر اسی گرم گرم دہکتے ہوئے لوہے کو رکھ دیا جاتا ہے۔ یعنی درمیان میں صرف وہی چند پتے رہتے ہیں۔ پھر اس گرم لوہے کو ہاتھ پر رکھے ہوئے وہ آگے پیچھے دوڑتا ہے۔ اس کے بعد اس کے ہاتھ پر ایک تھیلی چڑھا دی جاتی ہے اور راجہ اس پر اپنی مہر ثبت کرتا ہے۔ پھر تین دن جب گذر جاتے ہیں تو تھیلی سے ہاتھ

نکالا جاتا ہے اور ایسے چاول جن کے چھلکے ان سے الگ نہیں کیے گئے ہوں، یعنی دھان اس کے حوالے کیے جاتے ہیں کہ ان چھلکوں کو اپنے ناخن سے اتارے۔ اگر لوہے کی آگ سے اس کا ہاتھ متاثر نہیں ہوتا تو با آسانی چھلکوں کو اتار دیتا ہے اور یوں قتل سے وہ بچ جاتا ہے۔ اور بجائے اس کے خود مدعی پر جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک من سونا ادا کرے جس پر راجہ خود قبضہ کر لیتا ہے۔ بسا اوقات بجائے اس ترکیب کے ہانڈی میں پانی گرم کرتے ہیں۔ خواہ لوہے کی ہانڈی ہو یا تانبے کی۔ پانی کو اتنا گرم کرتے ہیں کہ آدمی اس کے قریب جانے کی بھی ہمت نہیں کرسکتا۔ پھر اسی گرم پانی میں لوہے کی ایک انگوٹھی ڈال دی جاتی ہے اور مدعی علیہ سے کہا جاتا ہے کہ اسی کھولتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈال کر اس انگوٹھی کو نکال لے۔" [سلیمان صفحہ ۴۹]

اس قصے کو بیان کرنے کے بعد سلیمان نے آخر میں لکھا ہے:

"وقد رأیت من ادخل یده واخرجها صحیحة"

ترجمہ: میں نے اپنی آنکھ سے اس آدمی کو دیکھا ہے جس نے اس کھولتے پانی میں ہاتھ ڈالا اور بالکل درست حال میں اپنے ہاتھ کو پانی سے باہر نکال لیا۔

اس سے بحث نہیں ہے کہ فصل خصومات کا یہ ہندی طریقہ واقعتاً کس حد تک قابل اعتماد ہوسکتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ہاتھ ڈالنے والے کن تدبیروں سے کام لیتے تھے۔ یا کیا کرتے تھے۔ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ ان مسلمان سیاحوں کے بیانات کا ایک بڑا حصہ دیدہ اور چشم دید شہادتوں کا نتیجہ ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ سلیمان مدعی ہے کہ مجرموں کے ساتھ اس طرز عمل کو اختیار کرتے ہوئے میں نے خود دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک پردیسی اجنبی آدمی کے لیے یہ مشکل ہے کہ اندرونی حقائق سے وہ صحیح واقفیت حاصل کرے۔ بظاہر جو بات اس کے سامنے گذری اسی کا اس نے اظہار کر دیا ہے اور یہ انصاف پسندی کے جذبہ کا کتنا اچھا معصوم ثبوت ہے۔ چاہتا تو

بیسیوں شکوک کا اظہار کرسکتا تھا۔ خصوصاً مسلمانوں کے عام ائمہ کا خیال بھی جب یہ ہے کہ اس قسم کے طریقوں سے دعاوی کا فیصلہ صحیح نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو قرعہ اندازی کے ذریعہ سے بھی فصل خصومات کے طریقہ کا انکار کرتے تھے۔ یا مباہلہ تک کے متعلق مشہور ہے کہ احقاق حق یا ابطال باطل کا ذریعہ عام لوگوں کے لیے اس کو نہیں قرار دیا جاسکتا۔ انبیاء علیہ السلام یا خدا کے خاص بندوں کی اور بات ہے۔

ہندوستانی رسم ورواج

خیر یہ دوسری باتیں ہیں۔ ان خود اعترافی شہادتوں کے سوا جو معلومات ان مورخین کی کتابوں میں ملتے ہیں ان کی صحت کی ایک دلیل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ گو انہوں نے آج سے ہزار برس پہلے کی باتیں ہندوستان کے متعلق بیان کی ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی بہت سی بیان کردہ ایسی باتیں اب بھی ہندوستان میں پائی جاتی ہیں، جن سے ان کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً سلیمان ہی نے بیان کیا ہے کہ ہندوستان کے لوگ دن کے کھانے میں پہلے غسل ضرور کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کی عام عادت یہ ہے کہ مسواک کیے بغیر کھانا نہیں کھاتے۔ وہ ایام کے دنوں میں عورتوں سے مقاربت کو جائز نہیں سمجھتے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ جیسے اس ملک میں حکمرانی چند خاص خانوادوں کے ساتھ مخصوص ہے، اسی طرح ہر ہر پیشہ بھی خاص خاص خاندانوں کے لیے موروثی طور پر مختص ہے۔ حتیٰ کہ طبابت کتابت اس قسم کی چیزیں بھی خاندانی ہیں۔ ان گھرانوں کے سوا جن کا یہ موروثی پیشہ ہے، کوئی دوسرا اس پیشہ کو اختیار نہیں کرسکتا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان والے عموماً اپنے مردوں کو آگ میں جلاتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ یہ باتیں اس زمانہ تک ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔ [سلیمان صفحہ ۵۰ و ۵۱]

اور عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کے متعلق حالانکہ ان ہی لوگوں کا بیان ہے کہ روزانہ غسل کے بغیر وہ کھانا بھی نہیں کھاتے، لیکن پیشاب کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

''پیشاب کرنے کے بعد بغیر اس کے کہ نجاست صاف کریں فوراً کپڑے کو

برابر کر لیتے ہیں۔" [سلیمان صفحہ ۱۱۸]

عربوں کو ہندوستانیوں کی اس عادت پر تعجب ہوا ہے۔

لمبی داڑھی کا رواج

اسی سلسلہ میں اس نے ایک عجیب بات یہ بیان کی ہے۔ بجنسہ سلیمان کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔ یعنی لکھتا ہے کہ:

"اهل الهند يطولون لحاهم"

ترجمہ: ہندوستان والے لمبی لمبی داڑھیاں رکھتے ہیں۔

اور صرف اسی قدر نہیں، آگے لکھتا ہے اور اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے کہ:

"وربما رأيت لحية احدهم ثلثة اذرع" [سلیمان صفحہ ۵۵]

ترجمہ: بعض اوقات میں نے تین تین ہاتھ لمبی داڑھی والوں کو بھی دیکھا ہے۔

اسی کے ساتھ گو اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ:

"ہندوستان کے باشندوں کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جب انکا کوئی آدمی مرجاتا ہے اس وقت وہ اپنے سر اور داڑھی کے بال منڈوا دیتے ہیں۔"

[سلیمان صفحہ ۵۵]

ظاہر ہے کہ یہ رسم ہندوستان میں اب بھی جاری ہے۔ لیکن علاوہ اس رسم کے عام طور پر ہندوستانیوں کا داڑھی رکھنا اور اتنی لمبی داڑھیاں کہ تین تین ہاتھ تک دراز ہو جائیں بالکل عجیب ہے۔ آج تو شمالی ہند ہو یا جنوبی، کسی علاقے میں داڑھیوں کے رکھنے کا دستور نہیں ہے۔ سکھوں میں اس کا رواج اگر ہوا بھی ہے تو یہ بالکل پچھلے زمانہ کی بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مذہبی لوگ ہندوؤں میں اب بھی داڑھی رکھتے ہیں۔ لیکن سلیمان تو اس کو اس ملک کا عام رواج قرار دیتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستانی چہروں سے داڑھی کا غائب ہونا اس ملک کا نیا حادثہ اسی قسم کا ہو جیسے آج مسلمانوں کے لیے بھی یہ ایک نئی افتاد ہے۔

یا ممکن ہے کہ "المسعودی" وغیرہ نے اپنی کتابوں میں جیسے ہندی معاشرت کی ایک خاص خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، اب شاید اس مسئلہ کو اتنی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔

ڈکار کو معیوب سمجھنا

ان لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں میں ڈکار یا کھانسی کو باد مخالف کے اظہار سے زیادہ برا قرار دیا جاتا ہے۔ المسعودی نے بڑی تفصیل سے اس ہندی رواج پر بحث کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ:

> "ہندی حکما کا خیال ہے کہ بادِ شکم کو پیٹ میں روکے رکھنا سخت موذی حرکت ہے۔ اور اس کا ارسال و اطلاق راحت بخش ہے۔ یہ امراض کا بہت بڑا علاج ہے۔ قولنج والوں کو اس سے بڑی راحت میسر آتی ہے۔ اسی طرح مطحول یعنی جس کی تلی بڑھ گئی ہو اس کے لیے اس کا روکنا سخت مضر ہے۔"

الغرض اسی قسم کی باتوں کے بعد لکھا ہے کہ:

> "یہی وجہ ہے کہ ہندوستان والے ضرطہ (با آواز اخراج) میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے اور "الفسوہ" (یعنی مخفی آواز) کو بھی کبھی نہیں روکتے۔ ان کے نزدیک کھانسی کی آواز ضراط سے زیادہ اور ڈکار فساء سے زیادہ معیوب ہے۔ ان کا یہ خیال بھی ہے کہ ضراط کی آواز بدبو کے ازالہ کا ذریعہ ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہوا تو پیٹ میں ایک ہی ہوتی ہے۔ البتہ اس کے نام مخارج کے اختلاف کی وجہ سے بدل گئے ہیں۔ صعودی حرکت جب ہوتی ہے تو اس کا نام لوگوں نے ڈکار رکھ دیا ہے اور ہبوطی کا نام فساء ہے۔ ورنہ دونوں ہواؤں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ [مروج الذہب مسعودی، صفحہ ۲۵۳]

آخر میں المسعودی نے اس ہندی رواج کو بہت سراہا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے فوائد

اوراس کی خلاف ورزی کے نقصانات کو ہر صاحب تمیز خود سمجھ سکتا ہے۔اس کی رائے ہے کہ ارباب مذاہب وادیان نے شاید اس کی برائی بیان کی اور اسی لیے لوگ اس کو کچھ معیوب خیال کرنے لگے۔اس نے ہندی حکمت کے حوالہ سے بعض عربی اشعار بھی اس سلسلے میں نقل کیے ہیں۔

المسعودی نے اس سلسلہ میں اور بھی تفصیلات سے کام لیا ہے۔خصوصیت کے ساتھ راجگان ہند کی عام عادت یہ بتاتا ہے کہ:

"لایحتشمون فی اظهارها فی سائر احوالهم وكذلك سائر حكمائهم" [ایضاً صفحہ ۲۵۲]

ترجمہ:باد مخالف کے اظہار میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے۔خواہ کسی حال میں صادر ہو۔یعنی خلوت ہو یا جلوت۔تنہائی میں ہوں یا بھری مجلسوں میں۔اس ملک کے راجہ اور یہاں کے حکماء یعنی پنڈتوں میں یہ عادت عام ہے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی درباروں یا علمی مجلسوں کے لیے بھی یہ کوئی معیوب بات ان سیاحوں کے زمانہ میں نہ تھی۔لیکن ظاہر ہے کہ اب یہ کیفیت باقی نہیں رہی ہے۔ممکن ہے کہ کچھ یہی حال داڑھی کا بھی ہوا ہو۔

شراب سے پرہیز

سلیمان نے ہندوستان والوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''چین کے باشندوں کو کھیل تماشوں کا خاص ذوق ہے لیکن ہندوستان والے ان باتوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔نیز ہندوالے شراب بھی نہیں پیتے، بلکہ اس وجہ سے سرکہ چونکہ شراب ہی سے بنتا ہے اس لیے سرکہ بھی استعمال نہیں کرتے۔''

اس نے اس کے بعد یہ عجیب تحقیقی بات لکھی ہے کہ:

''شراب نوشی سے پرہیز ہندوستان والے اس لیے نہیں کرتے کہ یہ کوئی ان

کے مذہب کی بات ہے بلکہ اس سے ان کے دلوں میں نفرت اور ایک قسم کی گھن پیدا ہوگئی ہے۔''

اور یہ اس نے بالکل صحیح بات لکھی ہے، کیونکہ وید تک میں بکثرت تذکرہ کیا گیا ہے کہ سوما کا رس اس ملک کے عوام ہی نہیں بلکہ یہاں کے رشیوں، منیوں، حتیٰ کہ دیوتاؤں تک کا ایک محبوب مشروبہ تھا۔ اور سوما کے متعلق لکھا ہے کہ شدید قسم کی نشہ آور کوئی بوٹی تھی، جس سے رس بڑے اہتمام سے نکالا جاتا تھا۔ وید کے اشلوکوں کا ایک بڑا حصہ سوما کی تعریف ہی کے لیے مختص ہے۔

پھر اس کی ایک لطیف توجیہ اس نے خود کی ہے جس کا حاصل وہی ہے کہ ہندوستان چونکہ بیسیوں حکومتوں کی شکل میں بٹا ہوا ہے، ہر راجہ دوسرے راجہ کی طرف سے ہمیشہ خطروں میں گھرا رہتا ہے۔ ہر وقت اپنے گرد و پیش کے راجواڑوں سے انہیں جنگ کرنی پڑتی ہے، اس لیے ان کا خیال ہے کہ:

''شراب پینے والے حکمران اپنی حکومت کی حفاظت نہیں کر سکتے اور نہ سلطنت کے انتظامات کو درست رکھ سکتے ہیں۔''

اس نے لکھا ہے کہ:

''اسی لیے ہندوستان میں مشہور ہے کہ شراب پینے والا راجہ، راجہ ہی نہیں ہے۔'' [سلیمان، صفحہ ۵۲]

لیکن ابن حوقل ساحلی علاقوں کی نسبت بیان کرتا ہے کہ:

''ان شہروں میں ناریل کے درخت بھی ہیں، اسی ناریل سے سرکہ اور شراب بناتے ہیں۔ جس سے نشہ بھی پیدا ہوتا ہے اور المزر بھی یہ لوگ استعمال کرتے ہیں جو مصر والوں کا نبیذ ہے۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۲۳۱]

المزر یہ شراب کی ایک قسم تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ شہد کو پانی میں ملا کر بناتے تھے اور

بعضوں نے لکھا ہے کہ جوار سے یہ شراب بنتی ہے۔

چوری کی سزا

سلیمان نے لکھا ہے کہ:

''ہندوستان میں راہزنوں کو قتل کر دیا جاتا ہے''۔

اسی طرح چور خواہ ایک ہی پیسہ کا چور کیوں نہ ہو اس کو سخت سزا دی جاتی ہے۔ جس کی انتہاء موت پر ہوتی ہے۔ چوروں کی سزا کا طریقہ یہ لکھا ہے کہ:

''ایک بڑی لمبی لکڑی ہوتی ہے، جس کے دونوں کناروں کو تیز کر کے اس میں دھار پیدا کر دیتے ہیں اور چور کو اسی پر بٹھا دیا جاتا ہے اور اس طور پر بٹھایا جاتا ہے کہ لکڑی اس کے جسم میں گھس جاتی ہے اور حلق تک پہنچ جاتی ہے۔''

[سلیمان صفحہ ۵۴]

مہابھارت کے بعض اشلوکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چوری کی سزا قطع ید (یعنی ہاتھ کاٹنا) بھی ملک میں مروج تھی۔

شادی کا طریقہ اور تعدد ازدواج کی اجازت

اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ:

''ہندوستان اور چین میں حرم کا دستور نہیں ہے لیکن نکاح ان دونوں ملکوں میں مرد جتنی عورتوں سے بھی چاہے کر سکتا ہے۔ شادی کا طریقہ یہ ہے کہ لڑکی اور لڑکے والے بیان سے پہلے آپس میں تحفوں اور ہدیوں کا تبادلہ کرتے ہیں اور شادی کو ڈھول اور سنکھ کی آوازوں سے بستی میں مشہور کرتے ہیں۔ یہ تحفے اور ہدیے ہر شخص اپنی اپنی بضاعت کے مطابق دیتا ہے۔''

بدکاری کی سزا

اسی کے بعد اس کا بیان ہے کہ:

''کسی کی بیوی کے پاس اگر کوئی آئے اور اس کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب کرے تو قاعدہ ہے کہ اس قسم کے زانی آدمی کو ہندوستان کی تمام حکومتوں میں قتل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح جبراً کسی عورت سے اگر کوئی بدکاری کرتا ہے تو صرف مرد قتل کیا جاتا ہے اور عورت کی رضامندی سے اگر فعل کا وقوع ہوا ہو تو دونوں مار ڈالے جاتے ہیں۔''

عدالتی نظام

سلیمان نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''ہندوستان میں بھی اور چین میں بھی فصل خصومات کے لیے قاضیوں (ججوں) کی الگ جماعت ہے۔ حکومت کے دوسرے عمال اور ملازمین سے اس کام کا تعلق نہیں ہے۔'' [سلیمان، صفحہ ۵۵]

رفاہِ عام کے کاموں کا رواج

اسی نے یہ بیان کرنے کے بعد کہ:

''ہند کے باشندوں میں ایسی بہت سی دینی نیکیوں کا رواج ہے جن کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ خدا ان کے کرنے والوں سے خوش ہوتا ہے اور اپنا قرب و نزدیکی عطا کرتا ہے۔''

لکھا ہے کہ:

''مثلاً ان میں اس کا رواج ہے کہ مسافروں کے لیے سرائیں بنواتے ہیں۔ ان سراؤں میں بقال اور بنئے رہتے ہیں۔ جن سے راہ گیر ضرورت کی چیزیں

خریدتے ہیں۔" [سلیمان، صفحہ ۱۲۸]

سیلون کی ایک عجیب رسم

اسی سلسلہ میں اس نے سیلون جسے عرب کے سیاح ہندی جزیرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اپنی کتابوں میں بکثرت اس کا تذکرہ سیلان یا سرندیپ کے نام سے انھوں نے کیا ہے، اسی جزیرہ کے متعلق اس عجیب وغریب رواج کا تذکرہ کیا ہے:

''سرندیپ کے علاقے کا یہ دستور ہے کہ اس ملک کا راجہ جب مرتا ہے تو ایک گاڑی جو زمین سے قریب قریب ملی رہتی ہے (یعنی پہیے اس کے چھوٹے ہوتے ہیں) اسی گاڑی پر راجہ کو لٹا دیتے ہیں اور اس کے سر کو گاڑی کے تختے کے کنارے اس طرح رکھتے ہیں کہ اس کے بال زمین پر لٹکتے رہیں۔ اسی طرح گاڑی کو کھینچتے ہوئے اس کا گشت کراتے ہیں۔ راجہ کے سر کے بال کو گاڑی کے ساتھ زمین پر گھسیٹتے ہوئے لے جاتے ہیں۔ ایک عورت ہاتھ میں جھاڑو لیے گاڑی کے پیچھے پیچھے رہتی ہے اور خاک دھول کو راجہ کے سر کے بالوں سے صاف کرتی جاتی ہے۔''

اصل چیز اس کے بعد جو اس نے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ:

''اسی گاڑی کے ساتھ ساتھ ایک اور آدمی ہوتا ہے جو مسلسل پکارتا جاتا ہے کہ لوگو! دیکھو! یہ ہے وہ شخص جو کل تک تمہارا راجہ اور حکمران تھا، تم میں کل تک تھا، اس کے احکام اور فرامین نافذ ہو رہے تھے، لیکن آج اسی کو دیکھو، اس کا انجام کیا ہوا! اس نے دنیا چھوڑ دی۔ موت کا فرشتہ اس کی جان نکال کر لے گیا! تو تم کو بھی چاہئے کہ دنیا کی زندگی کے فریب میں نہ آ جائیو!'' اور بھی اسی قسم کی باتیں کہتا جاتا ہے۔ یہ قصہ تین دن تک جاری رہتا ہے۔ تیسرے دن پھر صندل، کافور، زعفران مہیا جاتے ہیں اور ان ہی چیزوں کے ساتھ راجہ کو

آ گ میں پھونک دیتے ہیں اور اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیتے ہیں۔''

[سلیمان، صفحہ ۵۰]

ہندوستانیوں اور چینیوں کا تقابل

علاوہ ان رسوم اور عادات کے سلیمان نے ہند والوں کے علم وفضل، صنعت وحرفت میں جس قسم کی مہارت اور چابک دستیوں کے وہ مالک تھے، ان باتوں کی دل کھول کر اس نے بڑی تعریفیں کی ہیں۔ بلکہ بعض امور میں ہندوستانیوں کو چینیوں پر فضیلت بھی دی ہے۔ خصوصاً مذہب اور دین کے معاملہ میں لکھا ہے کہ:

''اس کا علم چین والوں کے پاس نہیں ہے۔ ان کا دین ہندوستان والوں ہی سے حاصل کیا ہوا ہے۔''

اس نے لکھا ہے کہ:

''چین خود کہتے ہیں کہ ہمارے ''البددہ'' کو ہندوستانیوں نے بنایا ہے۔''

یہ ظاہر البددہ کا لفظ بدھ کے لفظ کی جمع معلوم ہوتی ہے۔ خدا جانے اس سے وہ مورتیاں مراد ہیں جو ہندوستان سے چین میں منتقل ہوئیں یا البددہ بدھ مذہب کی کتابوں کو بھی کہتے ہیں۔

پھر دونوں ملکوں کے مشترک مذہبی عقائد کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ:

''ہندوستان میں طب کے ماہرین اور فلاسفہ بھی پائے جاتے ہیں''

اور یہ کہتے ہوئے کہ طب اور نجوم کا چرچا گویا چین میں بھی ہے، لیکن:

"ذاك بالهند أكثر"

ترجمہ: ان دونوں علوم (طب ونجوم) کا ہندوستان میں زیادہ رواج ہے۔

المسعودی نے بھی لکھا ہے کہ:

"للهند التقدم فی صناعة الطب ولهم اللطافة والحذق"

ترجمہ: علم طب میں ہندوستان کے باشندے بہت آگے ہیں اس فن میں وقت نظری اور حذاقت ان کو حاصل ہے۔ [جلد اول، صفحہ ۲۵۲]

ہندوستان کی پارچہ بافی

صنعتی مہارتوں کا ذکر کرتے ہوئے جو باتیں ان لوگوں نے بیان کی ہیں، سننے والوں کو آج بھی سن کر ان پر تعجب ہوتا ہے۔ مثلاً رہمی کے نام سے جس علاقے کو ان لوگوں نے موسوم کیا ہے، پارچہ بافی میں اس ملک کے کاریگروں کو جو مہارت حاصل تھی اس کے متعلق سلیمان لکھتا ہے:

''رہمی کا ملک کپڑوں کا ملک ہے، ایسے کپڑے اس ملک میں تیار ہوتے ہیں جن کی مثال کہیں نہیں پائی جاتی۔''

اور اس کے متعلق اپنی چشم دید شہادت اس نے ادا کی ہے یعنی لکھا ہے کہ:

''حسن و باریکی میں ان کپڑوں کی حالت یہ ہے کہ ایک انگوٹھی میں پورا تھان سما سکتا ہے۔ یہ سوتی کپڑا ہے میں نے خود اس کو دیکھا ہے۔'' [سلیمان صفحہ ۳۰]

ودیالوں کا رواج

سلیمان نے ہندوستان کے ودیالوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ سرندیپ کے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ:

''اس ملک کے باشندوں کے پاس بھی ایک خاص شریعت ہے اور ان میں اس شریعت کے علماء پائے جاتے ہیں۔ ان کے بھی حلقے ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں محدثین کے حلقے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ ان علماء کے اردگرد اکٹھے ہوتے ہیں اور اپنے پیغمبروں کی سیرت اور اپنے دین کے مسائل ان سے سن سن کر لکھتے ہیں۔'' [سلیمان صفحہ ۱۲۲]

میں کہاں تک بیان کروں، حاصل یہ ہے کہ بغیر کسی جنبہ داری، اور ادنیٰ درجہ کی عصبیت کے کسی دوسرے مذہب اور ملک کے متعلق کوئی جو کچھ بھی بیان کر سکتا ہے مسلمانوں کے

ان پرانے مورخین اور سیاحوں نے اس کے بیان کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ محض اس لیے کہ اس ملک یا قوم کا مذہب چونکہ ہمارے مذہب اور اس کے اصول سے مختلف ہے یا میرے ملک اور میری قوم سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ محض اس لیے ان کی خوبیوں کے اعتراف کرنے میں انہوں نے قطعاً بخل یا تنگدلی سے کام نہیں لیا ہے۔ قدیم تو قدیم اس زمانہ میں بھی جب بلند نظریوں اور انصاف پسندیوں کے دعووں سے یورپ نے آسمانوں کو سر پر اٹھالیا ہے، اتنی بے لوثی کی نظیر کسی مصنف کے کلام میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ آپ اسے چاہے وسعت مشربی کہیے یا دوسری قوموں کے ساتھ انصاف کا جذبہ کہ المسعودی نے ہندوستان کے سمنیہ فرقہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی اصنام پرستی کے متعلق اپنی رواداری رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

اہل ہند کی اصنام پرستی

''جیسے اسلام سے پہلے قریش بت پرستی کرتے تھے، بت پرستی میں یہی حال ان کا بھی ہے۔ ان مورتیوں کو یہ پوجتے ہیں اور دعاؤں کے ساتھ ان ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔''

لیکن اس کے بعد اپنی رائے ان الفاظ میں قلمبند کرتا ہے:

"واللبيب منهم يقصد بصلاته بالخالق ومقيم التماثيل من الاصنام والصور مقام قبلة والجاهل منهم ومن لاعلم له يشرك الاصنام بالهية الخالق و يعتقدهما جميعا وان عبادتهم الاصنام تقربهم الى الله زلفى" [المسعودی، صفحہ ۱۹۱]

ترجمہ: لیکن جو لوگ عقل و خرد والے ہیں، ان کے سامنے اپنی دعاؤں میں خدا ہی مقصود ہوتا ہے اور مورتیوں کو وہ اپنے سامنے بطور قبلہ (یعنی رخ کرنے کی سمت) کی حیثیت سے رکھتے ہیں لیکن جنہیں علم نہیں ہے اور جو جاہل ہیں وہ خدا کی الوہیت میں ان مورتیوں کو بھی شریک کرتے ہیں اور جو دونوں باتوں کے معتقد ہیں ان کا خیال ہے کہ ان مورتیوں کی عبادت ان کو خدا

سے نزدیکی عطا کرتی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بت پرستی کی یہ آخری تاویل وتوجیہ ہوسکتی ہے۔ جس سے مسلمان آج سے سینکڑوں بلکہ ہزار سال پہلے واقف تھے۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہی "توجیه القول بما لا یرضی به قائله" یعنی قائل کی مرضی کے خلاف خواہ مخواہ اس کی طرف سے بات بنانا ہے۔

بت پرست دنیا میں خصوصاً ہندوستان میں کروڑوں کی تعداد میں اب بھی موجود ہیں۔ خود ان سے پوچھا جاسکتا ہے کہ اپنے معبودوں کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ آفتاب و ماہتاب گائے وغیرہ کے پوجنے والوں کو تو جانے دیجئے کہ ان کو تو خود ان کے پوجنے والے خدا کی مخلوق مانتے ہیں۔ کسی کا عقیدہ نہیں ہے کہ دنیا کو گائے نے یا سورج نے یا چاند نے پیدا کیا ہے بلکہ ان ہی کو مخلوقات الٰہی میں شمار کرتے ہیں۔ رہیں مورتیاں سو وہ ایک قسم کی تو ہیں نہیں انسانوں کی بھی ہوتی ہیں اور حیوانوں کی بھی نمائندگی ان ہی مرے ہوئے انسانوں یا جانوروں کی کرتی ہیں جو ان کے اصل معبود ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان معبودوں کو جن کی مورتیاں نمائندگی کرتی ہیں ان کو بھی خود ان کے پوجنے والے خدا کی مخلوق ہی خیال کرتے ہیں۔

بہرحال ان مورتیوں میں ایسی کوئی مورتی نہیں ہے جس کے متعلق سمجھا جاتا ہو کہ وہ کسی مخلوق کی نہیں بلکہ خالق سماوات وارض کی نمائندہ ہے اور بالفرض مان بھی لیا جائے کہ ان مورتیوں کو خالق ہی کی نمائندہ بنا کر جہلاء نہیں تو ان کے خواص پوجتے ہیں، جیسا کہ المسعودی کا بیان ہے تو سوال یہ ہے کہ ان مورتیوں کی شکل جیسا کہ میں نے عرض کیا آدمی کی ہوتی ہے یا جانور کی۔ آدمی میں بھی مرد کی یا عورت کی۔ پھر کیا ان لوگوں کے خیال میں خدا مردوں یا عورتوں کی یا معاذ اللہ جانوروں کی شکل رکھتا ہے؟ اور خدا جو خود ہندوؤں کے نزدیک بھی نرنکار "لیس کمثله شیءٌ" ہے۔ جب اس کی کوئی صورت نہیں ہے تو صورت والی مورتی سے خدا کی طرف ذہن کو منتقل کرنے کے کیا معنی؟ کیا بلی کی تصویر سے طوطے کا تصور جمایا جاسکتا ہے؟

صاحب صورت اور صورت میں کسی قسم کا تعلق بھی تو ہونا چاہئے۔ رہا مخلوق ہونے کا

تعلق تو اس میں ان مورتیوں اور بتوں کی کیا خصوصیت ہے۔ اس لحاظ سے سارا آسمان و زمین عالم کا ذرہ ذرہ خدا کی طرف ذہن کو منتقل کرانے کے لیے کافی ہے یہی وجہ ہے کہ اس توجیہ کو صرف بے تعصبی کی دلیل تو میں قرار دیتا ہوں، لیکن صحیح توجیہ بت پرستی کی میرے نزدیک یہ نہیں ہے۔ خالق ہی کو پوجنا ہے تو اس کے لیے جھگڑوں کی کیا ضرورت ہے۔ خصوصاً جب مسعودی بھی کہتے ہیں کہ عوام ان ہی کی وجہ سے واقعی شرک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

نیز اس نے اسی جگہ لکھا ہے کہ:

"هو رای الهند العالم والجاهل"

ترجمہ: یعنی ہندوستان کے عالم اور جاہل سب کا یہی خیال ہے۔

کچھ بھی ہو میرا خیال تو یہ ہے کہ ہمارے اسلام کا غیر قوموں کے ساتھ اسی قسم کے فیاضانہ برتاؤ اور سلوک کا نتیجہ یہ تھا کہ قومیں ان سے مانوس ہوتی تھیں۔ بجائے بھڑکنے کے ان سے قریب ہوتی تھیں۔ ان کے باتوں کو وہ سنتی تھیں۔ سچائیوں کو دلوں میں اتارنے کا یہی ایک کارگر حربہ ان کے پاس تھا۔ یہی لوگ تھے۔ جن کی بدولت آج جاوہ، سماٹرا، انڈونیشیا اور چین وغیرہ ممالک میں بے تیغ و تفنگ کروڑوں کی تعداد میں مسلمانوں کی آبادیاں پائی جاتی ہیں۔ برا بھلا کہہ کر، گالی گلوچ سے کبھی دنیا صداقت کی دعوت و تبلیغ میں کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ میں تو ان کتابوں میں محض واقعات کو پڑھ کر حیران ہو گیا۔ ہمیشہ سے یہ سنتا ہوں کہ ہندوستان کے باشندوں کا خیال ہے کہ دریائے شور کو عبور کر کے دوسرے ملکوں میں جانا مذہباً ان کے یہاں ممنوع ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ انگریزی عہد کے عام الحاد اور بے دینی نے ہندوؤں کو اس مذہبی پابندی سے آزاد کیا ہے۔

علیحدہ علیحدہ کھانے کی رسم

لیکن یہی سلیمان تاجر جس کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ تیسری صدی کی ابتداء کا آدمی ہے۔ اپنی کتاب میں ہندوؤں کی اس رسم کا ذکر کرتے ہوئے یعنی ایک برتن میں مل کر کھانے کا

رواج ان میں نہیں ہے لکھتا ہے کہ:

''قاعدہ یہ ہے کہ ایک برتن میں دو آدمی بھی مل کر ان میں نہیں کھاتے اور نہ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر دو آدمی کھا سکتے ہیں۔ اس کو سخت عیب خیال کرتے ہیں۔''

اس نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے راجوں مہراجوں اور بڑے لوگوں کا قاعدہ ہے کہ ناریل کے پتوں سے روزانہ ان کے لیے ایک ایسی چیز بنائی جاتی ہے جو رکابی کے مانند ہوتی ہے۔ اسی ناریل کے پتوں سے بنے ہوئے دونے برتن میں وہ کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد فوراً اس کو پھینک دیا جاتا ہے۔ جس میں بچا کھچا کھانا بھی رہتا ہے اور دوسرے دن پھر نیا دونا ان ہی پتوں کا بنایا جاتا ہے۔

ہندوؤں کے سمندری سفر نہ کرنے کے عام خیال کی تردید

یہ بیان کرنے کے بعد اس نے جو واقعہ بیان کیا ہے، اس سے اس خیال کی قطعاً تردید ہوتی ہے کہ سمندر پار کے سفر کو ہندوؤں نے صرف انگریزوں کے زمانہ میں دینی کمزوری میں مبتلا ہونے کے بعد اختیار کیا ہے۔ سلیمان نے جو کچھ لکھا ہے لفظی ترجمہ اس کا درج کر دیتا ہے۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ ایک دو نہیں، دوسری اور تیسری صدی ہجری میں سینکڑوں کی تعداد میں ہندو سمندر کو عبور کر کے اسلامی ممالک میں ان لوگوں کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ جن سے ان کے تجارتی کاروبار تھے۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق برتاؤ نے ہندوؤں کو اپنا اتنا گرویدہ بنا لیا تھا کہ ان کے گھر کو وہ اپنا گھر خیال کرنے لگے تھے۔ میں جس زمانہ کا قصہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں، کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان کا یہ وہ زمانہ ہے کہ اس ملک سے مسلمان صحیح طور پر عموماً واقف بھی نہیں تھے۔ اپنے ملک کا راج خود ہندوؤں کے اقتدار میں تھا۔ سلیمان کا بیان ہے کہ:

''ہندوستان کے باشندے جب سیراف آتے ہیں (یعنی ایرانی بندرگاہ جہاں

سمندر ہی کے سفر کے بعد آدمی پہنچ سکتا ہے)۔ اور سیراف کے ممتاز تاجروں میں سے کوئی تاجر ان کی دعوت کرتا ہے۔ عموماً یہ سو یا سو سے زیادہ یا کچھ کم ہوتے ہیں تو ضرورت ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس الگ الگ طبق رکھا جائے۔ جس میں وہ سب کچھ رکھ دیا جاتا ہے جسے وہ کھاتے ہیں۔ اس میں کوئی دوسرا قطعاً شریک نہیں ہوسکتا۔ [سلیمان صفحہ ۱۴۶]

میری نظر سے جب یہ عبارت گذری تو جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدیم خوشگوار تعلقات کے ثبوت کی ایک جدید شہادت کا انکشاف مجھ پر ہوا اور محسوس ہوا کہ اخلاقی قوت سے چاہا جائے تو جو چیز حکومت کی تلوار سے بھی بآسانی حاصل نہیں ہوسکتی۔ بسہولت ہم اس کو اپنے قابو میں لاسکتے ہیں۔ خیال تو کیجئے۔ آج سے ہزار سال پیچھے کے ہندوستان کو اس کے مذہبی تقشف اور تصلب کو اور پھر سوچئے کہ اکے دکے نہیں سو سو بلکہ سو آدمیوں سے بھی اوپر اسی ہندوستان کے رہنے والے جو سمندر پار کے سفر کو جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ مذہباً ناجائز سمجھتے تھے، وہ فراخدلی کے ساتھ مسلمانوں کے ایسے ممالک میں جہاں مسلمان ہی مسلمان آباد ہیں۔ سمندر کو عبور کر کے آرہے ہیں جارہے ہیں اور صرف آ جا نہیں رہے ہیں بلکہ مسلمانوں کی دعوتیں قبول کرتے ہیں۔ ان کے مہمان بنتے ہیں۔ اگرچہ اسی کے ساتھ اپنی قومی خصوصیتوں کو بھی باقی رکھتے ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ جب علیحدہ علیحدہ کھان پان کے ہندی طریقہ کو سلیمان نے بیان کیا تھا تو اسی کے ساتھ اسی کھان پان کے متعلق ہندوؤں کے اس مشہور طریقہ عمل کا اس نے کیوں ذکر نہ کیا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمان تو مسلمان خود ان لوگوں کے ہاتھوں کی پکی ہوئی چیزوں کے کھانے سے بھی جیسا کہ سب جانتے ہیں ہندو پرہیز کرتے ہیں جو باوجود ہندو ہونے کے خاص خاص طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ برہمن ہوں یا چھتری یا ویش، ہر ہندو کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیز نہیں کھاسکتے بلکہ خاص خاص ذات کے افراد کو اس کا استحقاق دیا گیا ہے جو ان

کے لیے رسوئی تیار کر سکتے ہیں۔

چھوت چھات کی تردید

خلاصہ یہ ہے کہ ''چھوت چھات'' اور وہ بھی ''کھان پان'' آج ہندو قوم کے مذہب کا جو مرکزی مسئلہ ہے، کہنے والوں نے تو اسی وجہ سے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ آج سارا ہندو مذہب صرف باورچی خانوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمیشہ ہندوستانی اسٹیشنوں کی ان عجیب وغریب آوازوں کو دنیا کی قوموں میں تعجب کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے کہ پکارنے والے ان اسٹیشنوں میں ہندو پانی، مسلمان پانی، ہندو بسکٹ، مسلمان بسکٹ، ہندو پان، مسلمان پان وغیرہ پکارتے رہتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہندوستان سے قافلوں کی شکل میں جو لوگ اسلامی ممالک میں جاتے تھے اور مسلمانوں کی دعوتوں کو قبول کرتے تھے۔ اگر کھانے پینے کے ان قوانین کی پابندی اس زمانہ میں بھی کرتے تھے تو الگ الگ کھانے کے اس دستور کو جہاں بیان کیا گیا تھا، اسی کے ساتھ ہندوؤں کے کھانے پینے کے ایسے اہم دستور کے ذکر کو ترک کیوں کر دیا؟

مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس زمانہ میں ''چھوت چھات'' یا قرانی اصطلاح میں چاہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ ''لامساسیت'' کے اس خاص ہندی دستور کی پابندی کا رواج شاید اس زمانہ میں تھا ہی نہیں یا تھا بھی تو اس قانون کی پابندی میں اتنی نزاکتیں نہیں برتی جاتی تھیں جس کا معائنہ پچھلے دنوں میں ہم کر رہے ہیں۔ ورنہ اس کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہندوؤں کے روزانہ غسل، روزانہ دتاؤن (مسواک) کھانے پینے میں علیحدگی پسندی وغیرہ وغیرہ جزئیات کا تو ذکر کیا جاوے اور ہندوستان والوں کی اتنی بڑی اہم خصوصیت کو غیر اہم قرار دے کر خاموشی اختیار کی جاوے۔

اب میں کیا کہوں، میں نے اس سلسلہ میں ممکنہ حد تک اس قسم کی تمام کتابوں کا مطالعہ کیا اور بہت تلاش کیا۔ لیکن ان مصنفین میں سے ایک آدمی بھی ہندوستان کے چھوت چھات کے مسئلہ کا ذکر نہیں کرتا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اصل واقعہ کیا ہے۔

جمادات، نباتات، حیوانات تک میں سے کسی چیز کے چھونے سے ان کو پرہیز نہیں ہے اور کسی قسم کی ناپاکی کا احساس ان میں پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اچانک ان ہی لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ خود اپنے ابنائے جنس کو دیکھ کر چیخنے لگتے ہیں کہ مجھے نہ چھونا، میری چیزوں کو ہاتھ نہ لگانا۔ بعضوں کا یہ خیال کہ یہ تعلق ان کا صرف ان قوموں کی حد تک محدود ہے جو ہندو نہیں ہیں اس لیے صحیح نہیں ہے کہ ''چھوت چھات'' کے یہ جھگڑے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا خود ہندو قوم کے مختلف طبقات کے درمیان بھی پائے جاتے ہیں۔ یعنی جو اپنے آپ کو ہندو کہتے ہیں۔ محض ہندو کہہ دینے سے ''چھوت چھات'' کے قوانین کی پابندیوں سے وہ مستثنیٰ قرار نہیں دیے جاسکتے، بلکہ ان میں بھی خاص خاص طبقات کے لیے خاص ذاتوں کے افراد ہیں۔ جنہیں چھونے کی اجازت دی جاتی ہے، ورنہ کتنے ہندو ہیں جن کے چھونے اور ہاتھ لگانے سے برہمنوں یا چھتریوں کے برتن، اور ان کے کھانے ناپاک ہو جاتے ہیں۔

بہرحال عرض کرنے کی بات یہ ہے کہ جہاں ان مصنفین کی کتابوں میں ''چھوت چھات'' کے خاص ہندی خصیصہ کا ذکر نہیں پایا جاتا وہیں یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کی گاؤ پرستی کی رسم کو بھی ان لوگوں میں سے کسی نے بیان نہیں کیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ گائے نہیں بلکہ گائے اور بھینس کے گوبر کے ساتھ ہندوستان کے عام باشندوں کو جو دلچسپی ہے اس تک کو ان لوگوں نے بیان کیا ہے۔ بزرگ بن شہریار اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

> ''ہندوستان کے سیٹھ اور ساہوکار یا ان کے فوجی آدمی یا اسی قسم کے کسی بڑے امیر گھرانے ہی کی عورتیں کیوں نہ ہوں جب راستے سے گذرتی ہیں اور ان کی نظر گائے یا بھینس کے گوبر پر پڑ جاتی ہے، اس صورت میں اگر ان کے ساتھ اس گوبر کا اٹھانے والا کوئی آدمی ہوتا ہے تو اس کو حکم دیا جاتا ہے کہ اسے اٹھالے، ورنہ وہی خاتون اس گوبر پر خاص قسم کا نشان بنا دیتی ہے تاکہ راہ گیروں کو معلوم ہو جائے کہ گوبر کا یہ چوتا کسی شخص کی ملک میں داخل ہو چکا

ہے۔ پھر اٹھانے والے کو بھیج کر گوبر منگوالیا جاتا ہے۔"

[بزرگ بن شہریار، صفحہ نمبر ۱۶۲]

آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس قسم کی معمولی معمولی جزئی باتوں تک کا ذکر کیا ہے۔ اگوان کے زمانے میں بھی ہندوستان میں "چھوت چھات" کا رواج ہوتا تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا ذکر ترک کر دیتے؟

قدیم ہند میں گوشت خوری کا رواج

سلیمان لکھتا ہے کہ:

"ہندوستان اور چین ان دونوں ممالک کے باشندوں کا عام دستور یہ ہے کہ جب کسی جانور کے گوشت کھانے کا ارادہ کرتے ہیں تو اسے ذبح نہیں کرتے، بلکہ اسکی کھوپڑی پر ضرب لگاتے ہیں تا آنکہ جانور مر جاتا ہے۔ [سلیمان، صفحہ ۵۶]

انسانی خوراک کا وہ عنصر جس کا نام لحم ہے تیار ہی نہیں ہوسکتا جب تک اس میں نباتاتی زندگی سے آگے بڑھ کر حیوانی زندگی کے آثار نہ پیدا ہولیں۔ اس لیے اس خوراک کے حصول میں حیوانی زندگی کا ازالہ ضرور ہے۔ جیسے نباتاتی خوراک کے حصول میں نباتاتی زندگی کا ازالہ ناگزیر ہے۔ مگر حیوانی زندگی کے ازالہ کی جو شکل دنیا کی قوموں میں پائی گئی ہے یا پائی جاتی ہے، اسلامی ذبح اس کے مقابلہ میں غذائی حیوانوں کے لیے رحمت معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کا حال تو یہ تھا جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ تاتاریوں کا طریقہ یہ تھا کہ جانور کے ہاتھ پاؤں کو باندھ دیتے تھے۔ پھر دل کے پاس اسی جانور کے سوراخ کر کے اسی سوراخ میں ہاتھ ڈال دیتے اور آہستہ آہستہ اس جانور کے دل کو چٹکیوں سے مسلتے رہتے، تا آنکہ اس کی جان نکل جاتی یا کھینچ کر دل کو باہر نکال لیتے تھے۔ [دیکھو صبح الاعشیٰ قلقشندی، صفحہ ۳۱۱ ج ۴]

سلیمان کے اسی مذکورہ بالا بیان سے اولاً اسی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ گوشت خوری کے متعلق ہندوستان میں کسی قسم کا استنکاف و انکار اس زمانہ میں بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نہیں پایا

جاتا تھا۔ بلکہ اس سلسلہ میں بزرگ بن شہریار نے جانوروں کے گوشت کے استعمال کا جو طریقہ ہندوستان میں مروج تھا اس کو بیان کرتے ہوئے یعنی وہی بات کہ جانور کے سر پر ضرب لگا کر اس کو مار ڈالتے ہیں، تب اس کے گوشت کو استعمال کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ:

''صیمور اور سوبارہ (یہ ہندوستان کے ساحلی شہروں کے اس زمانہ میں نام تھے اور مشہور بندرگاہیں تھیں) کے بعض بڑے آدمیوں کو دیکھا گیا کہ ایک مرے ہوئے چوہے کے سامنے سے وہ گذر رہا تھا۔ مردہ چوہے کو دیکھ کر خود اس رئیس نے اس کو اپنے ہاتھ سے اٹھالیا اور اپنے بیٹے یا غلام کے حوالہ کر کے حکم دیا کہ اسے گھر لے جائے، پھر اس نے اس چوہے کو اپنی غذا بنائی۔''

اس کے بعد یہ بھی بیان کیا ہے کہ:

''جو چیزیں ہندوستان میں کھائی جاتی ہیں ان میں چوہوں کا شمار ان کے نزدیک بہترین غذاؤں میں ہے۔'' [عجائب الہند، صفحہ ۱۶۲]

ہندوستانی گینڈے کا تذکرہ کرتے ہوئے اور یہ لکھتے ہوئے کہ رہمی کے راجہ کے علاقہ میں ایک خاص قسم کا گینڈا ہوتا ہے۔ سلیمان تاجر اور المسعودی دونوں نے یہ بیان کرنے کے بعد کہ:

''اس کی پیشانی پر ایک سینگ ہوتا ہے۔ رہمی کے ملک کے گینڈوں کی خصوصیت یہ ہے کہ بہ نسبت دوسرے مقامات کے گینڈوں کے اس کے سینگ زیادہ چکنے چمکیلے اور صاف ہوتے ہیں۔ رنگ ان کا سفید ہوتا ہے اور بیچ میں ان کے قدرتی طور پر بعض ایسے نشانات سیاہ خطوط سے بنے ہوتے ہیں جو کبھی انسان، کبھی کسی پرند مثلاً مور (طاؤس) کبھی مچھلی، کبھی خود گینڈے یا دوسرے جانوروں کی شبیہ معلوم ہوتی ہے۔ لوگ ان سینگوں کو اکھاڑ کر کمر بندوں میں بطور زیور کے لگاتے ہیں۔ خصوصاً چین کے سلاطین اور حکام میں خاص طور پر

ان تصویری سینگوں کے استعمال کرنے کا ذوق پایا جاتا ہے۔ بڑی بڑی قیمتیں دے کر لوگ خریدتے ہیں۔ اسی لیے ان کی قیمتیں کبھی کبھی دو ہزار اشرفیوں تک بھی پہنچ جاتی ہیں۔''

المسعودی نے لکھا ہے کہ:

''یہ خصوصیت بجز رہمی کے جنگلوں کے گینڈوں کے اور کسی دوسری جگہ کے گینڈوں کے سینگ میں نہیں پائی جاتی۔'' [ج ا صفحہ ۲۵۰]

ان باتوں کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ:

''ہندوستان کے باشندے اس کا (یعنی گینڈے کا) گوشت خوب کھاتے ہیں۔''

بلکہ سلیمان تاجر نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ:

''اس کا گوشت حلال ہے کیونکہ یہ تو اسی قسم کا ایک جانور ہے جیسے گائے، بھینس، یعنی ان ہی جانوروں کی طرح وہ بھی جگالی کرتا ہے میں نے بھی اس کا گوشت کھایا ہے۔'' [سلیمان صفحہ ۳۱]

اسلامی شریعت کی رو سے گینڈے کے متعلق الدمیری نے ''حیاۃ الحیوان'' میں بھی حلال ہونے کا حکم درج کیا ہے اور وجہ بھی وہی لکھی ہے کہ یہ نباتات خور چوپایوں میں ہے اور جگالی کرتا ہے۔ الغرض نرے حلال جانوروں کی صفات اس میں پائی جاتی ہیں۔

[دیکھو حیاۃ الحیوان، صفحہ ۲۲۵ ج ۲]

المسعودی گینڈے کے بارے میں کہتا ہے کہ:

''لانه نوع من البقر والجواميس''

ترجمہ: وہ گائے اور بھینس ہی کی ایک قسم ہے۔ [صفحہ ۲۵۶ جلد ا]

غرضیکہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ''چھوت چھات'' یعنی لامذہبیت اور گائے جیسے اہم

ہندی رسوم کے متعلق ان لوگوں کی خاموشی کے اسباب کیا ہیں؟ حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی کتنی غیر اہم باتوں کے تذکرے میں انہوں نے کتنی فیاضی سے کام لیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کے ساحلی مقامات اور جنوبی ہند کی ریاستوں میں جہاں ان لوگوں کی آمدورفت زیادہ تھی وہاں ان کے زمانہ تک ہندوستان کے ان رسوم کا رواج نہ پہنچا ہو۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان رسم و رواج کے لحاظ سے بلکہ دوسرے تاریخی پہلوؤں کے اعتبار سے اتنا شدید انقلابی ملک ہے کہ کسی قسم کا قطعی فیصلہ کسی مسئلہ کے متعلق مشکل ہے۔ یعنی یہ طے کرنا کہ کونسی رسم اور کونسا رواج ہندوستان میں قدیم زمانہ سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اور کون کون سی چیزیں اس ملک میں وقتاً فوقتاً دوسرے ممالک و اقالیم سے منتقل ہو ہو کر یہاں پہنچی ہیں۔ ایک ایسا تغیر پذیر سیال ملک کہ چوتھی صدی میں آپ ان ہی سیاحوں کی زبانی سن چکے کہ سندھ اور بالائی پنجاب کا سارا علاقہ بدھ مت کے رہنے والوں سے بھرا ہوا تھا اور آج یہ حال ہے کہ بے چارے بدھوں کو ان ہی علاقوں میں انگلیوں پر بھی شمار نہیں کیا جاسکتا۔

رائے بہادر مہامہوپادھیا گوری شنکر ہیراچند اوجھا صاحب جیسے محقق جو ہندو مذہب اور اس کے رسوم و رواجات کے متعلق سند ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی کتاب ''قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب'' میں بکثرت ایسی چیزیں میں نے پڑھیں، جن کے متعلق میرا خیال تھا کہ ہندو مذہب کے قدیم عناصر ہیں۔ لیکن مہامہوپادھیا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل پچھلے زمانہ میں ان کا اس ملک میں رواج ہوا۔ گنیش کی مورتی جس کی پوجا شمالی اور جنوبی ہند میں بڑے دھوم دھام سے ہر سال کی جاتی ہے اور مشکل ہی سے ہندوؤں کی کوئی ایسی جگہ ہوگی جہاں سونڈ رکھنے والی یہ مورتی براجمان نظر نہ آتی ہو، لیکن اوجھا صاحب اسی گنیش کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''جنوبی ہند یا شمالی کسی جگہ چوتھی صدی عیسوی سے پہلے کی نہ گنیش کی کوئی مورتی ملی اور نہ اس زمانے کے کتبوں میں ہی اس کا کچھ اشارہ ہے۔'' [صفحہ ۳۳]

وہ اس مورتی کے سونڈ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''گنیش کے منہ کی جگہ سونڈ کی ایجاد نہ جانے کب سے ہوئی۔''

ہندو مذہب کے اس فاضل نے خود ''گوشت خوری'' کی متعلق بھی یہی لکھا ہے کہ کسی زمانہ میں گوشت خوری کا اس ملک میں بہت رواج تھا۔ بلکہ ان ہی کا یہ بیان بھی ہے کہ:

''اس پر دیاس ہمرتی میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ گوشت نہ کھانے والا برہمن گناہگار ہو جاتا ہے۔'' [صفحہ ۶۶ قرون وسطیٰ میں ہندستانی تہذیب].

واقعہ تو یہی ہے کہ ہر قوم کو ہر زمانہ میں اس کا اختیار ہے کہ جس قسم کے عقائد و اعمال چاہے اپنے لیے مقرر کر لے، دوسرے مذاہب و ادیان والوں کو اس کا حق نہیں ہے کہ ان کی کتابوں سے ان پر حجت قائم کریں۔ اپنی کتابوں کی تفسیر و تاویل کا ان کو حق ہے۔ جو چاہیں سمجھیں۔ آج ہندوؤں نے خواہ اس کی وجہ کچھ ہی ہو، اگر یہ طے کر لیا ہے کہ سرے سے گوشت نہیں کھائیں گے، یا کسی خاص جانور کا گوشت نہ کھائیں گے تو ان کی کتابوں کو یا ان کی تاریخ کو دکھا دکھا کر ہم ان کو اس رویہ کے ترک پر مجبور نہیں کر سکتے۔ جس طرح ہندوؤں کے لیے بھی سزاوار نہیں ہے کہ جس چیز کو اپنے لیے ناجائز سمجھتے ہیں، خواہ مخواہ دوسروں کو بھی اس کے ناجائز ہونے پر مجبور کریں۔

گوشت سے موجودہ احتراز کا سبب

گوشت خوری کے متعلق ہندوستان کے جدید رجحان کی توجیہ اوجھا صاحب نے یہ کی ہے کہ:

''جین اور بدھ دھرم کے اثر سے رفتہ رفتہ اس کا رواج کم ہوتا گیا۔''

[صفحہ ۶۷ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب]

لیکن جینیوں اور بدھ مت والوں میں گوشت خوری جیسی اجماعی فطری چیز (یعنی ہندوستان کے سوا دنیا کے کسی ملک اور کسی قوم میں آدمی کی اس فطری غذا سے نفرت کا اظہار کسی

زمانہ میں نہیں کیا گیا ہے) اور ایک ایسی عام بات کے خلاف ان میں ترک لحمیات کا جذبہ آخر کیوں پیدا ہوا؟ ہوسکتا ہے جیسا کہ بعضوں نے لکھا بھی ہے کہ ''ویدک دھرم کے آخری دور میں پنڈتوں اور برہمنوں نے قربانی یعنی یدنیہ یا یگیہ (جو اضحیہ کے مخرج سے قریب تر لفظ ہے) کو سب کچھ قرار دے کر افراط کا ایسا طریقہ اختیار کیا کہ خون کے سوا اس زمانہ میں ہندوستان کی سطح پر او رکچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اسی کا ردعمل تھا جو جینیوں اور بدھ مت والوں کے قلوب پر اثر انداز ہوا۔ لیکن ان سیاح مورخین نے جانوروں کے مارنے کے جس دردناک طریقے کا مشاہدہ اپنے زمانہ میں ہندوستان میں کیا تھا، سچ پوچھیے تو بے رحمی کا یہی سلوک انسانی فطرت کے لیے زیادہ دن تک قابل برداشت ہو بھی نہیں سکتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نرم ورقیق قلب والوں کو بے رحمی کے اس طریقہ سے گوشت حاصل کرنے سے زیادہ آسان یہ ہی معلوم ہوا کہ گوشت کھانا ہی چھوڑ دیں۔ پھر بتدریج ان ہی کی اتباع میں بات آگے بڑھی۔ بڑھتے ہوئے اس منزل تک پہنچ گئی کہ سب سے زیادہ قربانیوں کی شوقین قوم قربانی کی مخالف بن بیٹھی۔ تاریخ کی نگاہوں میں اس قسم کے واقعات عجیب نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے جو آسمانی ادیان میں گوشت حاصل کرنے کے لیے خاص قاعدے مقرر کیے گئے ہیں، جن میں سب سے بڑی بات جانوروں کے خالق اور مالک کے نام سے ان کو زندگی کے سپرد کرنے پر آمادہ کرنا ہے۔ یوں بظاہر کچھ ہی سمجھا جائے، لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مالک وخالق کی تسبیح وتحمید کا علم ساری کائنات کو ہے۔ جن میں جانور بھی داخل ہیں۔ مرنا تو بہرحال ہر زندے کے لیے ضروری ہی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ خدا کے نام پر جانوروں سے ان کی جان جب طلب کی جاتی ہے اس وقت ان پر اپنے جبلی علم ومعرفت کی بنیاد پر کیا حال طاری ہوتا ہے اور اس کے ذبح کرنے کا دستور اور ذبح میں بھی حلال کرنے کے آلے کو ممکنہ حد تک تیز تر رکھنا۔ اس طریقہ میں علاوہ اس پاکیزگی کے جو خون کے اخراج سے گوشت میں پیدا ہوجاتی ہے جان نکلنے میں بھی سہولت کا ایک پہلو یقیناً مستور ہے۔

شاید میں اپنے اصل مضمون سے حسب دستور کچھ زیادہ دور ہوگیا۔ گفتگو ہندوستان کے متعلق یہ ہو رہی تھی کہ قدیم مسلمان سیاحوں نے اس ملک اور اس کے رسم و رواج، یہاں کے باشندوں کے بود و ماند، رہن سہن کے طریقوں کو کتنی بے تعصبی اور کھلے دماغ کے ساتھ دیکھا اور بیان کیا ہے۔

اہل ہند کا اظہار تفاخر

المسعودی کا (جو مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود کی اولاد میں سمجھے جاتے ہیں) حال تو یہ ہے کہ ہندوستان کے ذکر پر پہنچنے کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قلم بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اپنی کتاب ''مروج الذہب'' میں ہندوستان کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے:

> ''علم و نظر والوں کا وہ طبقہ جس نے عالم کی ابتداء اور انتہاء کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان دنیا کے قدیم زمانے میں روئے زمین پر جبین روشن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس ملک میں صلاح اور حکمت کی بنیادیں شروع ہی میں قائم ہوگئی تھیں۔'' [مسعودی، جلد ا صفحہ ۱۰۲]

پھر آگے اپنے مسموعات کا ذکر کیا ہے، جنہیں اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آج مہذب ترین قومیں جن نتائج تک بلکہ ان نتائج کے صرف خیال تک پہنچی ہیں، ہندوستان ان کو اپنی عملی زندگی میں شریک کر چکا تھا یعنی اس نے لکھا ہے کہ:

> ''جب دنیا میں مختلف قبائل و اقوام کی شکل میں نسل انسانی تقسیم ہوگئی (اور ہندوستان میں بھی ایک قوم آباد ہوئی) تو اس نے یہ طے کیا تھا کہ اپنے ملک کو، ملک والوں کے اقتدار میں لا کر (دوسروں قوموں سے تعلق کی نوعیت یہ ہوگی کہ) نہ ہم کسی دوسرے ملک اور دوسری قوم سے جنگ کریں گے نہ لڑائی۔ البتہ اگر ہماری طرف کوئی نگاہ اٹھا کر دیکھے گا تو پھر ہم اس پر جا پڑیں گے۔ تاکہ وہ ہماری اطاعت قبول کر لے۔'' [ایضاً صفحہ ۱۰۳]

اس نے ہندوالوں کے ان دعاوی کو بھی نقل کیا ہے کہ:

''ہم ہی سے ابتداء ہوئی ہے اور ہم ہی پر انتہاء بھی ہوگی۔ اور آخری انجام دنیا کا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ شروع بھی ہم ہی کرتے ہیں اور ختم بھی ہم ہی پر ہوتا ہے۔ اور سارے کرہ زمین میں ادب کی اشاعت ہمارے ملک ہی سے ہوئی ہے۔'' [ایضاً صفحہ ۱۰۲]

الغرض یہ اور اسی قسم کی بیسیوں باتیں اس سلسلہ میں المسعودی نے نقل کی ہیں اور اس طور پر نقل کی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی ان خصوصیات کا وہ منکر نہیں ہے اور یہی مجھے کہنا ہے کہ واقعہ بجائے خود کچھ بھی ہو، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک قطعی غیر مسلم کی حیثیت اس وقت ہندوستانی کی ہے، لیکن مسلمان مورخ نہ صرف اپنے ''دیدہ'' ہی کو بلکہ ''شنیدہ'' کو بھی اس ملک کی تعریف میں بغیر کسی اعتراض و تنقید کے نقل کرتا ہے اور المسعودی کی یہ باتیں تو خیر ''شنیدہ'' ہیں۔ ان عجیب و غریب دل و دماغ رکھنے والے پرانے مسلمانوں کی کچھ ''دیدہ'' رپورٹوں کو بھی سن لیجیے۔

شیخ مبارک انبائی تقریباً دوسری صدی ہجری یا اس کے کچھ ہی بعد کے آدمی ہیں۔ ان کے حوالہ سے صاحب ''مسالک الابصار'' ناقل ہیں کہ میں نے شیخ مبارک سے ہندوستان کے متعلق دریافت کیا تو مجھ سے انہوں نے بیان کیا کہ:

''نہروں کا جال اس ملک میں پھیلا ہوا ہے، بڑی اور چھوٹی نہروں کو ملا کر اگر شمار کیا جاوے تو ان کی تعداد ایک ہزار سے کم نہ ہوگی۔ بعض نہریں تو اس ملک میں اتنی بڑی بڑی ہیں کہ دریائے نیل سے ٹکر لے سکتی ہیں اور بعض نیل سے چھوٹی ہیں اور عموماً نہریں اس ملک کی اس قسم کی ہیں جیسے عام طور پر دنیا میں ہوتی ہیں۔''

سرزمین ہند کی زرخیزی اور موسموں میں اعتدال

شیخ مبارک ہی کا بیان ہے کہ:

''عام قاعدہ ہندوستان کی آبادی کا یہ ہے کہ عموماً ان ہی چھوٹی نہروں کے کنارے اس ملک کے شہر اور اسکی بستیاں آباد ہیں۔ ملک گھنے اشجار سے بھرا ہوا ہے۔ وسیع وعریض سبزہ زاروں اور مرغزاروں کی حد نہیں ہے۔''

اور سب سے دلچسپ چیز ہندوستان کے موسم کے متعلق شیخ مبارک کا یہ عجیب وغریب احساس ہے کہ:

''اپنے موسم کے لحاظ سے ہندوستان ایک معتدل ملک ہے۔ اس کے فصول میں حالات کے لحاظ سے تفاوت نہیں پایا جاتا۔ یعنی حد سے متجاوز یہاں کا کوئی موسم نہیں ہے۔ نہ اس ملک کی گرمی برداشت کی حد سے زیادہ ہے اور نہ یہاں کی سردی۔''

آخر میں شیخ کے الفاظ ان لوگوں کے لیے جو غریب ہندوستان کو ''گھر کی مرغی'' قرار دیئے ہوئے ہیں، سننے کے قابل ہیں، کہتے ہیں کہ:

''بلکہ سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان کے کل مہینے گویا بہار ہی بہار کے مہینے ہیں۔ اس ملک میں ہمیشہ ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور بادِ نسیم کے جھونکوں سے ہر زمانہ میں آدمی لطف اندوز ہوتا رہتا ہے، یہاں چار مہینے مسلسل بارش ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ بارش ربیع کے آخری مہینوں سے صیف (گرمی) کے اختتام تک ہوتی ہے۔ [صبح الاعشیٰ قلقشندی، صفحہ ٦٨]

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے موسموں کی قیمت کا اندازہ دوسرے ممالک کے سخت گرم وسرد موسموں ہی کے بعد ہوسکتا ہے اور شیخ مبارک کے بیان کو ہم اسی محل پر محمول کر سکتے ہیں۔ بلکہ بجائے کل ہندوستان کے اگر جنوبی ہند اور جنوبی ہند میں بھی ممالک محروسہ، سرکار آصفیہ کے

موسموں کو ہم اپنے سامنے رکھیں تو شیخ مبارک کے بیان کی توثیق ہم بغیر تاوان بھی کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پایہ تخت حکومت آصفیہ حیدرآباد دکن کی گرمی وسردی دونوں حد اعتدال سے متجاوز نہیں ہوتیں۔ کم ازکم حیدرآباد والے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے بارہ مہینے بہار کے مہینے ہیں اور شب وروز نسیم لطیف کے جھونکے ان کے ممالک میں چلتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہندوستان کے موسموں مین اتنے دنوں بعد کچھ تبدیلی ہوئی ہو۔ جیسا کہ دکن والوں کا بیان ہے کہ پہلے اس ملک کے موسموں کا اعتدال موجودہ حالات سے بھی بہتر تھا۔

اور یہ بیان کچھ ایک شیخ مبارک ہی کا نہیں ہے، قلقشندی نے بھی ''تحفۃ الالباب'' نامی کتاب کے حوالہ سے اس کے مصنف محمد بن عبدالرحیم اقلیشی کا بیان ہندوستان کے متعلق یہ نقل کیا ہے:

''ہندوستان بڑا ملک ہے، انصاف وعدل کی یہاں بہتات ہے۔ نعمتوں سے معمور ہے۔ سیاست اس ملک کی بہت اچھی ہے۔ دوامی خوشحالی کا دور دورہ ہے۔ اس ملک میں ایسا امن ہے جس میں خوف کا نام نہیں۔''

پھر باشندگان ہند کے ساتھ اس عہد کے مسلمانوں کو جو عام علمی عقیدت تھی جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے، ''تحفت الالباب'' کے مصنف نے بھی بایں الفاظ اسے ظاہر کیا ہے کہ:

''ہندوستان کے لوگ حکمت (فلسفہ) اور طب ہندسہ اور مختلف دستکاریوں کے جو عجیب ہیں، سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔''

قلقشندی ہی نے خود ''مسالک الابصار'' کے مصنف کے حوالہ سے ہندوستان کے متعلق یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

''ہندوستان کے متعلق میں طرح طرح کی باتیں سنا کرتا تھا جس سے میرے کان اور میری آنکھیں بھر گئی تھیں۔ لیکن فاصلہ کی دوری کی وجہ سے اصل حقیقت کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ لیکن جب لوگوں سے میں نے پوچھ گچھ شروع کی

اور واقعات کی تحقیق کے درپے ہوا تو حقیقت یہ ہے کہ میں نے جو کچھ ہندوستان کے متعلق سنا تھا، اس سے اس کو زیادہ پایا۔ میں اس ملک کو جو کچھ خیال کرتا تھا، معلوم ہوا کہ وہ تو اس سے کہیں زیادہ بہتر اور برتر ہے۔''

اخیر میں اپنی رائے ان الفاظ میں قلمبند کرتا ہے:

''ہندوستان کیا ہے، تمہارے لیے اتنی بات سمجھنی کافی ہے کہ یہی وہ ملک ہے جس کے دریا میں تو موتی ہے، خشکی میں سونا ہے، پہاڑوں میں اس کے یاقوت اور الماس ہے۔ اس کے جزائر میں کافور اور عود ہے۔ اس کے شہروں میں بادشاہوں (راجوں، مہراجوں) کی گدیاں اور تخت ہیں۔ اس کے جنگلوں میں ہاتھی اور گینڈے ہیں۔ اسی ملک کے لوہے سے تلواریں بنتی ہیں۔ اس ملک کی ہر چیز ارزاں ہے (یہاں کی حکومتوں) کی فوج بے شمار اور ان کے علاقے ان گنت، باشندوں میں عقل اور دانش کا زور ہے۔ ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس کے رہنے والے اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنے میں نظیر نہیں رکھتے اور یہی چیز تو آدمی کو خدا سے نزدیک کرتی ہے۔'' [صبح الاعشیٰ، قلقشندی، صفحہ ۶۲ ج ۵]

جیسا کہ میں نے عرض کیا، ان مسلمان سیاحوں کو حالانکہ اس ملک میں گھومنے پھرنے کا بہت کم موقع مل سکا ہے۔ لیکن یہاں کی ہر ہر چیز پر ان کی نظریں پڑتی تھیں۔ اور ان حالات میں بھی انہوں نے ایسی صحیح معلومات اس ملک کے متعلق فراہم کی تھیں جنہیں سن کر دوسروں کو نہیں ہم لوگوں کو جو ہندوستان کے باشندے ہیں، حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً ان ہی شیخ مبارک الانبائی کے حوالہ سے ہندوستان کی زرعی پیداواروں کی تفصیل قلقشندی نے بایں الفاظ نقل کی ہے:

''اس ملک میں چاول ہی صرف اکیس قسموں کا پیدا ہوتا ہے، چاول کے سوا گیہوں، جو، مسور، ماش، لوبیا، تل وغیرہ ہر قسم کے غلے یہاں ہوتے ہیں۔''

[ایضاً]

میں تو نہیں جانتا کہ آج بھی کوئی ہندوستانی چاول کے متعلق یہ جانتا ہوگا کہ اس کی اکیس قسمیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم لوگوں کو جو کچھ بھی معلوم ہے وہ یہی ہے کہ متعدد قسم کے چاول یہاں پیدا ہوتے ہیں۔

اسی طرح ہندوستانی گنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بیان کرنے کے بعد کہ:

''اس ملک میں گنے بڑی کثیر مقدار میں پیدا ہوتے ہیں، جن میں ایک قسم گنے کی ایسی ہے جس کا رنگ اوپر سے کچھ سیاہ مائل ہوتا ہے۔ چوسنے کے کام کے لیے یہ گنے خوب ہیں۔ ہندوستان کے سوا اور کہیں نہیں ہوتے۔''

پھر گنوں کے رس کا اور اس کے رس سے جو چیزیں بنائی جاتی ہیں، ان کی تفصیل کو اس پر ختم کیا ہے کہ:

''مٹھائیاں اس ملک میں ۶۵ قسم کی بنتی ہیں۔''

بتایئے ہم نے اور آپ نے کبھی اپنے ملک کی ان مٹھائیوں کو شمار کیا ہے؟

پھلوں کے تذکرے میں یہ لکھا ہے کہ:

''اس ملک میں شیریں، ترش، کسیلے، ہر قسم کے پھل اور میوے ہوتے ہیں۔''

آم کی دلچسپ تعریف

پھر بہت سے ہندوستانی اثمار کو گناتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ:

''اس ملک میں بکثرت ایسے میوے پائے جاتے ہیں جو نہ شام میں میسر آتے ہیں نہ مصر میں۔''

اور اسی کے سلسلہ میں ''ہندوستان' کے اس عجیب وغریب ''میوے'' کا بھی ان لوگوں نے تلفظ کی مختلف شکلوں کے ساتھ ذکر کیا ہے جو کہنے میں تو ایک پھل ہے۔ لیکن رنگ، روپ، شکل وصورت، مقدار کے کبر وصغر، مختلف قسم کی خوشبو اور آخر میں اپنے لامحدود ذائقوں کے تفاوت کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانیوں کو ایک میوہ نہیں بلکہ سینکڑوں میوے اس کے قالب میں عطا

کیے گئے ہیں۔ میری مراد "آم" سے ہے۔ ان سارے سیاحوں نے اس "آم" کا تذکرہ کیا ہے۔ کوئی تو اس کا نام لیتے ہوئے کہتا ہے:

"ولهم فاكهة تشبه الخوخ يسمونها الانبج تقارب الخوخ"

ترجمہ: ہندوستان والوں کے پاس ایک پھل ہے جو شفتالو (آڑو) جیسا ہوتا ہے نام اس کا "انبج" ہے۔ شفتالو کے قریب قریب اس کا حجم ہے۔ [ابن حوقل، صفحہ ۳۲۸]

یہ ابن حوقل کا بیان ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس بے چارے نے "آم کے متعلق صرف کسی سے سن لیا ہے کہ اس کا مزہ شفتالو جیسا ہوتا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ صرف سندھ تک پہنچا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں سندھ میں "آم" نہیں ہوتے یا ہوتے ہوں گے تو وہ شفتالو سے زیادہ اپنے اندر کوئی کیفیت نہ رکھتے ہوں۔ لیکن دلچسپ تلفظ "آم" کا قلقشندی نے درج کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"وبها فواكه اخرى لا يعهد مثلها بمصر والشام كالعنباء وغيرها"

[صبح الاعشیٰ صفحہ ۸۳ ج ۵]

ترجمہ: اس میں اور بھی طرح طرح کے میوے ہیں۔ ایسے میوے شام و مصر میں نہیں پائے جاتے۔ مثلاً عنباء یا اس کے اور دوسرے پھل۔

گویا ان کے خیال میں "آم" "عنب" (انگور) جیسا کوئی میوہ ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا آم شفتالو بھی ہے اور انگور بھی اور وہ سب کچھ ہے جسے دنیا میں لوگ فواکہ اور اثمار میں شمار کرتے ہیں۔ گویا اس کی مثال اس عربی شعر کی ہے جو کسی نے کہا ہے:

ليس على الله بمستنكر
أن يجمع العالم في واحد

ترجمہ: خدا کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ ایک ہی چیز میں سارے عالم کی خوبیوں کو جمع کر دے۔

آم کی تعریف میں مرزا بیدل عظیم آبادی کی اس مشہور رباعی میں بھی کچھ اسی قسم کا دعویٰ

کیا گیا ہے:

تا انبہ نمو بہ باغ آثار آورد
اسرار قِدم جملہ باظہار آورد
اصل و فرعش بجز حقیقت نہ نمود
مولا گل کرد و انبیا بار آورد

مطلب یہ ہے کہ ''انبہ'' (آم) کا عالم آثار کے باغ میں جب ظہور ہوا تو ازل کے سارے اسرار اس کے ذریعہ سے دنیا میں ظاہر ہو گئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ازل کے حقیقی اسرار ہی ہیں، خدا اور خدا کے انبیاء اب دیکھو! آم کے پھول کو لوگ مولہ کہتے ہیں (آج کل یو پی میں بور بعض علاقوں میں مور، اور بہار میں منجر کہتے ہیں) پس آم کا پھول تو مولیٰ ٹھہرا۔ اور پھل اپنی ابتدائی حالت میں ''انبیا'' کہلاتا ہے۔ گویا ازل کے ان دونوں اسرار پر پھول پھل آم کے مشتمل ہیں۔

ایک اور عظیم آبادی شاعر نے اردو میں آم ہی کو داد ان الفاظ میں دی ہے:

''انبت اللہ نباتاً حسناً'' کا منکر
نہیں کافر ہے تو پھر کس کو کہیں ہم کافر
انبیاء سے نہیں بہتر ہے اگر کوئی بشر
ہے پھلوں پر یوں ہی انبہ کی فضیلت ظاہر

قرآن میں آم کا ذکر

ایک دلچسپ لطیفہ اس سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ قرآن میں اپنی نعمتوں کو جتلاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ بنی آدم کو ''وفاکھۃ و ابا'' دیئے گئے ہیں۔ ''فاکہہ'' کے معنی تو میوے کے ہیں، لیکن ''ابا'' کا لفظ قرآن میں جو آیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ عجیب بات ہے کہ خلیفہ اول حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا گیا تو آپ نے اس کے جواب میں وہ مشہور فقرہ فرمایا، جس کا

ترجمہ یہ ہے کہ ''مجھے کونسی زمین اٹھائے گی اور کونسا آسمان اپنا سایہ مجھ پر ڈالے گا۔ اگر خدا کی کتاب کے متعلق میں ایسی بات کہوں جسے میں نہیں جانتا۔'' یعنی آپ نے اس لفظ کے معنی سے لاعلمی کا اظہار فرمایا۔ پھر حضرت عمرؓ سے بھی اسی قسم کی روایت آئی ہے۔ یعنی آپ نے بھی فرمایا کہ مجھے اس لفظ کے معنی معلوم نہیں ہیں۔ اگرچہ باوجود ان آثار کے متاخرین مفسرین نے اس کا ترجمہ ''گھاس چارہ'' کردیا ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ جب مفسرین نے صدیقی وفاروقی آثار کے باوجود مطلب بیان کرنے کی جرأت کی ہے تو فاکہہ کے قرینے سے آدمی کا ذہن اگر ''اب'' کے لفظ سے ''انب'' کی طرف منتقل ہوجائے جو آم کا قدیم ہندی تلفظ ہے۔ ایرانیوں میں ''انبہ'' کی شکل میں یہ لفظ مروج ہوا۔ اگر عرب میں وہی ''انب'' ''اب'' ہوگیا ہو تو کیا تعجب ہے۔ خصوصاً جب ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یمن کے ساحلی علاقوں میں ''انب'' کے درخت پائے جاتے ہیں۔

الغرض اسی طرح ہندوستان کی ترکاریوں اور یہاں کی بھاجیوں تک کے نام ان لوگوں نے گنوائے ہیں۔ ہندوستان میں خاص خاص طرح کے جو پھول ہوتے ہیں ان کی بھی ایک حد تک ان لوگوں نے فہرست دی ہے۔

ہندوستان میں سواری کے جانور

بلکہ اسی سلسلہ میں ہندوستان کے ''حیوانات'' کا عنوان قائم کرکے ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ:

> ''گو ہندوستان میں خچر اور گدھے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن عموماً یہاں لوگ نہ خچروں ہی پر چڑھنا پسند کرتے ہیں اور نہ گدھوں پر، بلکہ گدھوں کی سواری ہندوستان میں بہت معیوب اور رذلت کی بات سمجھی جاتی ہے۔ عموماً سواری گھوڑوں پر اور بیل کی مروج ہے۔'' [صبح الاعشیٰ صفحہ ۸۳ ج ۵]

اس سلسلہ میں عموماً ہاتھی کی سواری کا ذکر خصوصیت سے کرتے ہیں، بلکہ بعض باتیں اس موقعہ پر ان لوگوں نے ایسی لکھی ہیں جن سے عام طور پر ہم ہندوستان کے لوگ شاید ہی واقف

ہوں۔ مثلاً ابن خرداذبہ نے لکھا ہے کہ:

''ہندوستان کے راجوں اور مہراجوں میں اس کا بہت شوق ہے کہ ان کا ہاتھ جتنا اونچا ہو بہتر ہے اور ہاتھیوں کی قیمت کی کمی بیشی کا مدار زیادہ تر اس کی بلندی اور پستی ہی پر ہے۔''

اس کے بعد اس خاص بات کا ذکر کرتا ہے کہ:

''اونچے سے اونچے ہاتھی کا قد نو ہاتھ سے زائد نہیں ہوتا۔ البتہ اغیاب (سیلون کے جنگل کو کہتے ہیں) کی ہتھنی دس ہاتھ بلکہ کبھی گیارہ ہاتھ تک اونچی ہوتی ہے۔'' [ابن خرداذبہ صفحہ ٦٦]

ایک ہاتھی کے دلچسپ واقعات

ہاتھی کے تذکرے میں بعض دلچسپ واقعات کا بھی ان لوگوں نے تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً بزرگ بن شہریار نے یہ روایت درج کی ہے کہ:

''بعض لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ہندوستان کے ایک شہر میں اس نے ایک ہاتھی کو دیکھا تھا جو اپنے مالک کی تمام ضرورتوں کو انجام دیا کرتا تھا۔ اس کا مالک روزانہ اس زنبیل کو ہاتھی کے حوالہ کر دیا کرتا تھا جس میں بازار سے ضرورت کی چیزیں آتی تھیں۔ اسی زنبیل میں وہ کوڑیاں رکھ دیتا تھا کہ ان لوگوں کے یہاں بطور سکے کوڑیوں ہی کا رواج ہے اور کوڑیوں کے ساتھ ان چیزوں کے نمونے بھی اسی تھیلی میں رکھ دیئے جاتے تھے، جن کا منگوانا مقصود ہوتا۔ خواہ وہ کچھ ہو۔ ہاتھی اس زنبیل کو لے کر بنئے کی دکان پر آتا۔ بنیا ہاتھی کو دیکھتے ہی اپنے سارے کاروبار چھوڑ کر ہاتھی کے پاس آجاتا، کسی قسم کی کوئی ضرورت ہو، کسی قسم کا گاہک بنئے کے سر پر کھڑا کیوں نہ ہو، لیکن اس وقت ہاتھی کے سوا کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا تھا اور زنبیل کو اس سے لے کر

کوڑیوں کو گنتا اور ان نمونوں کو دیکھ لیتا۔ پھر اس کی دکان میں بہتر سے بہتر چیز ان نمونوں کی جو ہوتی انہیں زنبیل میں رکھ دیتا اور اس کا خیال رکھتا کہ کم سے کم بھاؤ میں چیزیں ہاتھی کی زنبیل میں رکھی جائیں اور ہاتھی اگر کچھ اضافہ پر اصرار کرتا تو چپکے سے اس اضافہ کو بھی زنبیل کے سپرد کر دینا ضروری خیال کرتا تھا۔ کبھی بنیا کوڑیوں کے گننے میں اگر غلطی کرتا تو ہاتھی اپنی سونڈ سے گڑبڑ مچانے لگتا۔ مجبوراً کوڑیوں کو بنیا پھر گنتا اور ہاتھی چیزوں کو لے کر اپنے مالک کے گھر واپس ہوتا۔ اگر اتفاق سے ہاتھی کی لائی ہوئی چیز کو مالک کچھ کم خیال کرتا تو ہاتھی کے چند دھول رسید کرتا۔ بے چارہ ہاتھی اسی وقت بنئے کی دکان کی طرف واپس لوٹ کر سونڈ سے اس کی دکان کی چیزوں کو بکھیرنے اور الٹ پلٹ کرنے لگتا۔ بنئے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو حسب مرضی چیز کا اضافہ کرے یا اس کو کوڑیاں گن کر واپس کر دے۔

اس ہاتھی میں یہ کمالات بھی تھے کہ وہ مالک کے گھر میں جھاڑو بھی دیتا۔ پانی چھڑکتا اور چاول بھی کوٹتا۔ یعنی سونڈ میں موسل کو لے کر چاول پر ضرب لگاتا۔ ایک آدمی اس کے سامنے دھان کو جمع کرتا جاتا اور وہ اس کو کوٹتا جاتا تھا۔ اسی ہاتھی پر پانی بھی اس کا مالک منگوایا کرتا تھا۔ جس کی صورت یہ ہوتی کہ اپنی سونڈ میں ڈول رسی کے ساتھ ہاتھی لے جاتا اور کنویں سے بھر کر مالک کے گھر پانی پہنچاتا۔ الغرض اسی طرح اپنے مالک کی تمام ضرورتیں یہی ہاتھی پورا کیا کرتا تھا اور علاوہ اس کے جب سواری کی ضرورت ہوتی تو اس کا مالک اس کام کو بھی اس سے لیا کرتا تھا۔ دور دراز مقامات کے سفر اس پر کیا کرتا تھا۔ ہاتھی خود اپنے لیے چارہ اس طرح لاتا کہ ایک بچہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاتا اور اس کو لے کر ہاتھی جنگل چلا جاتا۔ سونڈ سے جنگل کی گھاس اکھاڑ کر درختوں کے پتے

توڑ توڑ کر اس بچے کے حوالے کرتا وہ اس کو اس کی پیٹھ پر جمع کرتا، یہی گھاس اور پتے اس ہاتھی کی خوراک تھی۔''

اسی راوی کا بیان ہے کہ:

''اس قسم کے سدھائے ہوئے ہاتھیوں کی قیمت دس دس ہزار درہم تک ہوتی ہے۔'' [بزرگ بن شہریار، صفحہ ۱۶۵]

ہندوستان وسندھ کے جنگی ہاتھی

سندھ میں جب مسلمان پہنچے تو ہندوستان کے اس عجیب وغریب جانور سے انہیں بھی کافی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ المسعودی نے ''ہندی فیل'' کا تذکرہ کرتے ہوئے اور یہ کہ ہندوستان میں جنگ کا ایک اہم عنصر ہاتھی ہے، اس نے لکھا ہے کہ:

''جنگی ہاتھی لوہے میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو زرہ پہنائی جاتی ہے اور سونڈ میں اس کے قرطل (کٹار) ہوتی ہے جو ایک قسم کی ہندوستانی تلوار ہے۔ پانچ پانچ سو آدمی چاروں طرف سے اس ہاتھی کو گھیرے رہتے ہیں، جو اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کو روک روک کر آگے بڑھاتے ہیں''۔

اس کے بعد سندھ کے مشہور شہر منصورہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''منصورہ، منصور بن جمہور کے نام پر موسوم ہے جو بنی امیہ کی طرف سے سندھ کا گورنر تھا۔ اسی منصورہ کا جو آج کل بادشاہ ہے اس کے پاس ایک تو جنگی ہتھنی ہے اور اسی اور ہاتھی ہیں۔''

آخر میں اس نے بیان کیا ہے کہ:

''اس سندھی بادشاہ کے دو ہاتھیوں کو میں نے بھی دیکھا ہے جو بہت بڑے تھے۔ ان کی ہندوسندھ کے راجواڑوں میں بڑی شہرت تھی۔ کیونکہ یہ دونوں ہاتھی بڑے بہادر، دلیر اور آگے بڑھ کر حملہ کرنے کی خاص مشق رکھتے تھے۔

ان میں سے ایک ہاتھی کا نام منعر فلس اور دوسرے کا نام حیدرہ تھا۔''

المسعودی نے اس کے بعد یہ عجیب روایت درج کی ہے کہ:

''اول الذکر یعنی منعر فلس کے متعلق عجیب عجیب خبریں مشہور ہیں۔ اس ملک میں بھی اور یہاں سے باہر بھی، جن میں ایک خبر تو یہ ہے کہ اس کا فیلبان (سواس) مرگیا تو چند دن تک منعر فلس نہ کچھ کھاتا تھا اور نہ پیتا تھا اور جیسے کوئی روتا ہے۔ اسی طرح رونے کی آواز نکالتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غم رسیدہ آدمی رو رہا ہے۔ اس ہاتھی کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ اسی طرح دوسری خبر اسی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ایک دن فیل خانے سے (جائزہ دینے کے لیے) سب ہاتھی نکلے، آگے آگے سب کے منعر فلس تھا۔ اس کے پیچھے حیدرہ اور حیدرہ کے پیچھے دوسرے اسی ہاتھی قطار باندھے۔ یوں ہی سب ہاتھی جارہے تھے۔ راستے میں ان کی گذر ایک کم چوڑی گلی میں ہوئی۔ ادھر سے ایک بے چاری عورت چلی آرہی تھی۔ ہاتھی کو دیکھ کر اس پر جو خوف طاری ہوا تو بدحواس ہوکر گر پڑی اور اس کی ساڑھی بدن سے الگ ہوئی۔ کہتے ہیں کہ منعر فلس عورت کے اس حال کو دیکھ کر فوراً وہیں ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا بلکہ مڑ کر اس نے گلی کے عرض کو روک کر کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ دوسرے ہاتھی اب آگے نہیں جاسکتے تھے اور سونڈ سے منعر فلس اس عورت کو اشارہ کرنے لگا کہ اٹھ کر ساڑھی کو اپنے بدن میں ڈال لے اور اس کے جسم کا جو حصہ کھل گیا ہے اسے ڈھانک لے۔ عورت بے چاری اٹھی اور کپڑے درست کر کے جب وہ باہر نکل گئی تب پھر گلی کی سیدھ کی طرف رخ کر کے منعر فلس آگے بڑھا اور دوسرے ہاتھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔''

المسعودی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''جنگ کے سوا ہاتھی سواری کا کام بھی دیتے ہیں اور گاڑی بھی ہندوستان میں کھینچتے ہیں، بلکہ کھوند کر بیلوں سے جیسے دھان نکلوائے جاتے ہیں، ہاتھیوں سے بھی ہندوستان میں یہ کام لیا جاتا ہے۔''

اس نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ:

''حبشہ میں حالانکہ ہاتھی ہندوستان سے بہت زیادہ ہیں، لیکن وہاں کے لوگوں نے انہیں سدھایا نہیں ہے، سب وحشی ہیں۔'' [المسعودی، صفحہ ۲۴۶]

ہندوستانی حکمرانوں کی معاشرت

اسی طرح ان سیاحوں نے ان حکمرانوں کا جو اس زمانہ میں ہندوستان پر حکومت کرتے تھے، ان کے خصوصی عادات واطوار کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ سلیمان نے لکھا ہے کہ:

''ہندوستان کے راجگان ومہراجگان عموماً کانوں میں ایسی سونے کی بالیاں پہنتے ہیں جن میں قیمتی جواہرات جڑے ہوتے ہیں اور اپنے گلوں میں سبز سرخ جواہرات کے ہار ڈالتے ہیں، جن میں موتی بھی جگمگاتے رہتے ہیں اور یہی چیزیں ان لوگوں کے خزانوں کے بہترین سرمائے ہیں۔ ان کے فوجی سرداروں اور کشوری حکام وعہدہ داروں میں اس قسم کے زیورات کا عام مذاق پایا جاتا ہے۔'' [سلیمان، صفحہ ۱۴۵]

کہاروں پر سوار ہونے کا عام طریقہ جو اب بھی ہندوستان میں مروج ہے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ان لوگوں نے بیان کیا ہے کہ:

''اس ملک کے راجوں مہراجوں اور دوسرے ارباب ثروت ودولت کا قاعدہ ہے کہ ایک قسم کی خاص سواری پر سوار ہوتے ہیں جسے ''الھندول'' (یعنی ہنڈول) کہتے ہیں۔ وہ گویا محفہ کی جیسی ایک چیز ہوتی ہے۔ گویا سمجھنا چاہئے کہ (بجائے اونٹوں کے) آدمیوں کے کندھوں پر محفہ جا رہا ہے۔ ان

سواریوں کے اندر ایک خاص قسم کا طلائی ظرف (پاندان) ہوتا ہے، جسے کرندہ کہتے ہیں۔ اس میں ورق التنبول (پان) ہوتا ہے اور دوسری ضرورت کی چیزیں دوسرے لوگ سروں پر اٹھائے ہوئے سواری کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ راجہ شہر میں اسی طریقہ سے گھومتا ہے اور پان چبا تا جاتا ہے اور اس کے سامنے ایک اور برتن مبصقہ (اگالدان) ہوتا ہے۔ اسی میں پیک ڈالتا جاتا ہے۔'' [عجائب الہند، صفحہ ۱۱۸]

آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج سے سینکڑوں برس پہلے کی ہندی معاشرت کا کتنی گہری نظروں سے ان لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ ان مسلمانوں کی دلچسپیوں کا حال کیا تھا۔

پیشہ ور عورتوں کا رواج

سلیمان تاجر کے حوالہ سے میں اوپر نقل کر چکا ہوں کہ ہندوستان میں زنا کی سزا قتل تھی۔ مرد عورت دونوں کی رضامندی سے فعل اگر صادر ہوتا تو دونوں ختم کر دیئے جاتے تھے اور اگر یہ ثابت ہوتا کہ عورت کے ساتھ جبر وزبردستی کی گئی ہے تو صرف مرد ہی قتل ہوتا تھا۔ مگر ان ہی مورخین کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کسبیوں اور پیشہ ور عورتوں کا طبقہ ان کے زمانہ میں بھی موجود تھا۔ چنانچہ ابوزید السیرافی نے ہندوستانی رواسم اور یہاں کے حالات کے تذکرہ میں جہاں سراؤں کا تذکرہ کیا ہے، اسی میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ:

''ان سراؤں میں باضابطہ پیشہ کرانے والی عورتیں بھی رہتی ہیں۔ جن سے آنے جانے والے لوگ اپنا منہ کالا کرتے ہیں۔''

نہیں کہا جاسکتا کہ اس قسم کی باتوں کا رواج اس ملک میں کب سے ہوا۔ کیونکہ ہندوستانی معاشرت کے متعلق قدیم ادبیات کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی عفت وناموس کا سب سے بڑا محافظ یعنی حجاب اور پردہ کا قانون اس ملک میں عام

طور پر مروج تھا۔

مسلمان مورخین سے زیادہ ہندوستان کے ساتھ خوش عقیدگی رکھنے والے میں تو نہیں خیال کرتا کہ دوسری قوم کے ارباب تاریخ میں کوئی جماعت ہوگی۔ خوش اعتقادی کی حد یہ ہے کہ مسالک الابصار کے مصنف نے فول جو سیم کے بیج کی طرح ایک ترکاری ہے، مصر میں اور اب تو عرب میں بکثرت اس کا رواج پڑ گیا ہے۔ اس فول کا ذکر کے اسی مسلمان مورخ نے لکھا ہے کہ ''ہندوستان میں فول نہیں پایا جاتا''۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہندوستان والے حکماء میں فول ان کے نزدیک شاید ایسی ترکاری ہے جس سے آدمی کا عقلی جوہر بگڑ جاتا ہے۔

[صبح الاعشی، صفحہ ۸۲، ج۵]

یہی مجھے کہنا ہے کہ ہندوستان کے باب میں اتنے غالی معتقد مورخوں کے بیانوں پر نہ اعتماد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ بھلائیوں کے ساتھ جن برائیوں کا مشاہدہ اس ملک میں انہوں نے کیا ہے بیان کر دیا ہے۔

قدیم ہندوستان میں پردہ کا دستور

رامائن اور مہابھارت کی روشنی میں

رامائن اور مہابھارت میں جو قصے مذکور ہیں، ان قصوں کے پڑھنے والوں کو قدم قدم پر ایسی چیزیں ملتی ہیں۔ جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ قدیم ہندوستانی معاشرت میں پردہ اور حجاب ایک بڑا اہم عنصر تھا۔ رامائن میں ہے کہ جس وقت بن باس ہونے کے ارادہ سے سری رام چندر جی مہران سیتا کے ساتھ گھر سے نکلے تو لوگوں نے شور مچایا کہ

''کیا برا وقت ہے کہ وہ سیتا رانی جن کو کبھی آسمانی دیوتا بھی نہ دیکھ پاتے تھے، آج بازاری لوگ اس کو دیکھتے ہیں۔'' [رامائن ایودھیا کانڈم سرگ ۳۳، صفحہ ۱۹۷]

پھر جب لنکا فتح کر کے سیتا جی کو راون کی قید سے چھڑا کے رام چندر لے آئے تو بالمیکی نے لکھا ہے کہ راجہ دی بھشین کو سری رام چندر جی نے حکم دیا کہ نہلا دھلا کر سیتا کو لاؤ۔ دی بھیشن

سیتا جی کو پالکی میں سوار کر کے لایا اور مہاراج کو اطلاع دی، حکم ملا کہ ہمارے سامنے پیش کرو۔ دی بھیشن نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اردگرد کے لوگوں کو ہٹ جانے کا حکم دیا۔ تاکہ پردہ ہو جائے۔ لوگوں کے ہٹنے میں شوروغل ہوا۔ رام چندر نے نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ ہمارے حکم کے بغیر لوگوں کو کیوں ہٹایا گیا۔ اس کے بعد بھیشن کو ویدک دھرم کے اس قانون سے مطلع کیا کہ:

''سنو! غم کے موقع پر، مجبوریوں میں، لڑائیوں میں، سوئمبر کے وقت اور قربانیوں میں اور بیاہوں میں عورت کا سامنے آجانا اور مرد کی نگاہ کا اس پر پڑجانا گناہ نہیں ہے۔ یہ سیتا بھی مصیبت زدہ ہے۔ مجبوریوں میں گرفتار ہے۔ اس کے سامنے آنے میں کوئی حرج نہیں۔ خاص کر جبکہ میں موجود ہوں۔''

[رامائن یدھ کانڈم سرگ ۱۱۴، صفحہ ۹۴۲]

سیتا جی کو پالکی سے اتار کر دی بھیشن جب رام مہاراج کے حضور میں لے چلے تو سیتا رانی بے پردگی کی شرم سے دوہری ہوئی جاتی تھیں، گویا اپنے آپ کو اپنے بدن ہی کے اندر چھپاتی تھیں۔ [یدھ کانڈم سرگ نمبر ۱۱۴]

الغرض مردوں کی سوسائٹی کا عورتوں کی سوسائٹی سے جدا رہنا، جو قانون حجاب کی روح ہے، ایک ایسا مسئلہ ہے، جسے ہم رامائن کے امور عامہ میں شمار کر سکتے ہیں، راجہ جیک کے متعلق لکھا ہے کہ رام چندر کی والدہ کوشلیا سے ایک دفعہ گفتگو کرنے کی ضرورت ان کو پیش آئی تو براہ راست گفتگو نہیں کی، بلکہ دربان کی معرفت گفتگو ہوئی۔ [اتر رام چریتم انکہ ۴]

لچھمن جی مہراج کی سب سے بڑی تعریف یہ کی گئی ہے کہ بن باس کے زمانہ میں شب و روز سیتا جی کے ساتھ رہے لیکن لچھمن جی کہتے تھے کہ میں نے سیتا جی کے صرف پاؤں دیکھے ہیں۔ اسی طرح راجہ سوگر یوہ یعنی بندروں کا راجہ جسے کہا جاتا ہے، اس کے متعلق لکھا ہے کہ ڈر کے مارے بجائے اپنے اپنی رانی کو لچھمن جی سے بات کرنے کے لیے بھیج دیا، لیکن عورت کو دیکھ کر لچھمن نے منہ پھیر لیا اور گردن نیچی کر لی۔ [رامائن کشن کانڈم سرگر ۳۳]

اسی بنیاد پر ان کی تعریف ہوئی کہ غیر عورت پر انہوں نے نظر نہ کی۔ رامائن ہی میں ہے کہ رام مہاراج کے اندرونی دروازے پر بڑھیا عورتوں کا پہرہ رہتا تھا۔

[رامائن ایودھیا کانڈم سرگ ۱۸ اشلوک ۳]

اب مہا بھارت کا مطالعہ کیجئے۔ درو پدی کو جب پانڈو ہار گئے اور در یودھن نے درو پدی کو بر سر دربار پکڑ کر بلوایا تو اس وقت درو پدی نے تقریر کی "اے بزرگو! راجاؤں نے مجھے سوئمبر کے موقعہ پر دیکھا تھا، اس سے پہلے مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا اور سورج بھی مجھے نہ دیکھ پاتے تھے۔ آج بد قسمتی سے مجھے غیر مردوں کے سامنے آنا پڑا اور اجنبی لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ذلت ہوگی کہ مجھ جیسی پاکدامن خاتون کو لوگوں کے سامنے آنا پڑا۔ ہزار افسوس ہے کہ راجہ ازلی دھرم کو کھو بیٹھے۔ ہم تو سنتے آئے ہیں کہ قدیم شرفاء کبھی بھی اپنی منکوحہ بیوی کو مجمع میں نہ لے جاتے تھے۔ افسوس کہ اس خاندان کا دھرم جاتا رہا۔

[مہابھارت سبھا پردہ ادھیا ۶۹ صفحہ ۶۱]

اسی مہابھارت میں ہے کہ سری کرشن کے ماموں کنش راجہ متھرا نے کشتی کا دنگل جب قائم کیا تو مستورات کے لیے جو خاص مکان تماشہ دیکھنے کے لیے بنوائے گئے تھے۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بلندی میں اڑتے ہوئے راج ہنس جیسے دکھائی دیتے تھے۔ جن میں باریک جالی تماشہ دیکھنے کے لیے لگائی گئی تھی۔ [وشنو پردہ ادھیا ۱۹]

بہر حال منو جی تک کا یہ حکم جب ہندو مذہب میں موجود ہے کہ مرد تنہائی میں ماں، بہن، بیٹی کے ساتھ نہ بیٹھے وجہ یہ بتائی ہے کہ آدمی مغلوب ہو جاتا ہے، لکھے پڑھے لوگ بھی پھسل پڑتے ہیں۔ [ادھیا ۲، صفحہ ۶۹]

تو اب اس کے بعد قانونِ حجاب کے لیے ویدک دھرم میں اور کیا چاہئے تھا، کل جگ کی علامتوں کو بتاتے ہوئے برہما پران میں ہے کہ آخری زمانہ میں عورتیں بگڑ جائیں گی۔ بے پردہ دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سنواریں کسی کی کچھ پرواہ نہ کریں گی۔

[شلوک ۳۹۔ ادھیا ۲ صفحہ ۱۲۲]

ہرش چریتم میں بان لکھا ہے کہ جب سے شریف اور خاندانی عورتوں کے منہ پر نقاب کی جالی نہیں رہی، ان کی شرم و حیا جاتی رہی ہے۔ [ہراش اچھواس ۳]

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بہت سے قدیم اصول پر بہ تدریج ایام انحطاط میں زوال آیا، اسی کا شکار پردہ کا قانون بھی ہندوستان میں ہوا۔ سلیمان تاجر زمانہ میں ہندوستان آیا ہے وہ اپنا مشاہدہ ان الفاظ میں قلمبند کرتا ہے کہ:

''اس ملک کے اکثر راجہ اپنی رانیوں کو باہر نکالتے ہیں اور ان سے ملنے کے لیے جو لوگ آتے ہیں، ان کے سامنے اپنی رانیوں کو بھی لاتے ہیں۔ خواہ یہ ملنے والے خود ان کے ملک کے ہوں یا باہر کے ہوں۔ رانیاں دیکھنے والوں سے پردہ نہیں کرتیں۔'' [سلیمان صفحہ ۱۴۶]

جوے کا عام رواج اور اسکے حیرت انگیز واقعات

خیال تو کیجیے قمار یعنی جوا بھی کوئی ایسا فعل ہو سکتا ہے، جس کی برائیوں تک پہنچنے کے لیے کچھ زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ لیکن یہی ہندوستان ہے، جس کے فلاسفہ اور حکماء کا ذکر اسلامی مورخین اتنی بلند آہنگیوں کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ وہی یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ:

''ان لوگوں میں نرد اور جوئے کا عام رواج ہے اور وسیع پیانے پر یہ رواج ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ غریب اور مفلس لوگ بھی اس راہ میں اپنی مردانگی دکھاتے ہیں۔''

سراندیپ کے ذکر میں بھی لکھا ہے اور واللہ اعلم سراندیپ ہی تک یہ بات محدود تھی یا ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی اس کا رواج تھا۔ یعنی لکھا ہے کہ:

''زیادہ تر یہ لوگ جوا مرغ کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ مرغ اس علاقہ میں بڑے بڑے فربہ اور موٹے ہوتے ہیں۔ جن کے پنجے اور چنگل بڑے لمبے لمبے اور

تیز ہوتے ہیں۔"

اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

"مرغوں کے چنگلوں میں یہ لوگ چھوٹی چھوٹی تیز چھریاں باندھ دیتے ہیں۔ اور انہی سے وہ لڑتے ہیں۔ جو مرغ غالب آجاتا ہے۔ اس کی قیمت سونے کے سکے سے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔"

آگے لکھا ہے کہ:

"جوئے میں داؤ پر سونا، چاندی، زمین مختلف قسم کے نباتات وغیرہ چیزیں لگائی جاتی ہیں۔"

اور دردناک قصہ ان لوگوں کا بیان ہے جو داؤ پر اپنی انگلیوں کو لگا دیا کرتے تھے۔ یعنی ہارنے والے کی انگلیاں جیتنے والے اسی وقت پتھر پر رکھ کر کلہاڑی سے کاٹ دیتے تھے۔ سلیمان کا بیان ہے کہ:

"انگلیوں پر جوا کھیلنے والوں کے بازو میں برتن رکھا رہتا ہے۔ جس میں ناریل کا یا تل کا تیل ہوتا ہے۔ کیونکہ زیتون کا تیل اس ملک میں نہیں پایا جاتا۔ تیل کا یہ ظرف آگ پر رکھا رہتا ہے۔ بیچ میں کلہاڑی دھری ہوتی ہے۔ کلہاڑی کو خوب تیز کر لیتے ہیں۔ پھر فریقین میں جو جیت جاتا ہے تو ہارنے والے کے ہاتھ کو پتھر پر رکھ کر کلہاڑی مارتے ہیں۔ انگلیاں اس ہارنے والے بے چارے کی اسی وقت جدا ہو جاتی ہیں۔ وہ فوراً اپنے ہاتھ کو اسی کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیتا ہے جس سے خون بند ہو جاتا ہے۔"

عجیب تر بات اس کے بعد یہ لکھی ہے کہ:

"ولا یقطعه ذاك عن المعاودة فی اللعب" [سلیمان صفحہ ۱۲۵]

ترجمہ: لیکن جوئے کے کھیل سے یہ حادثہ بھی اس کو نہیں روکتا۔

سلیمان نے شاید اپنا یہ مشاہدہ ہی بیان کیا ہے کہ:

''بسا اوقات دونوں فریق اس حال میں جدا ہوتے ہیں کہ دونوں کے ہاتھ انگلیوں سے خالی ہوتے ہیں۔'' [سلیمان صفحہ ۱۲۵]

ایک ترکیب خون کے بند کرنے کی یہ بھی لکھی ہے کہ:

''تیل میں ترکی ہوئی بتی کو جلا کر کٹے ہوئے مقام پر رکھ دیتے ہیں، جس سے وہ مقام جل جاتا ہے۔ جلے ہوئے گوشت کی بدبو پھیلتی رہتی ہے، لیکن اس حال میں بھی وہی جواری جوا کھیلنے میں مشغول رہتا ہے اور کسی قسم کا اضطراب یا پریشانی اس سے ظاہر نہیں ہوتی۔'' [سلیمان، صفحہ ۱۲۵]

ستی کی رسم

حیرت ہے کہ اس ہوش و حواس کے باوجود ہندوستان ستی اور خودکشی کے رواج کو بند نہ کر سکا۔ سلیمان وغیرہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ:

''ہندوستان کے راجوں کا قاعدہ ہے کہ جب مرتے ہیں تو ان کی رانیاں بھی ان کے ساتھ جل جاتی ہیں۔ البتہ اگر ان کی خواہش نہ ہو تو اس حرکت سے رک بھی سکتی ہیں۔''

واللہ اعلم، سلیمان نے اس رسم کو ہندوستان کے راجوں تک کیوں محدود بتایا ہے۔ بعد کے سیاحوں نے تو اس کو ہندوستان کی عمومی رسم میں شمار کیا ہے اور یوں بھی بند ہونے سے پہلے جیسا کہ سب جانتے ہیں عوام و خواص سب ہی میں یہ رسم پائی جاتی تھی۔

تناسخ اور خودکشی کا رواج

اور خودکشی کی یہ رسم کچھ زن و شوہر کے تعلقات ہی کے ساتھ وابستہ نہ تھی، بلکہ ان سیاحوں کا بیان ہے کہ اس کے سوا بھی دوسری صورتیں اس ملک میں رواج پذیر تھیں۔ مثلاً سلیمان نے لکھا ہے کہ:

''بلھر اور اس کے سوا دوسرے راجگان ہند کے ممالک میں یہ دستور ہے کہ لوگ اپنے آپ کو قصداً آگ میں جھونک کر جل جاتے ہیں۔''

سلیمان نے اس کی توجیہ بھی کی ہے کہ:

''تناسخ کے اعتقاد نے ان کو اس فعل پر جری بنا دیا ہے اور عقیدے پر ان کا ایمان ہے اور بغیر کسی تذبذب کے وہ اس پر یقین رکھتے ہیں۔''

آگے اسی سلسلہ میں اس نے بیان کیا ہے کہ:

''ہندوستان کے بعض راجوں کا دستور ہے کہ جب وہ گدی نشین ہوتا ہے تو اس کے لیے بھات پکایا جاتا ہے اور کیلے کے پتوں پر راجہ کے سامنے وہ بھات رکھا جاتا ہے۔ راجہ اپنے لوگوں میں سے بعض افراد کو بلاتا ہے، جن کی تعداد تین چار سو کے قریب ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو راجہ مجبور نہیں کرتا، بلکہ اپنے اختیار سے وہ راجہ کی اس دعوت میں شریک ہوتے ہیں۔ راجہ ان آنے والوں کو اسی بھات سے خود کچھ کھا لینے کے بعد عطا کرتا ہے۔ ایک ایک کر کے لوگ راجہ کے پاس آتے ہیں اور بھات کا جو حصہ ان کو ملتا ہے اس کو لے کر کھا لیتے ہیں، لیکن کھا لینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ راجہ اگر مر جائے یا قتل ہو جائے تو ہر اس شخص پر جس نے اس تقریب میں راجہ کے ہاتھ سے نوالہ لے کر کھایا ہے، یہ واجب ہو جاتا ہے کہ ٹھیک اسی دن جس دن راجہ کو موت آئے اپنے آپ کو آگ میں جلا دے۔''

سلیمان نے اس کے بعد لکھا ہے کہ:

''جب جلنے پر کوئی آمادہ ہوتا ہے تو راجہ کی ڈیوڑھی میں حاضر ہوتا ہے اور جلنے کی اجازت حاصل کرتا ہے۔ پھر بازاروں میں گھومتا ہے۔ آگ کا الاؤ جوڑ کر اس کے لیے تیار کر دیا جاتا ہے۔ جب بالکل عقیق کی طرح دہک کر آگ تیار

ہو جاتی ہے تو اس جلنے والے کے آگے آگے سنکھ پھونکے جاتے ہیں اور لوگ بازار میں اس کو گشت کراتے ہیں۔ اس کے گھر کے لوگ اہل و عیال سب چاروں طرف سے گھیرے رہتے ہیں۔ لوگ اس کے سر پر پھولوں کا تاج بھی پہناتے ہیں۔ آگ میں اشتعال پذیر چیزیں لوبان، سندروس وغیرہ ڈالی جاتی ہیں اور اس کے بعد یہ جلنے والا پھاند کر آگ میں کود پڑتا ہے اور چند ہی لمحوں میں بھسم ہو کر رہ جاتا ہے۔''

خود تو سلیمان نے نہیں دیکھا تھا لیکن دیکھنے والے کی زبانی ایک واقعہ اسی سلسلہ کا اس نے نقل کیا ہے کہ:

''ان ہی جلنے والوں میں سے ایک آدمی کو میں نے دیکھا کہ جب وہ آگ میں کودنے پر آمادہ ہوا تو خنجر جو اس کے ہاتھ میں تھا، اس کی نوک کو اس نے اپنے دل پر رکھا اور اس کے بعد دل کے پاس سے پیٹ تک چاک کر دیا۔ پھر اپنے بائیں ہاتھ کو اس نے سینہ میں داخل کیا اور اپنے جگر کا جتنا حصہ نوچ کر نکال سکا، اپنے ہاتھ سے اس نے نکالا۔ اس وقت وہ باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ پھر اسی خنجر سے جگر کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اس نے اپنے بھائی کے حوالہ کیا۔ گویا موت اس کی نگاہ میں کتنی حقیر شے ہے، اس کو ان افعال سے ظاہر کر رہا تھا پھر آگ میں پھاند گیا۔'' [سلیمان، صفحہ ۱۱۸]

اور سچ تو یہ ہے کہ ستی کی رسم ہو یا خودکشی کی مذکورہ بالا رسم، اس پر کم از کم اس یورپ کو تو ہنسنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جس نے زیادہ دن نہیں گذرے ہیں کہ ڈوئل کی رسم کو غیر قانونی قرار دینے کی جسارت دکھائی ہے!

اس کے بعد سلیمان نے (اسی راوی سے جس نے مذکورہ بالا واقعہ اس سے بیان کیا تھا) یہ روایت درج کی ہے:

''ہندوستان کے بعض علاقے میں کچھ لوگ پہاڑ پر آباد ہیں اور کچھ لوگ زمین پر، پہاڑیوں میں اور زمین پر رہنے والوں میں لاگ ڈانٹ چلی جاتی ہے۔ ان میں ہر ایک ایسی ایسی باتیں کر کے دکھاتا ہے کہ اس پر حیرت ہوتی ہے اور چاہتا ہے کہ جب میں نے کر کے دکھایا ہے تو میرا فریق بھی یا تو وہی کام کر کے دکھائے ورنہ اپنی شکست تسلیم کرے۔''

اسی سلسلہ میں ایک تماشا جسے راوی نے دیکھا تھا یہ ہے کہ:

''ایک پہاڑی، زمین والے کے پاس آیا اور بانسوں کے ایک جنگل کے پاس ٹھہر گیا اور سرے پکڑ کر ایک بانس کو اس نے جھکایا، پھر اس میں اس نے اپنی سر کی چوٹی باندھ دی اور کسی سے کہا کہ بانس کو پکڑے رہو، اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ لوگوں سے کہا کہ میں اپنے سر کو اس خنجر سے کاٹ دوں گا۔ جس وقت یہ کر گذروں بانس کو چھوڑ دینا۔ میرا سر جو بانس کے ساتھ اوپر ہو جائے گا دیکھنا کہ اپنے منہ سے قہقہہ لگائے گا۔''

راوی کہتا ہے کہ:

''یہ کہنے کے بعد اس نے واقعی سر کو خنجر سے جدا کر دیا۔ بانس چھوڑ دیا گیا۔ سر اوپر ہو گیا۔ لوگوں نے تھوڑی دیر کے لیے قہقہے کی آواز اس سے سنی۔''

اس کا بیان ہے کہ پہاڑی نے زمین والوں کو چیلنج دیا کہ اگر ہمت ہے تو اس تماشے کو وہ بھی کر دکھائیں۔ لیکن ان میں کوئی اس پر آمادہ نہ ہوا۔ ان کے بعد سلیمان نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''ہندوستان کے مرد ہوں یا عورتیں، جب ان کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے اور ہوش وحواس کمزور ہو جاتے ہیں۔ تو وہ لوگوں سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں دریا میں ڈبو دیا جائے۔ یا آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ کیونکہ پھر لوٹ کر چلے آنے کا ان کو یقین ہے (یعنی تناسخ کے عقیدے کی بنیاد پر)۔'' [سلیمان ص ۱۱۸]

بہر حال جس زمانہ میں اس مسلمان سیاحوں نے ہندوستان کی سیر کی تھی، اس قسم کے واقعات عموماً ان کے سامنے پیش آتے تھے۔ بزرگ بن شہریار نے ایک مشہور تاجر محمد بن بایشاد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

''دریا کے کنارے ایک بڈھی عورت کو جو لباس پہنے ہوئی تھی، میں نے دیکھا کہ بیٹھی ہوئی ہے۔ پوچھا کہ تو یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ اس نے کہا کہ میں بڈھی ہوگئی ہوں۔ بڑی دراز مدت زندگی کی میں نے گذاری ہے، دنیا کا معقول حصہ مجھے میسر آیا، اب میں اپنے خدا سے ملنا چاہتی ہوں، تاکہ میری نجات ہوجائے اور یہاں دریا کے کنارے پانی کے چڑھاؤ کی منتظر ہوں۔''

محمد بن بایشاد کہتے ہیں کہ:

''بڑھیا وہیں بیٹھی رہی، تا آنکہ پانی چڑھا اور بڑھیا کو لے کر غائب ہوگیا۔''

ڈاکٹر برنیر جو ایک فرانسیسی سیاح ہے، اور شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آیا تھا، اس نے بھی اس رسم کا اپنے سفرنامہ میں تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''بعض لوگ ایسا بھی کرتے ہیں کہ قریب المرگ بیمار کو دریا کے کنارے لے آتے ہیں اور اس کے پاؤں پانی میں رکھ کر بتدریج اس کو گردن تک ڈبوتے ہیں، اور جب سمجھ لیتے ہیں کہ اب مرنے کو ہے تو سارا بدن ڈبو دیتے ہیں اور اس کو وہیں چھوڑ کر رو پیٹ کر چلے آتے ہیں۔''

پھر آگے اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''اس رسم کا جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ مدعا ہے کہ اس طرح پر تمام گناہ (جن سے مردہ کی روح اپنے جسمانی تعلق کے وقت ناپاک ہورہی تھی) دھوئے جاتے ہیں۔''

[ترجمہ سفرنامہ برنیر، جلد دوم، صفحہ ۱۸۸ از سید محبوب رضوی]

آخر میں بزرگ بن شہریار نے لکھا ہے:

"وقد ذكرت فى هذا الجزء فى غير موضع من اخبار الهند فى قتلهم انفسهم بضروب القتل مافيه كفاية" [عجائب الہند، صفحہ ۱۲۳]

ترجمہ: ہندوستان کے متعلق خودکشی کے واقعات اور یہ کہ کن کن مختلف طریقوں کو اس راہ میں وہ اختیار کرتے ہیں۔ میں نے ہندوستان کی خبروں کے سلسلہ میں اس کا اتنا تذکرہ کیا ہے کہ زیادہ کی ضرورت نہیں۔

کالی پر انسانی قربانیاں

اسی سلسلہ میں بزرگ بن شہریار نے اس واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ کس طرح ایک ''دیوی'' جس کا رنگ سیاہ ہے، اسی پر لوگ اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں۔ جنوبی علاقہ کے ایک شہر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''شہر کے باہر ایک بڑا عظیم پہاڑ ہے، جس کے دامن میں ایک ندی جاری ہے اور پہاڑ کے ایک طرف ایک مصنوعی درخت تانبے اور پیتل کا بنادیا گیا ہے، جس میں سیخوں کی طرح کانٹے بھی لگادیے گئے ہیں۔ اس درخت کے سامنے ایک دیوہیکل عظیم الجثہ مورتی ہے جس کا رنگ سیاہ ہے، لیکن آنکھیں زبرجد کی ہیں، ہر سال باشندے اس بت کا تہوار مناتے ہیں، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ لوگ گھروں سے نکل نکل کر اس پہاڑ کی طرف آتے ہیں۔ پھر اس پر چڑھتے ہیں۔ ان میں سے جو اس دیوی سے زیادہ نزدیکی حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اس کے پاس آتا ہے اور اس کے سامنے سجدے میں گر جاتا ہے۔ بار بار سجدے کرتا ہے اور اس کے بعد اپنے آپ کو پہاڑ سے اس طریقہ سے نیچے گراتا ہے کہ ٹھیک اسی مصنوعی سیخوں والے درخت پر آکر گرے، جس سے وہ کٹ کر پرزے پرزے ہو جاتا ہے۔ اور بعض لوگ اس مورتی کے سامنے

سے سر کے بل اس طرح اپنے آپ کو گراتے ہیں کہ ایک چٹان جو اسی مورتی کے قدم کے نیچے ندی میں ہے، اسی سے ان کی کھوپڑی ٹکراتی ہے، جس کے بعد دماغ پاش پاش ہو جاتا ہے۔" [عجائب الہند، صفحہ ۶]

واللہ اعلم جس ہندوستان میں خدا کے لیے بھی جانوروں کی قربانی آج جرم ٹھہرائی جا رہی ہے، دیویوں اور دیوتاؤں کے لیے اب بھی انسانوں کی قربانی ہوتی ہے یا نہیں۔ اعلانیہ تو نہیں، لیکن سننے میں یہی آتا ہے کہ چھپ چھپا کر انسانی قربانی کے ذوق کو اس ملک کے باشندے اب بھی پوری کرتے رہتے ہیں۔

ننگے فقیروں کی ہیئت کذائی

واقعہ یہ ہے کہ مٹی مٹائی بچی کھچی شکلوں میں آج بھی جو چیزیں ہندوستان میں پائی جاتی ہیں، ان کو دیکھ کر ان سیاحوں کے بیانات کی توثیق کرنی پڑتی ہے۔ سلیمان تاجر نے ایک موقع پر یہ لکھ کر کہ:

"وللهند عباد واهل علم يعرفون بالبراهمة وشعراء يغشون الملوك ومنجمون و فلاسفة وكهان واهل زجر للغربان وغيرها وبها قوم سحرة وقوم يظهرون التخايل و يبدعون فيها وذلك بقنوج خاصة" [سلیمان، صفحہ ۱۲۷]

ترجمہ: ہندوستان میں پجاریوں اور اہل علم کا ایک طبقہ پایا جاتا ہے جو براہمہ (برہمنوں) کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں شعرائ بھی ہیں جو راجاؤں کے دربار سے تعلق رکھتے ہیں ان میں منجم (جوتشی) بھی ہیں اور فلاسفہ بھی۔ کہانت کرنے والے فال نکالنے والے بھی۔ جو کووں کو اڑا کر فال نکالتے ہیں اور ہندوستان میں جادوگر شعبدے دکھانے والے بھی پائے جاتے ہیں۔ جو بعض عجیب باتیں دکھاتے ہیں۔ قنوج میں خصوصاً یہ بہت زیادہ ہیں۔

آگے ان ننگے فقیروں اور سادھوؤں کا بھی ذکر کیا ہے جو اب بھی ملک کے مختلف

اطراف واکناف میں کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔ جس زمانہ میں سلیمان اس ملک میں آیا تھا، اس وقت ان ننگے فقیروں یا ''قوم عراۃ'' کیا کیا خصوصیتیں تھیں، ان الفاظ میں اس نے ان کو بیان کیا ہے:

''یہ لوگ ننگے رہتے ہیں۔ ان کے بالوں سے ان کے بدن ڈھکے رہتے ہیں، بلکہ ان کی شرمگاہ کی ستر پوشی بھی ان ہی بالوں سے ہوتی ہے۔ ان کے ناخن لمبے لمبے ایسے دھاردار ہو جاتے ہیں کہ گویا وہ خنجر ہیں۔ کیونکہ ان ناخنوں کو یہ قطعاً نہیں کٹواتے۔ ٹوٹ کر گر پڑیں تو یہ دوسری بات ہے، ان سادھوؤں میں بعض لوگ ہمیشہ سیر و سیاحت میں مشغول رہتے ہیں۔ ان ننگے فقیروں کے گلے میں دھاگے سے بندھی ہوئی کھوپڑیں ہوتی ہیں۔ یعنی مرے ہوئے آدمی کی کھوپڑیاں، ان کو جب بھوک لگتی ہے تو کسی ہندوستانی کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مالک مکان پکا ہوا خشکہ (بھات) لے کر دوڑتا ہے اور کھوپڑی میں ڈال دیتا ہے۔ سادھو اسی کھوپڑی میں کھانا کھالیتا ہے۔ پھر جب تک بھوک نہیں لگتی بھیک نہیں مانگتے۔'' [سلیمان صفحہ ۱۲۸]

اس قسم کے فقیروں کا برنیر نے بھی اپنے سفرنامہ میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ:

''یہ لوگ ایسے عجیب طور پر عمر بسر کرتے ہیں کہ اگر میں اس کو بیان کروں تو مجھے شک ہے کہ آیا اس پر کوئی اعتبار بھی کرے گا۔ خصوصاً میرا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو جوگی کہلاتے ہیں اور جس کے معنی ہیں خدارسیدہ! بہت سے جوگی بالکل ننگے رات دن تالابوں کے پاس بڑے بڑے درختوں کے نیچے یا مندروں کے اردگرد کے مکانوں میں راکھ کا بستر کیے بیٹھے یا پڑے رہتے ہیں۔ بعض کی جٹیں پنڈلیوں تک لٹکتی رہتی ہیں اور الجھ کر ان میں گرہیں پڑ جاتی

ہیں۔ بعض جوگی ایک یا دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے رکھتے ہیں۔ ناخنوں کو اس قدر بڑھاتے ہیں کہ بڑھ کر مڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص کے ناخن میری چھنگلیا کے نصف سے (جس سے میں نے ان کو ناپا تھا) زیادہ تھے۔ ان کے بازو ایسی سخت اور غیر طبعی ریاضت کے حالت میں کافی غذا نہ پہنچنے کے سبب سے ان لوگوں کی طرح جو مزمن بیماریوں میں مبتلا رہ کر مر جاتے ہیں سوکھ کر نہایت دبلے پتلے ہو جاتے ہیں اور رگوں اور پٹھوں کے خشک اور سخت ہو جانے کے باعث اس قابل نہیں رہتے کہ جھکا کر اس سے کچھ منہ میں ڈال سکیں۔ ان فقیروں کے پاس ان کے چیلے حاضر رہتے ہیں جو ان کو نہایت ہی مہاتما سمجھ کر ان کا بڑا ادب کرتے ہیں۔ جوگیوں کا ننگا اور کالا جسم، لمبے لمبے بال، دبلی اور پتلی پتلی بانہیں، اور بل کھائے ہوئے ناخن اور وہ ڈراؤنی وضع جو میں نے بیان کی ہے، اس عالم سفلی میں اس سے زیادہ خوفناک شکل خیال میں نہیں آ سکتی۔

میں نے عموماً بعض بعض راجاؤں کے راج میں ان ننگے فقیروں کی اکثر ٹولیوں کی ٹولیاں دیکھی ہیں۔ جن کے دیکھنے سے ڈر لگتا ہے۔ بعض تو ہاتھ اوپر کو اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں، بعض کے دہشت ناک بال یا تو کھلے لٹکتے یا سر کے گرد بندھے ہوئے اور بل دیئے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض کے پاس ایک بڑا بھاری سونٹا ہوتا ہے، اور بعض کے کاندھے پر شیر کی خشک اور ناملائم کھال پڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے میں نے ان کو بالکل ننگے بڑے بڑے شہروں میں پھرتے دیکھا ہے اور جیسے کہ ہمارے فرانس کی گلی کوچوں میں کسی راہب کو پھرتے دیکھ کر کوئی خیال بھی نہیں کرتا، ایسے ہی یہاں مرد عورتیں اور لڑکیاں ان کو تعجب کی نگاہ سے نہیں دیکھتیں، بلکہ عورتیں بڑے

اعتقاد سے ان کو خیرات لاکر دیتی ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ یہ لوگ بڑے ہی مقدس اور سب سے زیادہ پارسا اور نفس کو قابو میں رکھنے والے ہیں۔"

[ترجمہ سفرنامہ برنیر، جلد دوم، صفحہ ۱۸۹۔۱۹۱ / از سید محبوب رضوی]

آج ہزار سال کے بعد بھی ان تماشوں کو کسی نہ کسی شکل میں آپ ہندوستان کے طول و عرض میں دیکھ سکتے ہیں۔

بزرگ بن شہریار نے بھی ہندوستان کے ان ننگے فقیروں کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ قریب قریب وہی باتیں جو سلیمان نے لکھی ہیں اس نے بھی بیان کی ہیں۔ بزرگ کا ایک فقرہ یہ ہے کہ:

"کبھی کبھی یہ ننگے فقیر اپنی شرمگاہوں پر چار انگل چوڑے چیتھڑے کو چڑھا لیتے ہیں اور کمر میں جو ڈورا ہوتا ہے، اسی کے ساتھ اس چیتھڑے کو باندھ دیتے ہیں۔ جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ بدن پر ملتے ہیں اور ان میں بعض اپنی مونچھ داڑھی سب منڈوا دیتے ہیں۔"

البتہ:

"لا یحلقون شعر العانة ولا شعر الابطین"

ترجمہ: زیر ناف اور بغل کے بال کو کبھی نہیں منڈواتے۔ [صفحہ ۱۵۶]

مردے کی کھوپڑیوں میں کھانا کھانے کا دستور تھا، اس کا بھی بزرگ نے تذکرہ کیا ہے اور توجیہ یہ بیان کی ہے کہ:

"علی سبیل الا تعاظ بذالك والتواضع"

ترجمہ: مردے کی کھوپڑی میں کھانے کی غرض یہ ہے کہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔ [صفحہ ۱۵۶]

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان مسلمان سیاحوں کی نظر واقعات کی تحقیق میں کتنی گہری تھی۔

لٹیروں کی چیرہ دستیاں

عجیب بات یہ ہے کہ ان ہی مورخین نے حالانکہ ہندوستان کے امن وامان کے قصے بھی بیان ہیں۔ میں نے ہی قلقشندی کی حوالہ سے یہ عبارت نقل کی تھی کہ تحفتہ الالباب والے نے ہندوستان کی تعریف میں لکھا ہے کہ:

''اس ملک میں ایسا امن ہے جس میں خوف کا نام نہیں۔''

لیکن اسی کے ساتھ ان سیاحوں نے ایسے حیرت انگیز واقعات کا بھی ذکر کیا ہے، جو اس زمانہ میں بھی امریکہ اور یورپ جیسے ممالک میں بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ آج سے صدیوں پہلے ان لوگوں کا بیان ہے۔ بزرگ بن شہریار لکھتا ہے کہ:

''ہندوستان میں ایک قسم کے چور پائے جاتے ہیں۔ چوروں کے اس طبقہ کے لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر میں آمدورفت جاری رکھتے ہیں۔ ان کا قاعدہ ہے کہ کسی بڑے تاجر کو یہ تاکتے ہیں، خواہ وہ ہندوستانی ہو یا ہندوستان کے باہر کا ہو۔ کوئی ہو۔ پھر اس کے گھر پہنچ کر یا بیچ بازار ہی میں دکان پر یا راستے میں اس کو پکڑ لیتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں چھرے ہوتے ہیں، ان ہی چھروں کو سامنے کر کے اس غریب سوداگر کو دھمکاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنی رقم داخل کرو، ورنہ تجھے ابھی قتل کردوں گا۔ اس حالت میں اگر کوئی آگے بڑھ کر ان سے مزاحمت کرنا چاہے یا حکومت کا آدمی روک ٹوک کرے تو پہلے اسی کو قتل کردیتے ہیں انہیں اس کی بالکل پروا نہیں ہوتی کہ قتل کریں تو خود بھی قتل کیے جائیں گے۔ ان کے نزدیک دونوں باتیں برابر ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس کسی سے وہ جتنی رقم کا مطالبہ کرتے ہیں، بجز ادا کرنے کے اور نجات کی کوئی صورت اپنے لیے نہیں پاتا۔ اور نہ کوئی دوسرا ڈر کے مارے ان سے تعرض کرتا ہے۔ غریب تاجر کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ یعنی دکان یا گھر یا باغ میں

جہاں کہیں وہ کہتا ہے کہ میرا مال فلاں جگہ ہے، وہاں لے جا کر اس سے مقررہ رقم وصول کرتے ہیں۔ ساہوکار جب تک رقم جمع کرنے میں مصروف رہتا ہے، یہ لوگ اطمینان سے کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ جب رقم سب جمع ہو جاتی ہیں تو ان کا آدمی آتا ہے، اس پر لاد کر جہاں ان کا جی چاہے اس آدمی کو ہتھیاروں سے گھیرے ہوئے لے جاتے ہیں اور مال و متاع پر جس کے چاہتے ہیں اس طرح قبضہ کرتے ہیں۔ [عجائب الہند، صفحہ ۱۵۲]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس قسم کے لٹیرے عام طور پر پھیلے ہوئے تھے۔ یہ بیان تو بزرگ کا ہے۔ سلیمان تاجر کی کتاب میں بھی ان لٹیروں کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ لکھا ہے کہ:

''ایک خاص قسم کا خنجر جسے جزلی کہتے ہیں ان کے پاس ہوتے ہیں، یہ لوگ زور سے کسی تاجر کے گٹے کو پکڑ لیتے ہیں اور پھر اس کی گردن میں لٹک جاتے ہیں اور خنجر کو اس کے سر پر علم کیے ہوئے گھسیٹتے ہوئے اسے سب کے سامنے شہر سے باہر لے جاتے ہیں اور انکا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جوں ہی ان سے کوئی اس تاجر کو چھڑانا چاہتا ہے پہلے تاجر کو قتل کر دیتے، پھر اپنے آپ کو مار ڈالتے ہیں۔ بہر حال اس طرح نکال کر اب اس سے زر فدیہ طلب کرتے ہیں اور تاجر بے چارہ اسے ادا کرتا ہے۔'' [صفحہ ۱۲۱]

اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''سیلون کے ایک راجہ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان ڈاکوؤں کا قلع قمع کیا جائے۔ بہت سے ہندوستانی اور عرب کے تاجر اس راہ میں مارے گئے، تب کچھ جا کر بات ٹھنڈی پڑی اور تاجروں کو کچھ امن نصیب ہوا۔

بزرگ بن شہریار نے ہندوستان کے لٹیروں کے اس خاص طبقہ کا ذکر کرنے کے بعد ایک مسلمان تاجر جن کا نام محمد بن مسلم تھا، لکھا ہے کہ وطن اصلی تو ان کا سیراف تھا، لیکن ہندوستان

کے مشہور ساحلی شہر تھانہ میں بیس برس سے زیادہ عرصہ تک ان کا قیام رہا تھا اور ہندوستان کے اکثر علاقوں کی اس شخص نے سیر بھی کی تھی، اسی کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

''بارہ آدمی ایک دفعہ لٹیروں کے اسی طبقہ کے تھانہ آئے اور ایک ہندی بنئے کو انہوں نے دھرلیا۔ یہ بنیا اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے بوڑھے باپ کے پاس بڑی دولت تھی اور تھا بھی بڑا محنتی اور جفاکش۔ بیٹے سے اسے بڑی محبت تھی، کیونکہ لے دے کر چشم و چراغ اس کا وہی ایک بچہ تھا۔ بہر حال اندر گھر میں گھس کر اس لڑکے کو انہوں نے اپنے قبضہ میں کر کے دس ہزار اشرفیوں کا مطالبہ شروع کیا۔ یا کچھ اسی کے قریب قریب، بنئے کے باپ کے لیے یہ کوئی بڑی رقم نہ تھی۔ لڑکے نے آدمی اپنے باپ کے پاس روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ خدا کے لیے اس وقت اتنی رقم دے کر مجھے جلد خریدیئے اور ان پاجیوں کے ہاتھ سے نجات دلوایئے۔ باپ دوڑا ہوا آیا اور ان لٹیروں کی خوشامدیں کرنے لگا اور بڑی لجاجت سے اس نے کہنا شروع کیا کہ ایک ہزار روپیہ لے کر میرے لڑکے کی جان بخشیے، لیکن لٹیرے کہاں ماننے والے تھے جو رقم انہوں نے کہہ دی تھی اسی پر اڑے رہے اور بولے کہ ایک پیسہ کم دس ہزار دینار سے تو ہم لیں گے نہیں۔ بوڑھے کو غصہ آ گیا۔ اور سیدھا شہر کے راجہ کے پاس پہنچا۔ اپنا حال بیان کیا اور بولا کہ جب تک اس قسم کے بدمعاشوں کو قرار واقعی سزا نہ دی جائے گی آپ کے ملک میں کون رہ سکتا ہے؟ راجہ نے کہا کہ یہ تو میرے لیے بالکل آسان ہے کہ ابھی ان ڈاکوؤں کو قتل کرادوں، لیکن ڈر اس کا ہے کہ تیرا بیٹا بھی تو ان لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا اور تیرا وہی ایک اکلوتا لڑکا ہے۔''

محمد بن مسلم کا بیان ہے کہ بوڑھے بنئے نے اس کے جواب میں راجہ سے کہا کہ:

''میں کیا کروں؟ وہ تو بہت بڑی رقم کا مطالبہ کرتے ہیں، میں یہ کیسے گوارا

کرلوں کہ اپنے آپ کو فقیر و محتاج بنا کر لڑکے کو ان کے ہاتھوں سے چھڑاؤں؟''

اس قساوت قلبی پر آمادہ ہونے کے بعد اس بوڑھے نے خود راجہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ آپ حکم دیجئے، اس مکان کے چاروں طرف لکڑیاں جمع کی جائیں، مکان کا دروازہ بند کر دیا جائے اور لکڑی میں آگ لگوا دیجئے۔ راجہ نے کہا کہ بوڑھے! تیرا لڑکا بھی تو اس کے ساتھ جل بھن کر خاک ہو جائے گا۔ جواب میں اس نے کہا:

"احتراقهم اهون عندی من ذهاب مالی"

ترجمہ: مال کے جانے سے میرے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ سب لوگ جل جائیں۔

راجہ یہ سن کر خود اٹھا اور اس گھر کے دروازے کو بند کرا کے آگ لگا دینے کا حکم دیا۔ بوڑھے بنئے کے سامنے اس کے لڑکے کے ساتھ سب لوگ جل کر بھسم ہو گئے اور وہ دیکھتا رہا۔

[عجائب الہند، صفحہ ۱۵۳]

ممکن ہے کہ اس قصے میں کچھ مبالغہ کا رنگ ہو، لیکن ہندوستان کے ایک طبقہ کے متعلق میرے خیال میں یہ ایک قدیم ترین مکتوبہ شہادت ہے، جس سے کم از کم اتنا تو یقیناً ظاہر ہوتا ہے کہ جزءرسی کے جو بیسیوں قصے اس طبقہ کے متعلق زبان زد عام ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ ہزار برس پہلے بھی ان کی شہرت اس خاص صفت میں پھیلی ہوئی تھی اور ضمناً اس واقعہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ باہر کی صرف قانونی حکومت جیسی آج کل یورپ و امریکہ میں قائم ہے۔ وہ صحیح امن و امان کے قائم کرنے میں پہلے بھی ناکام ثابت ہو چکی ہے اور آج تک ناکام ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، قلوب کے تشابہ اور نتائج کی وحدت کا کیا حال ہے۔ قریب قریب ان ہی الفاظ اور ان ہی خصوصیات کے ساتھ آئے دن یورپ و امریکہ کی خبریں لوٹ مار کے متعلق اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔

تحفۃ الالباب سے قلقشندی نے محمد بن عبدالرحیم اقلیشی کے حوالہ سے ہندوستان کے امن وامان کے جس حال کو بیان کیا ہے، ان ہی تاریخوں میں اس قسم کے واقعات دیکھنے کے بعد خیال گذرتا ہے کہ شاید محمد بن عبدالرحیم نے ہندوستان کے اس زمانہ کا حال بیان کیا ہے جب مسلمانوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر کے اس قسم کے ڈاکوؤں اور رہزنوں کا جہاں تک ان کے امکان میں تھا قلع قمع کر دیا تھا۔ اگر چہ بسااوقات اس طبقہ کے افراد اسلامی عہد میں بھی کبھی کبھی سر نکالتے رہے ہیں، لیکن دن دہاڑے اتنی سینہ زوری کے ساتھ بر سر بازار اس قسم کی حرکات کی جرأت کی نظیر مسلمانوں کے زمانہ میں نہیں ملتی۔ اس قسم کے واقعات اگر سنے جاتے ہیں تو امریکہ و یورپ ہی کے متمدن ممالک کے متعلق سنے جاتے ہیں۔

چین

ہندوستان اور چین کا تقابل

اور جیسے ان لوگوں نے ہندوستان کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا ذکر بغیر کسی تنگدلی کے کیا ہے، بجنسہ یہی طریقہ ان مسلمانوں نے چین کے حالات کے بیان کرنے میں اختیار کیا ہے، بلکہ ان دونوں مشرقی ملکوں میں مقابلہ کرتے ہوئے اپنے تاثرات بھی ظاہر کیے ہیں۔ مثلاً سلیمان نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ہندوستان اور چین میں فرق یہ ہے کہ ہندوستان زیادہ تر دیہاتوں سے آباد ہے، شہر اس میں کم ہیں، لیکن چین کا کوئی ایسا حصہ نہیں ہے جہاں باضابطہ شہر پناہ رکھنے والے بڑے بڑے شہر نہ ہوں۔ اور گو چین کی آب و ہوا ہندوستان کی آب و ہوا سے بہتر ہے، اسی لیے چین میں اندھے، کانے یا آفت رسیدہ لوگ کم نظر آتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر ہندوستان کے علاقوں کا بھی یہی حال ہے۔ بڑے بڑے دریاؤں کے لحاظ سے دونوں ملکوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اور بارش بھی ان دونوں اقلیموں میں بکثرت ہوتی ہے البتہ ہندوستان میں ریگستانی صحراء و بیابان بھی پائے جاتے ہیں اور اچھا خاصا علاقہ اس کا صحرائی ہے، لیکن چین میں اول سے آخر تک اس قسم کے غیر آباد بیابان نہیں دکھائی دیتے۔''

دونوں ملکوں کا اختلافِ مذاق

دونوں ملکوں کے لباس کے فرق کو ظاہر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:

''چینی لباس میں عرب (یعنی مسلمانوں) سے زیادہ مشابہ ہیں۔ یعنی قبا پہنتے ہیں، کمر بند باندھتے ہیں، لیکن ہندوستان کے باشندے زیادہ تر دو چادروں پر قناعت کرتے ہیں۔ البتہ سونے اور جواہرات کے زیور ہندوستانی زیادہ پہنتے ہیں۔ ان کے مرد بھی اور ان کی عورتیں بھی۔'' [سلیمان صفحہ ۵۹]

مذاق کا ایک عجیب فرق ان دونوں ملکوں کے متعلق یہ بھی بتایا ہے کہ:

''چینیوں کے پاس ہاتھی نہیں ہوتے، بلکہ اپنے ملک میں ہاتھی کو دیکھنا بھی وہ پسند نہیں کرتے۔ وہ اس جانور کو منحوس سمجھتے ہیں۔'' [سلیمان، صفحہ ۵۸]

چین میں حصول علم کا مذاق

پھر ان امور کے ساتھ ساتھ چینیوں کی طرف انہوں نے بعض ایسی خصوصیتوں کو منسوب کیا ہے جنہیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ خصوصاً جن باتوں کو آج مغربی تمدن کی خصوصیات میں شمار کیا جاتا ہے، ان کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے مثلاً سلیمان تاجر نے چینیوں کی تعلیمی حالات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"الفقیر والغنی من اهل الصین والصغیر والکبیر یتعلم الخط والکتابة" [سلیمان صفحہ ۳۸]

ترجمہ: امیر ہوں یا غریب، چھوٹے ہوں یا بڑے، اہل چین میں ہر ایک خط لکھنا پڑھنا سیکھتا ہے۔

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ چین جیسے طویل و عریض ملک میں آج سے ہزار سال پیشتر لازمی تعلیم مروج تھی اور یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ لازمی تعلیم مغربی تہذیب کی خصوصیت ہے، اگر سلیمان کا بیان صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ خصوصیت کا یہ دعویٰ بے معنی ہو جاتا ہے۔

اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''چین کے تمام شہروں اور اس ملک کی آبادیوں میں مدارس جاری ہیں۔ جن میں مدرسین حکومت کی طرف سے مقرر ہیں اور شاہی خزانے سے ان کو تنخواہیں ملتی ہیں۔ ملک کے فقراء اور غرباء کو یہ لوگ مفت تعلیم دیتے ہیں۔''

[سلیمان، صفحہ ۴۷]

اہل چین کے تہذیبی و معاشرتی خصوصیات

اس نے یہ بھی بیان کیا ہے اور شاید عام تعلیم کی بناء پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ:

''حکومت میں درخواست پیش کرنے والوں کی زبانی درخواست لائق توجہ نہیں سمجھی جاتی ہے، جب تک لکھ کر نہ دی جائے اور داخل کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھ لیا جاتا ہے کہ درخواست حکومت کے ضوابط و اصول کے مطابق ہے یا نہیں؟ ایک خاص آدمی اس کام کے لیے مقرر ہے۔ اگر درخواست اصول کے مطابق نہیں ہوتی ہے تو وہ مسترد کر دی جاتی ہے۔'' [سلیمان صفحہ ۳۹]

لین دین میں بھی اس کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ چینی باضابطہ تحریروں سے کام لیتے تھے۔ سلیمان کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ:

''کسی شخص کا دین کسی کے ذمہ جب ہوتا ہے تو ایک تحریر دائن کو اور ایک تحریر مدیون کو لکھنی پڑتی ہے، دونوں کو اپنی تحریروں پر خاص قسم کے نشانات بنانے پڑتے ہیں۔''

الغرض آج کل بیان تحریری عرضی دعویٰ، پٹہ قبولیت نامہ وغیرہ کاغذات انگریزی دفاتر میں جو مروج ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ چین میں ہمیشہ سے ان کا رواج تھا، بلکہ ایک عجیب بات اسی سلسلہ میں اسی نے یہ بھی لکھی ہے کہ:

''چینیوں کے ملک میں تھوڑی تھوڑی دور پر خاص قسم کے پتھر نصب ہیں، جن

کی لمبائی دس ہاتھ کی ہوگی، ان پتھروں میں بیماریوں اور ان بیماریوں کی دواؤں کے نام کندہ کردیے گئے ہیں، یعنی فلاں بیماری ہو تو اس کی دوا فلاں ہے اور غرباء جن کے پاس دواؤں کے خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے انہیں حکومت کے خزانے سے دام ملتے ہیں۔" [سلیمان، صفحہ ۴۷]

گو سلیمان نے لکھا نہیں ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عام امراض اور ان کا علاج و معالجہ کے طریقوں کی تعلیم چینیوں میں شاید عام تھی اور حکومت کی فیاضیوں کا سلسلہ جو چین میں جاری تھا، ان کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ابھی یورپ کو چین سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ:

"ایک مقام سے دوسرے مقام تک جب چین میں کوئی سفر کرنا چاہتا ہے تو حکومت اور خصی (ہر مقام کے گورنر) سے دو قسم کی تحریریں اپنے ساتھ لیتا ہے، ایک میں تو اس شخص کا نام، اس کی عمر، اس کے رفقاء کی عمریں اور یہ کہ وہ کس قبیلہ کا آدمی ہے، لکھا ہوتا ہے، اور دوسرے میں ان اموال کی تفصیل ہوتی ہے کہ جو اس شخص کے پاس ہوتے ہیں۔"

سلیمان نے لکھا ہے کہ اس ملک میں بڑا اہتمام ہے مقصود ان کا یہ ہے کہ:

"سفر کرنے والوں کا مال ضائع نہ ہو اور اگر کہیں ضائع ہو جاتا ہے تو فہرست مکتوبہ سے پتہ چل جاتا ہے۔ یا اگر مسافر راستہ میں کہیں مر گیا۔ بہر حال حکومت اس کے مال کو واپس کرتی ہے، خواہ اسی کو یا اس کے وارثوں کو۔"

[سلیمان، صفحہ ۴۳]

سلیمان ہی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ:

"جس زمانہ میں گرانی پیدا ہو جاتی ہے تو حکومت اپنے خاص انبار خانوں سے غلہ بازار میں نکالتی ہے اور بازار کا جو بھاؤ ہوتا ہے، اس سے کم دام میں وہ فروخت کرتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس ملک میں کبھی گرانی پیدا ہونے نہیں

پاتی۔“ [سلیمان صفحہ ۴۱]

اسی طرح جب کوئی دیوالیہ ہو جاتا ہے تو باضابطہ تحقیق کے بعد حکومت پر جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ واقعی وہ مفلس ہو گیا ہے تو:

”جن جن لوگوں کا بقایا اس دیوالیہ نکالنے والے شخص پر ہوتا ہے، سب کو حکومت ادا کر دیتی ہے۔“ [سلیمان صفحہ ۴۶]

سلیمان ہی نے لکھا ہے کہ:

”ہندوستان کی طرح چین میں بھی مسلمانوں کے مقدمات کے فیصلے کے لیے حاکم مسلمان ہی مقرر ہوتا ہے اور وہی عید کے دن مسلمانوں کو نماز پڑھاتا تھا۔ اور اسلامی قوانین کے مطابق مسلمانوں کے فیصلے کرتا تھا۔“ [سلیمان، صفحہ ۱۴]

یہ واقعہ ہے کہ چین کے مسلمان اپنی حکومت نہ ہونے کے باوجود ہمیشہ ایک خاص حیثیت وعظمت کے مالک رہے ہیں۔ چنانچہ ابن بطوطہ نے بھی جو آٹھویں صدی ہجری کا سیاح ہے، چین میں مسلمانوں کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”چین کے ہر شہر میں مسلمانوں کا ایک شہر ہے جس میں صرف وہی آباد ہیں۔ وہاں ان کی مسجدیں ہیں جن میں جمعہ وغیرہ کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ ان لوگوں کی وہاں تعظیم وتوقیر کی جاتی ہے۔ چین کے ہر شہر میں مسلمانوں کا ایک شیخ الاسلام ضرور ہوتا ہے، جس کے پاس مسلمانوں کے تمام معاملات جاتے ہیں اور ایک قاضی بھی ہوتا ہے جو ان کے مقدمات کے فیصلے کرتا ہے۔“

پھر آگے چل کر لکھتا ہے کہ:

”ملک چین تمام ملکوں سے زیادہ پر امن ہے اور مسافر کے لیے تمام ملکوں سے اچھا ہے۔“ [سید محبوب رضوی]

اور اسی قسم کی حیرت انگیز باتوں کا ان لوگوں نے چینیوں کے متعلق تذکرہ کیا ہے۔

یورپ والوں کے متعلق عام طور پر جو یہ مشہور ہے کہ ان کا موجودہ تمدن رومیوں اور یونانیوں کے تمدن سے ماخوذ ہے۔ مشرق سے انہوں نے کچھ نہیں لیا ہے، چینیوں کے حالات پڑھ کر مجھے تو اب اس میں شک پیدا ہو گیا ہے، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر چیزیں انہوں نے چینیوں ہی سے اخذ کی ہیں، بلکہ ابھی ان کو ان سے بہت کچھ لینا ہے۔ ان دونوں تمدنوں میں بعض امور کے متعلق کچھ عجیب قسم کا تشابہ معلوم ہوتا ہے۔ ان مسلمان سیاحوں کا بیان ہے کہ باہر سے چین کے باشندے بڑے پاک وصاف بنے ٹھنے رہتے ہیں۔ اور ٹھیک آج یورپ والوں کا جو حال ہے کہ کپڑوں پر کپڑے پہنتے چلے جاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ یہی حال چینیوں کا بھی تھا، بلکہ چینی تو حد کر دیتے تھے کہ صرف جسم کے بالائی حصہ ہی کو نہیں بلکہ ٹانگوں تک پر سردیوں کے موسم میں:

"دو دو شلواریں چڑھا لیتے ہیں، بلکہ تین تین چار چار پانچ پانچ پائجامے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق لوگ پہنتے ہیں۔"

اور اس کی ایک طبی توجیہ بھی بیان کرتے ہیں کہ:

"جسم کے نچلے حصہ ہی میں سردی کے سرایت کرنے کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔" [سلیمان صفحہ ۲۵]

اور نہ صرف سردیوں میں بلکہ سلیمان نے ایک قصہ ایک چینی آفیسر کا بیان کیا ہے کہ:

"وہ کسی عربی سوداگر کے پاس آیا۔ سوداگر کے پاس بیٹھا تو چینی افسر نے دیکھا کہ بار بار وہ اس کے سینے کو دیکھ رہا ہے۔ جس پر ایک تل تھا اور کپڑوں کے اندر سے نظر آ رہا تھا۔ عرب سوداگر کو تعجب ہو رہا تھا کہ باوجود کپڑوں کے تل باہر سے کیسے نظر آ رہا ہے۔ اس پر افسر نے اس سے کہا کہ تم کو کس بات پر حیرت ہو رہی ہے؟ اس نے حیـ ـت کی وجہ بیان کی تو وہ ہنسا اور اس نے اپنی آستین کو آگے بڑھا کر سوداگر سے کہا کہ گن لو۔ میں کتنے کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ اس نے گنا تو معلوم ہوا کہ پانچ اچکنیں حریر کی چینی افسر پہنے ہوئے تھا۔ لیکن کپڑے

اتنے باریک تھے کہ ان پانچ کپڑوں کے اندر سے بھی اس کے سینے پر جو تل تھا
وہ باہر سے نظر آرہا تھا۔'' [سلیمان صفحہ ۷۵]

اس سے چینیوں کی اس مہارت کا تو خیر اندازہ ہی ہوتا ہے جو پارچہ بافی کی صنعت میں انہیں حاصل تھی۔ سلیمان نے لکھا ہے کہ:

''بادشاہوں کے یہاں چین میں جو کپڑے استعمال ہوتے ہیں وہ ان کپڑوں سے بھی اعلیٰ ہوتے ہیں۔''

پتھر کے کوئلہ کا استعمال

کہنے والوں کو کیا کہیے، جو کہتے پھرتے ہیں کہ پتھر کے کوئلوں کے استعمال سے یورپ ہی نے دنیا کو واقف کیا ہے۔ اس سے پہلے لوگ اس کے استعمال سے ناواقف تھے۔ اب میں کیا کہوں کہ یورپ نے جس طرح اور بہت سی چیزیں چین سے اخذ کی ہیں، ان ہی میں پتھر کے کوئلہ کا استعمال بھی ہے۔ ابن بطوطہ نے جو آٹھویں صدی ہجری کا سیاح ہے، اپنی سفرنامہ میں ان ہی سنگین کوئلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چین میں بجز ان کے کوئی دوسری چیز ایندھن میں استعمال ہی نہیں ہوتی۔

چین میں نوٹ کا رواج

اسی نے چین کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ بجائے چاندی سونے اور تانبے وغیرہ کے سکوں کے عام طور پر یہاں کاغذی سکہ مروج ہے، اس نے اس کا نقشہ بھی بتایا ہے اور لکھا ہے کہ دوسرے سکے بازار میں لوگ مشکل سے قبول کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ نوٹ کا رواج بھی ایک قدیم رواج ہے۔

چینی تہذیب کا یورپی اقوام پر اثر

لیکن مجھے اسی کے ساتھ چینیوں کے اس مذاق کو دکھانا ہے کہ باہر سے جامہ زیبی کا تو ان کے یہ حال تھا، لیکن اندر ان کی کیفیت جو تھی وہ بھی ان ہی انصاف پسند، غیر متعصب سیاحوں ہی کے بیان سے معلوم کیجئے۔ سلیمان ہی نے لکھا ہے کہ:

''ان کے اندر نظافت اور طہارت قطعاً نہیں پائی جاتی۔''

گویا جو حال آج یورپ والوں کا ہے بلکہ اسی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے سلیمان نے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ:

"ولا یستنجون بالماء بل یمسحون بالقراطیس الصینۃ"

ترجمہ: استنجا پانی سے چین کے لوگ نہیں کرتے، بلکہ چینی کاغذ سے پونچھ لیتے ہیں۔ [سلیمان صفحہ ۲۵]

گویا کاغذ سے استنجا کا طریقہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ والوں نے چینیوں ہی سے سیکھا ہے۔ یہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ:

''چینی پیشاب عموماً کھڑے ہو کر کرتے ہیں۔ یہاں کے عام باشندوں کی یہی عادت ہے۔''

بلکہ اسی سلسلہ میں چینی امراء کے ایک خاص لطیفہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ:

''ان میں جو امیر اور بڑے لوگ ہیں، وہ ایک سوراخ دار لکڑی (نلکی) رکھتے ہیں، جس کا طول ایک ہاتھ کے برابر ہوگا۔ اس لکڑی کے دونوں طرف سوراخ ہوتا ہے اور کسی روغن سے اس پر پالش بھی کردی جاتی ہے۔ جب پیشاب کی ضرورت ہوتی ہے تو اس نلکی کے ذریعہ کھڑے کھڑے وہ پیشاب کرتے ہیں۔'' [سلیمان صفحہ ۱۱۴]

اور عجیب بات یہ ہے کہ ہندستان کے متعلق، حالانکہ ان ہی لوگوں کا بیان ہے کہ روزانہ

غسل کے بغیر وہ کھانا بھی نہیں کھاتے، لیکن پیشاب کے سلسلہ میں ان کے متعلق بھی لکھا ہے کہ:

''پیشاب کرنے کے بعد بغیر اس کے کہ نجاست کو صاف کریں فوراً کپڑے کو برابر کر لیتے ہیں۔'' [سلیمان صفحہ ۱۱۸]

عربوں کو ہندوستانیوں کی اس عادت پر تعجب ہوا ہے۔

چینیوں کی معاشرت اور ان کے تمدن کے اکثر عناصر کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ نے تتبع کیا ہے۔ چینیوں کی عورتوں کی حالت بیان کرتے ہوئے سلیمان نے لکھا ہے کہ:

''ان کی عورتیں اپنے سروں کو کھلا رکھتی ہیں اور بالوں میں کنگھیاں لگاتی ہیں، کبھی کبھی ایک ایک عورت کے سر میں بیس بیس کنگھیاں نظر آتی ہیں۔''

[سلیمان صفحہ ۲۵]

چینیوں کی آدم خوری

خلاصہ یہ ہے کہ باوجود اس عقل و ہوش کے چونکہ چینیوں کا تعلق اس زمانہ میں کسی الٰہی دین سے باقی نہیں رہا تھا اسی لیے بعض باتیں ان کی ایسی ان لوگوں نے بیان کی ہیں جو سمجھ میں نہیں آتا کہ باایں ہمہ دانش و دانائی، فرزانگی و فرہنگی بے چارے کن حالات میں مبتلا تھے۔ اسی سلیمان تاجر کی کتاب اور اس کے ساتھ ابوزید سیرانی کا جو ضمیمہ ہے اس میں یہ عجیب بات لکھی ہے کہ:

''چینیوں کا قاعدہ ہے کہ ان میں سے کوئی قوم جب اسی ملک کی دوسری قوم پر غلبہ حاصل کرتی ہے تو انہیں بالکل تباہ کر دیتی ہے اور وہاں کے باشندوں کو وہ کھا جاتے ہیں۔''

حال میں جاپان کی جنگ جو ہوئی تھی تو منجملہ اور خبروں کے بعض خبریں یہ بھی آئی تھیں کہ جاپانی دشمن کے قیدیوں کو یا جوان میں قتل ہو جاتے ہیں ان کو بھون کر کھا گئے۔ اس سے بھی مسلمان سیاحوں کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

اسی کے بعد لکھا ہے کہ:

"وذلك مباح لهم فی شریعتهم لانهم یبتاعون لحوم الناس فی اسواقهم" [سلیمان صفحہ ٦٦]

ترجمہ: یہ ان کے مذہب اور قانون میں جائز ہے، کیونکہ انسانی گوشت تو ان کے بازاروں میں بکتے ہیں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ چینیوں میں جب کوئی ایسا جرم کرتا ہے جس کی سزا قتل ہو تو قتل کرنے کے بعد:

"یدفع الی من یاکله" [سلیمان صفحہ ٦٨]

ترجمہ: ان لوگوں کے حوالہ مقتول کی لاش کر دی جاتی ہے جو ان کو کھا جاتے ہیں۔

اور یہ کوئی دس بیس ہزار سال پہلے کا قصہ نہیں ہے، بلکہ ابوزید السیرافی جو سلیمان تاجر کے بعد کا آدمی ہے وہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ انسانوں کے گوشت کا چین کے بازاروں میں بکنا ایک عام بات ہے۔

اس میں شک نہیں، جیسا کہ میں نے بھی لکھا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو بھی ان لوگوں نے اس زمانہ میں چوہے وغیرہ چیزوں کو کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن کہاں آدم خوری اور کہاں موش خوری، اگرچہ اس زمانے میں ہندوستان کا بھی پیغمبروں کے لائے ہوئے خدائی دین سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا اور جیسے چینی صرف عقل کی راہنمائی میں زندگی کے ضابط اور اصول بنا بنا کر جی رہے تھے، یہی حال ہندوستان والوں کا بھی تھا۔ لیکن اس اعتبار سے دیکھئے تو ہندوستان پھر بھی آپ کو بساغنیمت معلوم ہوگا۔ نہ صرف اسی ایک معاملہ میں بلکہ اور بھی مختلف چیزیں ان ہی سیاحوں کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ جن سے چین اور ہندوستان کے غیر پیغمبرانہ تمدن و تہذیب میں نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے۔

بدکاری کی اجازت اور اس کے اڈے

مثلاً چین کے متعلق بیان کیا ہے کہ:

''چینیوں میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ ان کی عورتوں میں جو عورت شادی کرنے سے گریز کرنا چاہتی ہو اور اس کی خواہش ہو کہ آوارگی کی زندگی بسر کرے، حکومت کی طرف سے اس کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ قاعدہ ہے کہ پولیس کا جو افسر اس علاقے میں ہوتا ہے عورت اس کے دفتر میں حاضر ہو جاتی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ وہ شادی کر کے زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی اور خرچی کمانے والے بیسواؤں میں شریک ہونا چاہتی ہے۔ پھر درخواست دیتی ہے کہ جس رجسٹر میں اس قسم کی بدچلن عورتوں کے نام لکھے جاتے ہیں اسی میں میرا نام بھی درج کر دیا جائے۔ تب اس عورت کا نام، اس کا نسب، اس کی شکل وصورت، حلیہ اور اس کے گھر کا پتہ، دیوان الزوانی، (بیسوا عورتوں کے دفتر) میں لکھ لیا جاتا ہے۔ اور گلے میں اس عورت کے ایک دھاگہ ڈال دیا جاتا ہے جس میں تانبے کی ایک انگوٹھی ہوتی ہے، جس میں حکومت کی مہر کندہ ہوتی ہے اور اس کو ایک اجازت نامہ لکھ کر دے دیا جاتا ہے، جس میں لکھا ہوتا ہے کہ بیسواؤں میں شریک ہونے کی اجازت دی جاتی ہے اور یہ کہ سرکاری خزانوں میں ہر سال اتنی رقم داخل کرتی رہے گی۔ اسی میں یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ اس عورت سے جو کوئی باضابطہ عقد کرے گا، وہ قتل کر دیا جائے گا۔ عورت اس اجازت نامہ کو اپنے ساتھ رکھتی ہے اور سالانہ جو رقم اس کے ذمہ واجب کی جاتی ہے ادا کرتی ہے۔ اس طبقہ کی عورتوں کا قاعدہ ہے کہ پچھلے پہر بن ٹھن کر بغیر کسی حجاب کے گذرگاہوں پر بیٹھتی ہیں۔ فسق وفجور والے ان کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ رات ان عورتوں کے پاس بسر کر کے صبح کو نکل آتے ہیں۔'' [صفحہ ۷۰]

عجب بات یہ ہے کہ ایک طرف چینیوں کے تمدن میں زنا کا شمار ایسے سخت جرائم میں تھا جس کی سزا ان کے یہاں قتل تھی۔ ابوزید سیرافی سلیمان کی کتاب کے تکملہ میں لکھتا ہے کہ:

''شادی شدہ مرد عورت اگر زنا کے مرتکب ہوں تو چینی قانون میں اس کی سزا قتل ہے۔''

اور قتل بھی کس طریقہ سے، ابوزید ہی کا بیان ہے کہ:

''دونوں ہاتھوں کو پہلے خوب مضبوطی کے ساتھ باندھ دینے کے بعد پھر ان بندھے ہوئے ہاتھوں کو گردن پر چڑھا دیتے ہیں، پھر داہنے پاؤں کو اوپر کر کے اسی بندھے ہوئے داہنے ہاتھ میں گھسیٹر دیتے ہیں۔ اسی طرح بائیں پاؤں کو بائیں ہاتھ میں۔ اس ترکیب سے دونوں تلوے اس کی پیٹھ کی طرف نکل آتے ہیں اور آدمی گویا ایک گیند کی طرح بن جاتا ہے۔ اپنے اوپر کسی قسم کا قابو اس کو باقی نہیں رہتا۔ نہ ہل سکتا ہے اور نہ کسی قسم کی جنبش کا اختیار اس میں باقی رہتا ہے اور اب ضرورت اس کی نہیں رہتی کہ کوئی پکڑنے والا اسے پکڑے رہے۔ اس تدبیر کے بعد اس کی گردن کو مہرے سے توڑ دیتے ہیں اور ریڑھ کی ساری ہڈیاں پیٹ کی طرف نکل آتی ہیں۔ وہ ایسے حال میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یوں ہی اگر اسے اسی حال میں چھوڑ دیا جائے تو اس کا دم نکل جائے، لیکن اسی پر بس نہیں کرتے۔ بلکہ ایک خاص قسم کی لکڑی ہوتی ہے جس سے اس کو مارتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کا دم نکل جاتا ہے۔''

اس موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ:

''اس کی لاش کھانے والوں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔''

بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً زنا کاری کو چینی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ وہی بات کہ سارے انسان ان کی نگاہوں میں ایک نہیں تھے اور ہر عورت جو بہرحال کسی کی بیٹی اور بہن ہی

ہوتی ہے اس کے ناموس کی حفاظت ان کی نگاہوں میں ضروری نہیں تھی۔

اور میں خیال کرتا ہوں کہ ابن خرداذ بہ نے اپنی کتاب میں ہندوستان کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ:

''ہندوستان کے راجہ زنا کو حلال قرار دیتے ہیں۔ صرف القمار (غالباً کامروپ آسام) کے راجہ کے ملک میں زنا کو حرام قرار دیا گیا ہے۔''

[سلیمان صفحہ ۲۶]

اس سے مراد وہی بات ہوگی جو چینیوں کے دستور میں نظر آتی ہے۔ کیونکہ سلیمان تاجر کے حوالہ سے میں پہلے یہ نقل کر چکا ہوں کہ ''ہندوستان میں بھی زنا کی سزا قتل ہی تھی۔ مرد وعورت دونوں کی رضامندی سے فعل اگر صادر ہوا ہو تو دونوں ختم کر دیئے جاتے تھے اور اگر ثابت ہو جائے کہ عورت کے ساتھ جبر وزبردستی سے کام لیا گیا ہے تو صرف مرد ہی قتل ہوتا تھا۔''

چین کے متعلق ان ہی سیاحوں اور تاجروں کا یہ بیان اگر صحیح ہے جو سلیمان نے لکھا ہے میں بجنسہ اس کے الفاظ نقل کر دیتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

''واھل الصین یلوطون بغلمان'' [صفحہ ۵۴]

ترجمہ: اور چین والے چھوکروں کے ساتھ فعل خلاف وضع فطری کے مرتکب ہوتے ہیں۔

تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ چوری چھپے نہیں بلکہ علانیہ چین والوں میں اس بدعادت کا رواج تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی طرف سے اس پر لوگوں کی گرفت نہیں ہوتی تھی بلکہ جیسے فاحشہ عورتوں کو فحش کاری کی باضابطہ سند حکومت کی طرف سے دی جاتی تھی، اسی طرح شائد اس فعل کا لائسنس بھی حکومت کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ میں بار بار کہتا رہا ہوں کہ پیغمبرانہ اور غیر پیغمبرانہ نظام حیات میں بڑا فرق ہے۔ چین صنعت وحرفت، طب و فلسفہ، حکمت ودانش کی جن بلندیوں تک ترقی کر کے جس زمانہ میں پہنچا ہوا تھا، ٹھیک ان ہی دنوں

میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان ہی دانش مندوں کی نگاہ ایسے غیر معمولی اخلاقی جرم کے ہونے تک نہ پہنچ سکی۔

ڈاکٹر اشرف الحق مرحوم حیدر آبادی جنہوں نے پچھلے دنوں خاص چینی مسائل پر مختلف رسائل شائع کیے تھے، خیال آتا ہے کہ ان کے ان ہی رسائل میں سے کسی رسالہ میں یہ چیز بھی درج تھی کہ جرمنی کے ریشتاغ میں ایک رکن نے قوم لوط کی اس عادت کو قانونی جواز عطا کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ یاد پڑتا ہے کہ ڈاکٹر اشرف الحق صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ آخر اس قانون کو ریشتاغ سے اس ممبر نے منوا بھی لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب شاید اس سے خود بھی ملے تھے۔

بہر حال مجھے یہ کہنا ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کے ائمہ کو آپ دیکھ رہے ہیں کہ خدا اور خدائی تعلیم سے ٹوٹ کر با ایں ہمہ عقل و فرزانگی کن خندقوں میں جا گرے ہیں۔ عقل انسانی، انسانی عقل اس وقت تک بن ہی نہیں سکتی جب تک کہ انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیم کی روشنی سے وہ منور نہ ہو۔ اس روشنی سے بے تعلق ہو کر چلنے والے کل بھی ان ہی گڑھوں میں گرے تھے اور آج بھی ٹھوکریں کھا کھا کر وہ ان ہی میں گر رہے ہیں، اعاذنا اللہ من طغیان العقل وسکراتہ۔

عام اسلامی ممالک

اس وقت تک ان اسلامی مورخین کے ان ہی معلومات کو میں نے پیش کیا ہے، جن کا زیادتر ہندوستان اور چین سے تعلق ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان مورخین نے اپنے زمانہ میں اسلامی ممالک کو جس حال میں پایا ہے اور ان کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے، کچھ تھوڑا بہت ان کا تذکرہ بھی درج کردوں۔

جنّات وانہار کا مذاق عام اور اس کا عجیب منشاء

اس قسم کے تمام سیاحوں (مثلاً، ابن حوقل، ابن خرداذبہ، المقدسی وغیرہ) سب ہی کی کتابوں میں اسلامی ممالک کے متعلق ہم جس چیز کو بطور قدر مشترک کے پاتے ہیں وہ جنّات (باغوں) اور انہار کا تذکرہ ہے۔ مشکل ہی سے کسی ملک کا ذکر ان لوگوں نے کیا ہے جس میں وہاں کے باغات، بہتی ہوئی نہروں، جاری چشموں کا اور وہاں کے خشک وسبک پانی کے ذکر کو انہوں نے ترک کیا ہو۔ الا ماشاء اللہ۔ آج ان ہی اسلامی علاقوں کا جو حال ہے اس کو دیکھتے ہوئے سچ تو یہ ہے کہ ان سیاحوں کے بیان پر اعتماد کرنا دشوار ہے۔ لیکن روایت ایک دو آدمی کی جھٹلائی جاسکتی ہی، سب ہی جھوٹ بولتے تھے اور سبھوں نے غلط بیانیوں سے کام لیا ہے، یہ فیصلہ بھی تو آسانی نہیں ہے۔

خدا ہی جانتا ہی کہ اپنے مذہب کے ان شدید معتقد مسلمانوں پر جنات وانہار کا یہ

مذاق کیسے غالب آ گیا تھا۔ المقدسی نے اپنی کتاب ''احسن التقاسیم'' میں فارس کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بیان کرنے کے بعد کہ آج کل اس علاقہ پر دیلم کے بنی بویہ کی حکومت ہے۔ مشہور دیلمی بادشاہ عضدالدولہ کے شاہی محل اور اس کے متعلقہ جنات و انہار کی تفصیل کے سلسلہ میں ایک دلچسپ اپنا خود زائیدہ نکتہ یہ درج کیا ہے۔ یعنی یہ سوال اٹھاتے ہوئے کہ اس قسم کی نہروں اور باغوں کا خیال ان لوگوں میں کس راہ سے پیدا ہوا؟ جواباً اپنی یہ توجیہ پیش کی ہے کہ:

''واظنه بناها علی ماسمع من اخبار الجنة''

[احسن التقاسیم، صفحہ ۴۴۵، مقدسی]

ترجمہ: میں خیال کرتا ہوں کہ جنت کی متعلق جو خبریں ان لوگوں نے سنی ہیں ان ہی خبروں نے ان باغوں اور نہروں کا خیال ان میں پیدا کیا ہے۔

جس کا مطلب گویا یہی ہوا کہ ان مسلمانوں میں ''جنات و انہار'' کے عمومی ذوق کو قرآن ہی نے پیدا کیا تھا۔

مقدسی نے اس شاہی محل کی براہ راست خود سیر کی تھی۔ اس نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے تین سو ساٹھ محل بنوائے ہیں۔ سال کا ہر دن ایک خاص محل میں گذارتا ہے۔ ہر محل دو منزلوں پر مشتمل ہے ایک بالائی اور دوسری تحتانی۔ ہر محل کی تحتانی منزل میں میلوں دور سے نہریں کاٹ کر لائی گئی ہیں اور محل کے مختلف کاشانوں اور حصوں میں نہایت تیزی سے بہتی رہتی ہیں۔ اسی طرح چھ میل دور ایک ندی سے نہر کاٹ کر لائی گئی ہے اور نلوں کے ذریعہ ان کا پانی بالائی منزل کی عمارتوں میں دوڑایا گیا ہے۔ بنگلوں پر اوپر سے ان نہروں کا پانی گرتا رہتا ہے اور ان کو ہمیشہ تر رکھتا ہے۔ اس شاہی محل کے ہر کمرہ کا رنگ الگ ہے، کسی پر چینی کے برتن جیسا کام ہے، کسی کا رنگ پتھر کے مانند ہے۔ کوئی ان میں سنہرا ہے، کسی کا رنگ نقرئی ہے۔ ان تین سو ساٹھ محلوں میں ہر محل اپنی وضع قطع، شکل وصورت، فرش فروش، ساز وسامان میں دوسرے سے قطعاً علیحدہ ہے او رہر ایک کو گھنے باغات گھیرے ہوئے ہیں۔ جن میں دنیا بھر کے نوادر میوے اور پھل لگے ہیں۔ ان ہی محلوں میں ایک ''ایوان'' کتابوں کے لیے مختص ہے۔ اس کے لیے ایک خازن ایک مشرف

ایک کلید بردار اور ایک ناظر مقرر رہے۔ اس وقت تک دنیا میں جو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں، ان کا ایک ایک نسخہ یہاں مہیا کیا گیا ہے۔ کتب خانہ کا یہ محل بڑا طویل وعریض پلاسٹر کیا ہوا ہے۔ جن میں الماریاں ہیں اور ترتیب سے کتابیں رکھی گئی ہیں۔ ہر فن کی کتابوں کا کمرہ الگ ہے۔ کتابوں کی مفصل فہرستیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ [احسن التقاسیم، صفحہ ۴۴۹]

مقدسی ہی نے لکھا ہے کہ:

''عضد الدولہ کے ان محلات کو دیکھ کر عام آدمی تو آزمائش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جو صاحب علم ومعرفت ہیں ان کے قلوب میں جنت کا شوق زیادہ تیزی کے ساتھ بھڑک اٹھتا ہے۔''

بصرہ کی نزہت گاہیں

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو اس عہد کے مسلمانوں پر ''جنات وانہار'' کا ذوق کس حد تک غالب تھا، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ بصرہ جو ظاہر ہے کہ براہ راست مسلمانوں کا خاص آباد کیا ہوا شہر تھا۔ ابن حوقل نے یہ لکھتے ہوئے کہ:

''اس شہر کی نہروں وغیرہ کا حال جب میں سنتا تھا تو دل ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا، لیکن مشاہدہ کے بعد میں نے اس کو جو کچھ پایا ہے اس کو کیسے نہ بیان کروں۔''

پھر اپنی چشم دید رپورٹ اس نے درج کی ہے، جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ:

''اس علاقہ میں عبداسی سے عبادان تک جو ڈیڑھ سو میل کی مسافت کم وبیش ہوگی، گھنے اور گنجان نخلستان ہیں، ایسے نخلستان کہ آدمی اس علاقے کے جس حصہ میں بھی ہو اپنے آپ کو کسی نہر کے کنارے کسی نخلستان ہی میں پائے گا اور ان تمام علاقوں میں تھوڑی تھوڑی دور پر آرام گاہیں اور نشستگاہیں مسلسل ملتی چلی جائیں گی۔ حسین اور خوبصورت، درمیان میں پر فضا نزہت انگیز میدان

ہیں، جن میں طرح طرح کے فواکہ، اثمار اور پھل پھول بھرے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے تالاب ہیں۔ تم لوگوں کو پاؤ گے کہ ان ہی سیر گاہوں میں ٹہل او رپھر رہے ہیں، آ رہے ہیں، جا رہے ہیں، کوئی اوپر سے نیچے کی طرف آ رہا ہے، کچھ نیچے سے اوپر کی طرف جا رہے ہیں۔ دور دور تک اس خطہ میں نہ پہاڑ ہیں اور نہ ٹیلے، ایک مسطح میدان ہے جو درختوں سے بھرپور ہے، اسی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے آثار ہیں۔ جمل کا واقعہ اسی علاقہ میں ہوا تھا۔ اسی شہر کے اندر حضرت طلحہؓ کا مزار ہے اور شہر سے باہر حضرت انسؓ کی قبر ہے۔ حسن بصری کی، ابن سیرین کی اور دوسرے علمائے بصرہ کی قبریں ہیں۔ ابلہ کی نہر بھی ہے۔ جس کا طول بارہ میل کے قریب ہے۔ بصرہ سے ابلہ تک نہر کے دونوں جانب باغات اور بڑے بڑے محل بنے ہوئے ہیں۔ سب ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں اور اس طرح ملے جلے ہیں کہ گویا ایک باغ ہے جسے ڈوری سے ناپ کر کسی نے لگایا ہے۔ پھر اس نہر سے بھی شاخیں پھوٹی ہیں۔''

بصرہ کے اس علاقہ میں ابن حوقل نے لکھا ہے کہ:

''ایک لاکھ بیس ہزار نہریں جاری تھیں، ان میں سے ایک ہزار نہروں کی وسعت اتنی تھی کہ باآسانی ان میں کشتیاں چلتی تھیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے ان الوالعزمیوں کا جو ان نہروں کے کھدوانے والوں میں کارفرما تھیں اور ان کے کنارے بھی درختوں کا یہی حال ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب ایک دن نصب کیے گئے ہیں۔'' [صفحہ ۱۶۰]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا باغ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خادم خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ بصرہ میں ان کا باغ مشہور تھا۔ اسی باغ میں آپ کا قصر بھی تھا۔ طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ

کے اس باغ میں ایک پھول ہوتا تھا جس کی خوشبو مشک کی خوشبو جیسی تھی۔ طبقات ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کے اس باغ میں طرح طرح کی ترکاریاں اور سبزیاں بھی ہوتی تھیں۔ جنہیں عموماً آپ احباب میں تقسیم فرماتے تھے۔ آپ کے اس باغ کے متعلق عموماً ان ہی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ سال میں دو دفعہ فصل اس میں آتی تھی۔ سمجھا جاتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو جو دعا دی تھی، یہ اس کی برکت تھی۔ لیکن آہ آج وہی بصرہ ہے۔ اس کا وہی آسمان، وہی زمین، اجاڑ میدان "شیئ من سدر قلیل" کی سی کیفیت ہے اور ایک بصرہ ہی کیا سارے عراق کا یہی حال ہے۔ امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ جرمنی کے ایک بہت بڑے انجینئر نے مجھ سے ایک دفعہ بیان کیا تھا کہ عراق کی سیر میں نے جب کی تھی تو ہارون الرشید کے زمانہ کی ایک نہر جو اب برباد شدہ حال میں ہے دیکھ کر متحیر ہو گیا۔ اس نے کہا کہ اتنی طویل اور اتنی عمیق نہروں کا بنانا موجودہ زمانہ کی مغربی حکومتوں کے بس کی بھی بات نہیں ہے۔

[دیکھو حاشیہ حاضر العالم الاسلامی]

بخارا اور ماوراء النہر وغیرہ کی زرخیزی

اور عراق جو نسبتاً ایک خشک علاقہ ہے، جب مسلمانوں نے کسی زمانہ میں اسے ایسا باغ و بہار بنا رکھا تھا، اسی سے اندازہ ان سرد اور گرم سیر علاقوں کا ہو سکتا ہے۔ جو ایران و خراسان، ترکستان وغیرہ میں واقع تھے۔ جن کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ اپنی کتاب ''ہمارے علمی گہوارے'' میں کروں گا۔ اس وقت صرف ابن حوقل کی ان چند سطروں کا ترجمہ کر دینا کافی ہوگا جو اس نے بخارا اور سمرقند کے متعلق اپنے تاثرات کو قلمبند کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تم بخارا کے قلعہ پر چڑھ جاؤ اور اس کے بعد اپنی نظر کو جولانی دو، دور دور تک نگاہ دوڑاؤ، بجز سرسبزی اور ہریالی کے تمہیں کوئی چیز نظر نہ آئے گی۔ ایسی سرسبزی آسمان کے رنگ سے جس کا رنگ مل جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیلا شامیانہ کسی سبز فرش پر تنا ہوا ہے اور بخارا کے قصور و محلات ان کے بیچ

میں کچھ ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ ستارے جگمگا رہے ہیں۔ایک ایسی زمین جس میں نہ نشیب ہے نہ فراز، جیسے آئینہ کی سطح۔''

پھر کچھ اور چیزوں کا تذکرہ کرنے کے بعد وہی لکھتا ہے کہ:

''بخارا سے دریائے سغد کی وادی کی طرف چلے آؤ۔ دائیں بائیں مسلسل تمھیں آبادیاں کوہِ مبتم تک ملی جلی نظر آتی چلی جائیں گی۔ ایسی آبادیاں جن کے چاروں طرف سبزہ زار محیط ہے۔ ان کی تروتازگی کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ یہ آٹھ دن کا راستہ ہے قطعاً ایک دوسرے کے ساتھ گتھے ہوئے گھنے اشجار، باغات، بساتین میدان جنھیں نہروں نے گھیر رکھا ہے، ایسی نہریں جو ہمیشہ جاری رہتی ہیں، بیچ بیچ میں ان ہی باغوں اور مرغزاروں کے بڑے بڑے تالاب جن میں پانی چھلکتا رہتا ہے۔ کھیتیاں ہیں کہ جدھر نظر اٹھاؤ لہلہاتی معلوم ہوں گی جو دریائے سغد کے دونوں کنارے پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر ان کھیتیوں کے پیچھے پیچھے چراگاہیں ہیں اور درمیان درمیان میں اونچے اونچے قصور محلات، قلعے، ہر شہر اور ہر گاؤں پر آبادی کے متعلق ملتے جلتے چلے جائیں گے اور ان کی وجہ سے اس علاقہ کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سبز دیبا کے کپڑے کے ساتھ ان بہتی صاف شفاف، شیریں نہروں کو کسی نے سی دیا ہے۔ اس علاقہ کے باشندوں کے گھروں میں اور ان کے باغات میں یہی نہریں گھومتی رہتی ہیں۔ کوئی سڑک، کوئی بازار، کوئی سمت، کوئی قصبہ اس میں ایسا نہیں ہے جس میں ان نہروں کا پانی نہ دوڑ رہا ہو اور سامنے کوئی حوض پانی سے بھرا ہوا نہ چھلک رہا ہو، یہی حال فرغانہ، شاش، اشروسنہ اور سارے ماوراء النہر کا ہے کہ گھنے درختوں سے وہ بھرا ہوا ہے۔ جس میں طرح طرح کے فواکہ، میوے، پھل، پھول ہیں۔ ترکستان کے پہاڑوں تک یہی حال ہے۔

انگور، اخروٹ، سیب اور دوسرے فواکہ، گلاب، بنفشہ اور طرح طرح کے پھول بکثرت نظر آئیں گے۔ پہاڑ کے قریب تو پھر ان کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے۔ جس کا جی چاہے کھا سکتا ہے۔ توڑ سکتا ہے نہ کوئی روکنے والا نہ ٹوکنے والا۔ میں نے ماوراء النہر کے ان ہی پہاڑوں میں دیکھا ہے کہ پستے کے درختوں کی وہ کثرت ہے کہ ان کی وہاں کوئی قیمت ہی نہیں۔ جس کا جی چاہے مفت جتنا چاہے لے سکتا ہے۔ یہاں میں نے گلاب کے بھی طرح طرح کے پھول دیکھے۔ جو خریف کے آخر موسم تک باقی رہتے ہیں۔ ان کی پنکھڑیوں کی بیرونی سطح کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے اور اندرونی کا کچھ اور۔ اگر بیرونی سطح سرخ ہے تو اندرون زرد۔ باہر والی نیلی ہے تو اندرونی پیلی ہے۔'' [ابن حوقل صفحہ ۳۴۷]

صحرائے افریقہ میں آبپاشی کے ذرائع

اور ایران و ترکستان، خراسان وغیرہ کو تو جانے دیجئے، یہاں کے قدرتی ذرائع سے مسلمانوں نے اگر نفع اٹھایا تو محل تعجب نہیں۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ مغربی افریقہ کے جہنمی منطقہ حارہ مثلاً سجلماسہ، اودغشت وغیرہ دور دراز علاقوں کو بھی اپنے اسی نہری اور آبی ذوق سے باغ و بہار بنا رکھا تھا۔ ابن حوقل الجبر نامی ایک آبادی کا جو اسی علاقہ میں ایک پہاڑ پر حکومت ادریسیہ کی قائم کی ہوئی تھی اسکے متعلق لکھتا ہے کہ:

''یہ ایک نو تعمیر بڑا شہر ہے۔ ایک بلند اونچے پہاڑ پر آباد کیا گیا ہے۔ آل ادریس والوں نے اس کو بسایا ہے۔ یہاں ان لوگوں کا ایک قلعہ بھی ہے۔ اسی قلعہ میں ان کے مملوکات محفوظ ہیں۔ اس شہر کی ان کی نظر میں بڑی قدر و منزلت ہے۔ خطروں سے سمجھا جاتا ہے کہ محفوظ ہے۔''

بہرحال مغربی افریقہ کے اسی برسرِ کوہ آبادی کے پانی کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن حوقل راوی ہے کہ:

''یہاں بھی مختلف چشموں سے نہریں جاری ہیں اور باغات وبساتین ان ہی نہروں سے سیراب کیے جاتے ہیں۔''

اس نے لکھا ہے کہ:

''بڑے وسیع پیمانہ پر یہاں زعفران کی کاشت ہوتی ہے۔ بلکہ اسی شہر کے قریب ادریس نامی جوجگہ ہے، وہاں کی پیداوار صرف زعفران ہے۔''

[صفحہ ۶۱]

اسی مغرب اقصیٰ کے ایک اور دوردست پہاڑی شہر جس کا نام جبل نفوسہ ابن حوقل نے بتایا ہے، حالانکہ اس کی چڑھائی جیسا کہ اسی نے لکھا ہے کامل تین دن کی ہے، لیکن پہاڑ پر پہنچنے کے بعد اس نے دیکھا کہ:

''پانی کی نہروں کا جال وہاں بھی بچھا ہوا ہے۔ شہر کے اطراف بڑے بڑے تاکستانوں سے معمور ہیں، جن میں بہترین انگور لگتے ہیں اور انجیر بھی اس علاقہ کے حد سے زیادہ پر مغز ہیں۔''

اسی شہر کے ذکر میں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''زراعت یہاں صرف جو کی کرتے ہیں۔ مگر اس جو کو بھی مسلمانوں نے خدا ہی جانتا ہے کس ترکیب سے اس مرتبہ پر پہنچا دیا تھا کہ ابن حوقل گواہی دیتا ہے۔ جب اس کی روٹی پکائی جاتی تو سارے جہان کے کھانوں میں اس روٹی کو میں نے لذیذ ترین غذا پائی۔ میں نے روئے زمین پر اس کی نظر نہیں دیکھی۔''

[صفحہ ۶۸]

شہروں میں آب رسانی کے طریقے

مسلمان شہروں اور آبادیوں میں پانی لانے کے متعلق کن کن تدبیروں سے کام لیتے تھے، اس کا اندازہ ان بیانات سے ہوسکتا ہے۔ مثلاً نیشاپور کے تذکرے میں ابن حوقل نے لکھا

ہے کہ:

''اس شہر میں پانی زیر زمین نالیوں کی راہ سے لایا گیا ہے۔ یہ نالیاں باشندوں کے مکانوں کے نیچے نیچے بنائی گئی ہیں۔ پھر شہر والوں کی ضرورت کو پوری کر کے نہر شہر سے باہر نکل جاتی ہے اور ان کشت زاروں اور باغوں میں گم ہو جاتی ہے جو شہر کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔''

پھر آگے لکھا ہے کہ:

''نیشاپور والوں کے پاس سغاور نامی ایک بڑی نہر بھی ہے، اس سے اطراف و نواحی کے باشندوں کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔''

اسی کا بیان ہے کہ:

''جن زیر زمین نالیوں سے پانی کی سیرابی ہوتی ہے ان کی حفاظت ونگرانی کے لیے باضابطہ ایک عملہ مقرر ہے۔''

اسی نیشاپور کی زیر زمین نالیوں کے ذکر میں اس نے لکھا ہے کہ:

''بعض بعض مقامات پر ان کی گہرائی سو سو درجے تک پہنچ گئی ہے۔''

[صفحہ ۳۱۲]

اسی طرح مرو مشہور خراسانی شہر کے متعلق لکھا ہے کہ:

''دریائے مرغاب سے نہریں کاٹ کر شہر تک پانی لایا گیا ہے۔ پانی کی تقسیم کا ایک مرکز ہے، اسی مرکز سے شہر مرو کے ہر ہر محلہ اور ہر بازار میں پانی تقسیم ہوتا ہے۔ جہاں سے لوگ پانی پیتے ہیں۔ اس کے دہانے پر سوراخ کیے ہوئے لکڑی کے تختے لگے ہوئے ہیں۔ کچھ ایسی تدبیر اختیار کی گئی ہے کہ مقررہ مقدار سے پانی کی آمد نہ گھٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے۔''

ابن حوقل کا بیان ہے کہ:

''دس ہزار آدمی پانی کی سربراہی کے اس طریقے پر کام کرتے ہیں۔ ان کا افسر مرتبہ میں والی (گورنر) شہر سے کم نہیں ہے، سردیوں میں موم لگا کر لوگ مرمت کے لیے نہر کی شاخوں میں گھستے ہیں۔'' [صفحہ ۳۱۵]

اور میل ہا میل سے آبادیوں تک پانی لانا، ان کو بلند سے بلند مقام تک پہنچانا، یہ تو اس زمانہ میں اسلامی شہروں کی ایک عام رسم ہوتی ہے۔

اور یہ تو میں نے بطور مثال کے نقل کیا ہے۔ ابن حوقل کے قلم کی رفتار کا یہی حال قریب قریب دوسرے ایرانی وخراسانی وسیستانی شہروں، اور آبادیوں کے ذکر میں بھی پایا جاتا ہے۔ آخر میں اس نے ان چیزوں کو لکھنے کے بعد بھی یہ لکھ دیا ہے کہ:

''مشرق کے متعلق مجھے جو کچھ لکھنا تھا، بس یہ اس کی آخری حد ہے۔ جہاں اسلامی ممالک کے حدود ختم ہوتے ہیں اور انشاء اللہ میں نے جو کچھ ارادہ کیا تھا۔ اس میں میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور جہاں تک میں اپنے نزدیک سمجھتا ہوں، محض گرمی، بزم اور زینت کلام کے لیے یا کسی علاقہ کی مذمت اور تحقیر کے لیے کسی مبالغہ سے یا خلاف بیانی سے میں نے کام نہیں لیا ہے۔''

اپنے شوق سیاحت کی نسبت ابن حوقل کا بیان

''یہ جو کچھ میں نے کام کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائے جوانی سے مجھے اس کا غیر معمولی شوق تھا کہ مختلف ممالک کے حالات کا علم حاصل کروں۔ اس لیے ان لوگوں سے جو سیر و سفر میں عموماً رہتے ہیں یا تجارت کے سلسلہ میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں ان کی آمد ورفت ہے، ملکوں کے حالات دریافت کیا کرتا تھا۔ نیز اس موضوع پر جو کتابیں اب تک تالیف ہوئی ہیں، ان کا مطالعہ بھی کیا کرتا تھا۔ شروع میں میرا حال یہ تھا کہ جس آدمی کو سچا سمجھ کر اس سے ملاقات کرتا اور خیال کرتا کہ وہ ان علاقوں کا بڑا واقف کار ہے، لیکن بعد کو

دیکھا کہ ان میں زیادہ تر غلط بیانیوں سے لوگ کام لیتے ہیں اور جن باتوں کی یہ خبریں دیتے ہیں ان سے یہ خود عموماً ناواقف ہوتے ہیں۔ جس کا پتہ مجھے یوں چل جاتا تھا کہ جو کچھ جس کسی سے سن لیتا تھا اسے اچھی طرح ذہن میں محفوظ کر لیتا تھا۔ پھر ان روایتوں کو ملاتا تو بکثرت ان بیانوں میں مجھے تضاد محسوس ہوتا۔"

لکھا ہے کہ اس تجربہ کے بعد:

"مجھ پر خود یہ شوق مسلط ہوا اور دل ہی دل میں اس عزم کو پختہ کرنے لگا کہ میں خود سفر کروں گا اور خطرات جو پیش آئیں گے، ان کے برداشت کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔ کیونکہ میں کرۂ زمین اور اس کے مختلف حصوں کا ایک صحیح نقشہ تیار کرنا چاہتا تھا۔"

زمین کی نقشہ کشی

زمین کی نقشہ کشی کا ذوق مسلمانوں میں شروع ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک کے عہد سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ الہمذانی نے لکھا ہے کہ دیلم پر جب حجاج کے زمانہ میں چڑھائی ہوئی تو حجاج نے حکم دیا کہ دیلم کے علاقہ کا نقشہ کھینچ کر مجھے بھیجا جائے، یعنی اس کے پہاڑی اور میدانی علاقے بلند اور پست خطے، اس کے جنگل، اس کے راستے، پس اس کا نقشہ بنا کر حجاج کو بھیجا گیا۔ مسلمانوں نے اس فن پر جو کام کیا ہے اس کی داستان تو طویل ہے اور عام طور پر یہ مشہور بھی ہے۔ ادریسی کا مشہور چاندی کا کرہ جس میں زمین کے چپہ چپہ کا پتہ دیا گیا تھا، حتیٰ کہ لوگوں کا بیان ہے کہ امریکہ کا بھی اسی نے پتہ دیا تھا۔ خود ابن حوقل نے بھی کرۂ ارض کا اٹلس بنایا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس کی کتاب کے ساتھ وہ طبع نہیں ہوا۔ وہ ہر جگہ اپنے اٹلس کا حوالہ دیتا ہے۔ خصوصاً ایک جگہ سے دوسری جگہ کی سمت اور فاصلہ کی تو اس نے پوری فہرست بھی دی ہے۔ جو موجودہ کتاب میں بھی محفوظ ہے۔

روایات کی تنقید کا جو معیار اس نے خود مقرر کیا ہے اس میں ایک دلچسپ فقرہ اس کا یہ ہے۔ عربی کے بجنسہ الفاظ ہی میں اس کا لطف کچھ زیادہ مل سکتا ہے۔ ایک روایت کی تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"لان النکر لما لا یعلم اعذر من المقر بما یجھل"

ترجمہ: نہ جاننے اور ناواقفیت کی وجہ سے کسی چیز سے انکار کرنے والے کا عذر زیادہ پذیرائی کا مستحق ہے بہ نسبت اس شخص کے جو خواہ مخواہ ان چیزوں کو مانتا چلا جاتا ہے جن سے وہ ناواقف اور جاہل ہے۔ [صفحہ ۳۳]

ناواقفیت سے نابودیت پر استدلال

منطقیوں کا مشہور فقرہ کہ "عدم العلم مستلزم علم المعدوم نہیں ہے" یعنی کسی چیز سے ناواقف ہونے کا مطلب یہ غلط ہے کہ اس چیز کے نہ ہونے کا دعویٰ کرلیا جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بجائے خود یہ بھی ایک بہترین فکری مشورہ ہے اور روشن خیال مدعیوں میں زیادہ تر اسی کا مرض پھیلا ہوا ہے۔ عموماً ان ہی چیزوں کے منکر ہیں جن سے وہ ناواقف اور جاہل ہوتے ہیں۔ اپنی ناواقفیت ہی کو وہ اس چیز کے نابود ہونے کی دلیل بنالیتے ہیں۔ جن سے وہ ناواقف ہوتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ دوسری طرف بھی ایک قسم کی وہی زیادتی پائی جاتی ہے جس کی سب سے اچھی تعبیر مجھے ابن حوقل ہی کے یہاں ملی۔ یعنی ہر مجہول اور نامعلوم شے کے مان لینے والوں سے یقیناً وہ زیادہ اچھا ہے جو یہ کہتا ہے کہ "جب تک مجھے وہ چیز معلوم نہ ہو جائے خواہ مخواہ اس کا اقرار کیوں کروں۔"

عربوں کی چاول سے واقفیت کا عجیب واقعہ

بہر حال ابن حوقل کی روشن خیالی اور سخت تنقیدی نظر کا اندازہ آپ کو اس کے مذکورۂ بالا عمل اور اصول سے ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے مسموعات نہیں بلکہ براہ راست مشاہدات کے متعلق شک کرنے یا شاعری قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ

مسلمانوں کے موجودہ اخلاف کو دیکھ کر ان کے اسلاف کے مذاق کا پتہ چلانا قطعاً ایک گمراہ کن طریقہ استدلال ہوگا۔ انہار و اشجار کے سلسلہ میں ایک چیز کا خیال آگیا۔ یعنی چاول ظاہر ہے کہ عرب چاول یا دھان سے گویا قریب قریب ناواقف ہی سے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے ارز کے لفظ سے ان کے کان ضرور آشنا تھے۔ رسول اللہ نے ''الارز'' کا ذکر اپنی ایک حدیث میں فرمایا ہے بخاری کی روایت جس میں غار میں گرفتار ہونے والے تین آدمیوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے، مگر خود چاول کو مسلمان سپاہیوں نے پہلی دفعہ جب دیکھا تو الہمذانی نے یہ عجیب لطیفہ اس کے متعلق نقل کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ:

''بصرہ جہاں پر آج کل آباد ہے، یہاں پہلے ایک جنگل تھا اور عموماً اس کو ''ارض الہند'' کہتے تھے۔ غالباً ہندوستان کے جہازوں کے ٹھہرنے کی جگہ قدیم زمانہ سے اسی جنگل کے قریب ہوگی۔ اس جنگل میں کچھ چور چھپے ہوئے تھے۔ اسلامی فوجیوں کو دیکھ کر راہ فرار اختیار کی اور دو تھیلیاں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جن میں ایک تھیلی چاول کی تھی۔ عربوں نے نئے قسم کے دانے کو دیکھ کر خیال کیا کہ شاید کوئی زہریلی چیز ہے۔ جو افسر تھا، اس نے حکم دے دیا کہ کوئی ان کو ہاتھ نہ لگائے۔ تھیلی کا منہ کھلا ہوا تھا۔ رات کو اتفاقاً کسی سپاہی کا گھوڑا کھل گیا اور اس بوری کی طرف نکل آیا جس میں چاول رکھے ہوئے تھے۔ گھوڑے نے اس میں منہ مار دیا۔ پیچھے سے اس کا مالک بھی پکڑنے کے لیے چلا آرہا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ زہر کی تھیلی میں اس کے گھوڑے نے منہ مارا ہے سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ صبح تک بے چارے کی موت یقینی ہے۔ دوسروں کو بھی اس کی خبر ہوئی اور سب اس کی موت کے انتظار میں رات گذارتے رہے۔ لیکن صبح تک دیکھا گیا کہ اس زہر کے آثار تو کیا ظاہر ہوتے بالکل بھلا چنگا تھا۔ لید بھی اچھی طرح سے ہوئی اور پیشاب بھی اس نے خوب کیا۔ تب دم

میں دم لوگوں کے آیا اور اب خیال بدلا، سمجھا گیا کہ کوئی کھانے ہی کی چیز ہے۔ پانی ڈال کر ہانڈی میں چاول کو چڑھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں پھول کی طرح کھلے ہوئے چاول ان کی نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ پھر بھی ڈرتے ڈرتے لوگوں نے ابتدائی نوالے اٹھائے۔ لیکن کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تو بڑی لذیذ غذا ہے۔ تب یقین ہوا کہ کوئی غذائی شے ہے۔" [الہمدانی، صفحہ ۱۸۸]

لیکن حال ہی میں الہلال مصر میں ایک مضمون ''الارز'' پر شائع ہوا تھا جس میں اسی چاول کی تاریخ درج کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس دانے سے واقفیت چین والوں کو حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار آٹھ سو سال پہلے ہو چکی تھی۔ چین میں اس غلہ اور اس کی کاشت کو جو اہمیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہ وقت کاشت کے وقت کھیت پر خود پہنچتا تھا اور دھان کے چند پودے اپنے ہاتھ سے بطور شگون نیک کے لگاتا، تب اس کے بعد دوسرے لوگ کام شروع کرتے تھے۔ اسی لیے سمجھا جاتا ہے کہ چاول بالکلیہ ایک مشرقی غلہ ہے اور مشرق ہی سے یہ مغرب پہنچا ہے۔ لیکن جانتے ہو مشرق سے مغرب لے جانے والے اس کے کون ہیں؟ ان ہی کی اولاد جنہوں نے پہلی دفعہ کو دیکھ کر سمجھا تھا کہ یہ کوئی زہریلی چیز ہے۔ ''الہلال'' ہی میں لکھا تھا:

''کہ سب سے پہلے اس اناج کو یورپ مسلمان لے گئے۔ انہوں نے ہی اندلس میں چاول کی کاشت کو مروج کیا اور پھر بہ تدریج دوسرے علاقوں میں بھی اس کی کاشت ہونے لگی۔'' [الہلال، مئی ۱۹۳۵ء]

اور کیا چاول ہی ایک چیز ہے جسے مسلمانوں نے ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچایا ہے، ایک طویل فہرست اس سلسلہ میں تیار ہو سکتی ہے۔

بہر حال مجھے تو صرف اس کی مثال دینی تھی کہ ابھی ابھی جس چیز سے مسلمان ڈرے تھے، افادہ کے احساس کے ساتھ اس کے مبلغ بن گئے اور زندہ قوموں کا یہی دستور ہوتا ہے، یہی

وجہ ہے جو مجھے ان مورخین کے بیانوں میں کوئی شک نہیں ہوتا، جب وہ مسلمانوں کی ان اوالعزمیوں کو بیان کرتے ہیں جو ان کے جانشینوں کو دیکھ دیکھ کر کچھ نا قابل فہم باتیں بنتی چلی جا رہی ہیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

زراعت وباغبانی میں مسلمانوں کی حیرت انگیز ترقی

روس کی تازہ دم نئی شیوعی حکومت شورائیہ کی داستانوں کے سنانے والے عموماً آج یہ سنا رہے ہیں کہ مختلف اناجوں کے پودوں کے ساتھ عمل تقلیم و تطعیم سے کام لے کر روسی، گیہوں کے ایسے پودوں کے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو مسلسل کئی سال تک اسی طرح پھلتے رہتے ہیں جیسے پھل والے درختوں میں ہر سال پھل لگتے ہیں، لیکن صدیوں پہلے بھی ابن حوقل ہمیں یہ پرانی داستان سجلماسہ کے مسلمانوں کے متعلق سناتا ہے کہ ایک قسم کا غلہ جس کے متعلق اس کے الفاظ ہیں "خلقه بين القمح والشعير" یعنی جس کی شکل وصورت گیہوں اور جو دونوں سے ملتی جلتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ان دونوں کے پودوں کی تطعیمی عمل سے یہ نتیجہ پیدا کیا گیا تھا یا کیا واقعہ تھا۔ تاہم نتیجہ اس کا جو ہوا تھا اسے ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے کہ:

"وبما زرعوا سنة ببذرو حصدوه سبع سنين بسنبل لا يشبه سنبل الحنطة ولا الشعير" [ابن حوقل، صفحہ ۶۵]

ترجمہ: بسا اوقات اس غلہ کے تخم کو ایک سال بوتے ہیں اور سات سال تک کاٹتے رہتے ہیں۔ ایسے خوشے اس کے ہوتے ہیں جو نہ گیہوں ہی کے خوشوں سے مشابہ ہیں او رنہ جو ہی سے۔

ابن حوقل جس نے خود بھی اس غلے کو استعمال کیا تھا لکھتا ہے کہ:

"ٹوٹنے میں تو یہ ذرا سخت ہوتا ہے، لیکن کھانے میں گیہوں اور جو دونوں سے زیادہ لذیذ ہے۔"

اور ابن حوقل تو چوتھی صدی ہجری کا آدمی ہے۔ تیسر صدی ہجری ہی میں مسلمانوں نے

تقلیم و تطعیم کے فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا تھا۔ مصری امیر خمارویہ کے باغ میں مقریزی نے لکھا ہے کہ دو مشمش (خوبانی) کے درخت کا بادام کے درخت سے اور بھی مختلف قسم کے پھلوں کے درختوں کی تقلیم دوسرے جنس کے درختوں سے کر کے نئے نئے پھل اس نے پیدا کیے تھے، جنہیں دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ [صفحہ ۳۱۶ ج ۱]

عمل تابیر یعنی نر درختوں کے پھول کو مادہ درختوں کے گچھوں میں منتقل کرنا، کھجور کی حد تک تو اسلام سے پہلے اس عمل کو عرب بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن ابن حوقل نے لکھا ہے کہ مغربی افریقہ میں لوگوں کو دیکھا کہ انجیر کے درختوں پر بھی اس عمل کو کرتے ہیں۔ [صفحہ ۱۲۴]

اسی نے فلسطین کے شہر زغر کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہاں کے لوگوں نے کوشش کر کے ایک قسم کھجوروں کی ایسی پیدا کر لی ہے کہ ایک ایک پھل اس کا آدھ آدھ پاؤ کا ہوتا ہے اور رنگ بالکل زعفرانی۔ [صفحہ ۱۲۴]

افریقہ کے شہر سوس کے ذکر میں اسی نے لکھا ہے کہ ایک نارنگی وہاں کی لوگوں نے ایسی برآمد کی ہے جو آدھی کف دست کی طرح چوڑی بھی ہوتی ہے اور ان میں انگلیوں کی طرح پانچ شاخیں نکلی ہوئی ہیں۔ [صفحہ ۱۷۵]

صاحب روح المعانی کے ساتھ پیش آمدہ ایک واقعہ

فن باغبانی کو مسلمانوں نے نتائج کے لحاظ سے ترقی کے کن حدود تک پہنچا دیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ حال ہی میں مشہور محدث و مفسر علامہ شہاب الدین محمود آلوسی بغدادی صاحب تفسیر روح المعانی کی چشم دید شہادت اگر مجھے نہ مل جاتی تو شاید ان قصوں پر اعتماد کرنا میرے لیے دشوار ہی تھا۔ صاحب روح المعانی جو تیرہویں صدی کے عالم ہیں، انہوں نے تفسیر لکھنے کے بعد اپنے وطن بغداد سے قسطنطنیہ کا سفر دربار خلافت میں اسی کتاب کو پیش کرنے کے لیے براہ کردستان کیا تھا۔ انہوں نے ایک مختصر سا سفرنامہ بھی "نشوۃ الشمول فی سفر اسلامبول" عربی میں لکھا ہے۔ اس سفرنامہ میں مختلف مقامات جو راستے میں ان کو ملتے گئے ہیں۔ وہاں کے بعض حالات و

خصوصیت بھی وہ درج کرتے چلے گئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں وہ آمد بھی پہنچے ہیں، وہاں ترکی گورنر کے مہمان تھے، لکھا ہے کہ گورنر صاحب کے پاس ایک دن خربزہ آیا، جس کا رنگ اوپر سے سبز تھا، اس خربزے کی کیفیت ان ہی کی زبان سے سنئے، لکھا ہے کہ:

''وہ اتنا بڑا تھا کہ دھوپ کی تمازت سے تھک کر اس کی آڑ میں اگر کوئی بیٹھ جائے تو وہ بخوبی سایہ حاصل کرسکتا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ چاک کر کے اگر اس کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے اور اندر کا مغز نکال لیا جائے تو ہر ٹکڑا اچھا خاصا حوض بن سکتا ہے۔ ایسا حوض جس میں دو قلتین کے برابر پانی سما جائے۔ اسے دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ گورنر نے میرے اس حال کو دیکھ کر حکم دیا کہ اس خربزے کو ان کے سامنے تول کر دکھاؤ تا کہ ان کے علم میں مزید اضافہ ہو۔ اور آئندہ کامل اعتماد کے ساتھ دوسروں سے اس قصے کو یہ بیان کرسکیں۔ بہرحال وہ خربزہ تولا گیا۔ تولنے والے نے اعلان کیا کہ پورے اٹھائیس حقہ (یہ وہی لفظ ہے مکہ معظمہ وغیرہ میں جسے اُگّہ کہتے ہیں۔ اس وقت مجھے پورے طور پر یاد نہیں رہا کہ سیر کے حساب سے اگہ کا وزن کتنا ہے غالباً ایک سیر یا پون سیر کے مساوی ہے) اس کا وزن ہے۔ اس پر مفتی صاحب جو وہیں بیٹھے ہوئے تھے، بولے کہ میں نے بھی ایک خربزے کو تولا تھا تو بارہ حقے وہ اس خربزے سے زیادہ تھا۔ ان ہی مفتی صاحب نے یہ بھی کہا کہ میں نے زرد رنگ والے خربزے کو بھی تول کر دیکھا ہے تو وہ تیس حقے کے برابر تھا۔ اس پر احمد آفندی نے کہا کہ میں نے دس سال پہلے ایک خربزہ دیکھا تھا جو ایک بڑے مضبوط اونٹ پر لدا ہوا تھا اور وہی تنہا اس اونٹ کا کافی بوجھ تھا۔''

[نشوۃ الشمول صفحہ ۹۲]

علامہ آلوسی نے اس کے بعد لکھا ہے کہ لوگ جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا

کہ وزن ہی نہیں، بلکہ مزے میں بھی آمد کے خربزے ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر اپنا تجربہ یہ بیان کیا ہے کہ چکھنے کے بعد واقعی مصری کی ڈلی اس کے سامنے شرمندہ تھی۔ آلوسی کی اسی عینی شہادت کو پڑھنے کے بعد الہمدانی کی اس روایت کے جھٹلانے کی جرأت مجھ میں باقی نہیں رہی۔ یعنی اس نے لکھا ہے کہ ہارون الرشید کے پاس یمن سے حج کے موقع پر انگور کے دو خوشے آئے تھے جو اتنے بڑے بڑے تھے کہ ایک خوشہ ایک طرف اور دوسرا خوشہ دوسری طرف اونٹ پر لدا ہوا تھا۔ [الہمدانی صفحہ ۱۲۵]

اگر آلوسی کا بیان واقعہ ہے تو ابن حوقل کے اس بیان میں کیوں شک کیا جائے۔ یعنی تونس میں برشک نامی جگہ میں ناشپاتیاں جنہیں "سفرجل معنق" کہتے ہیں یعنی گردن رکھنے والی ناشپاتیاں چھوٹے کدو کے برابر بک رہی تھیں۔ [صفحہ ۵۲]

شاید آج کل جن ناشپاتیوں کو "بگو گوشہ" کہتے ہیں جو ایک فرانسیسی لفظ ہے۔ غالباً اسی قسم کی ناشپاتیوں کی طرف اشارہ ہے، لیکن چھوٹے کدو نہ سہی، کدو کے برابر ناشپاتی؟ بہرحال اس سلسلہ میں ان لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے "نمونے" کے لیے شاید یہ چند مثالیں کافی ہوسکتی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کی پیداواروں میں مقامی خصوصیتوں کو بھی دخل ہوا کرتا ہے۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ جن مقامات میں جن چیزوں کی پیدا ہونے کی کافی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ ان سے بھی تو لوگ نفع نہیں اٹھاتے۔ آخر یہی مسلمان تو تھے، یہی ہندوستان تو تھا، سلاطین اور بڑے بڑے نوابوں کو جانے دیجیے۔ شاہجہاں عہد کا مشہور کیرانوی جراح جو حسو جراح کے نام سے مشہور تھا، اصلی نام شیخ حسن تھا۔ کیرانہ میں جو باغ اس جراح نے لگایا تھا، کہتے ہیں کہ پستہ جیسے نازک درخت تک اگانے اور سرسبز کرنے میں اسی ہندوستان میں وہ کامیاب ہوا تھا۔ ماثر الامراء میں ہے کہ:

"باغ یک صد و چهل بیگه را دیوار پخته کشید و حوضے بذراع دو صد و بیست در دو صد بوسط انداخت و اشجار گرم سیر، و سرد سیر هر دو نشاند، گویند نهالِ پسته آنجا سرسبز شد و انبهٔ خوب

ھر جا کہ شنید از گجرات و دکن تخم آں آوردہ کاشت "

[مآثر الامراء صفحہ ۳۸۱]

ترجمہ:ایک سو چالیس بیگہ میں اسی جراح نے باغ لگایا تھا اور پورا باغ چار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ باغ کے بیچ میں ایک حوض بھی بنوایا تھا جو دو سو بیس گز لمبا اور دو سو گز چوڑا تھا۔ گرم اور سرد دونوں قسم کے ممالک کے درخت اس باغ میں لگائے گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ پستہ کا درخت بھی اس باغ میں سرسبز ہوا تھا اور آم کے متعلق تو یہ حال تھا کہ دکن اور گجرات تک سے تخم منگوا کر نصب کیے گئے۔ جہاں کہیں اچھے آم کی خبر ہوتی منگوایا جاتا۔

ایک عامی آدمی جب اتنی اولوالعزمی دکھا سکتا تھا تو اسلامی سلاطین کے متعلق ایسی باغبانی کے جو قصے تاریخوں میں نقل کیے جاتے ہیں۔ ان پر حیرت نہ ہونی چاہیے۔ محمود بیگڑھ گجراتی بادشاہ کے حال میں لکھا ہے کہ سابرمتی ندی کے ساحل پر بیس میل لمبا آموں کے باغ اس نے لگایا تھا۔ اور سلاطین کے ان قصوں کے دہرانے کے لیے دفتر چاہیے۔ ابن طولون امیر مصر کے بیٹے خمارویہ جو تیسری صدی ہجری میں باپ کے بعد مصر کا گورنر وامیر تھا۔ مقریزی نے لکھا ہے کہ اپنے باغ میں سارے جہان کے پھلوں اور پھولوں کے اگانے کی اس نے کوشش کی تھی۔ صرف کھجوروں کے سلسلہ میں ایک قسم ایسے درختوں کی تھی جن کا قد جوان ہونے اور پھلنے پھولنے کے بعد بھی اتنا اونچا ہوتا تھا کہ بیٹھے بیٹھے آدمی ان کے پھلوں کو ہاتھ سے توڑ سکتا تھا۔ کھجور کے ان درختوں کے تنوں پر اس نے سونے کے ملمع کیے ہوئے تانبے کے خول چڑھوا دیے تھے، جن کے اندر سیسے کی نالیاں لگی ہوئی تھیں۔ پانی ان ہی اندرونی نالیوں میں چڑھایا جاتا تھا اور اوپر پہنچ کر وہی پانی پھر باہر کی طرف ابلتا تھا۔ سارے باغ کی سیرابی اسی طریقے سے ہوتی تھی۔ اس باغ میں وہ زعفران کی کاشت کرانے میں بھی کامیاب ہوا تھا۔ پھولوں کا چمن ایک خاص نظام کے تحت لگایا گیا تھا۔ یعنی ایسی ترتیب قائم کی گئی تھی۔ جس سے مختلف نام ان پھولوں کی اس ترتب سے بن جاتے تھے یا مختلف قسم کے نقوش قائم ہو جاتے تھے۔ مالی ان کی پنکھڑیوں اور پتوں کو ہموار رکھنے کی ہمیشہ نگرانی کرتے رہتے تھے۔ باغ کے تالابوں میں سرخ، زرد، نیلگوں، الغرض مختلف رنگ

کے نیلوفر پھیلا دیئے گئے تھے۔ [تفصیل کے لیے دیکھو مقریزی صفحہ ۱۱۲ ج ا]

اشیاء کی ارزانی اور عام فراغ بالی

کرمان جو تمام ایران میں اپنی خشکی اور زمین کی خرابی کی وجہ سے بہت زیادہ بدنام ہے، لیکن ابن حوقل نے لکھا ہے کہ ہم جس زمانہ میں وہاں پہنچے تو کھجور جو زیادہ تر عرب اور عرب کے گردونواح کا درخت ہے، اس کی اتنی کثرت اس علاقے میں دیکھی کہ بسا اوقات ایک ایک درہم میں سو سو من تک کھجور وہاں بک جاتی ہیں۔ من سے ہندوستانی من مراد نہیں ہے بلکہ وہ اس سے کچھ علیحدہ ہی وزن ہے مختلف علاقوں میں اس کی نوعیت مختلف تھی، لیکن سیر ہی سمجھ لیجئے ایک درہم میں سو سیر کھجور۔ لطیفہ یہ لکھا ہے کہ خود درختوں سے ہوا کے جھونکے سے جو پھل گر جاتے ہیں، دستور وہاں کا یہ ہے کہ مالک باغ اس کے لینے سے کسی کو روک نہیں سکتا۔ نتیجہ اس کا کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ:

"ربما کثرت الریح فیصیرالی الضعفاء والمساکین التمور فی التقاطهم اکثر مما یصیر الی اربابه" . [ابن حوقل صفحہ ۲۲۴]

ترجمہ: بسا اوقات آندھی جب کسی موسم میں زیادہ چلتی ہے تو غریبوں اور مسکینوں کے گھر اس سے زیادہ کھجور پہنچ جاتی ہیں۔ جتنی ان کے مالکوں کو بھی نہیں ملتیں۔

ارزانی اشیاء کی کثرت و بہتات، یہ تو خیر اس زمانہ کے لحاظ سے شاید قابل ذکر بھی نہیں ہے۔ لوگوں نے کثرت سے اس کے چرچے بھی دیئے ہیں۔ ابن حوقل ہی نے لکھا ہے کہ آذر بائیجان کے علاقہ میں ایک درہم میں پچاس روٹیاں و نصف من گوشت بھی ایک ہی درہم میں۔ بلکہ:

"والعسل والسمن والمن والجوز والزبیب وجمیع الماکول رخیص کالمجان" [صفحہ ۲۳۸]

ترجمہ: شہد، گھی، من، اخروٹ، کشمش، الغرض کھانے پینے کی ساری چیزیں اتنی ارزاں ہیں کہ گویا مفت مل جاتی ہیں۔

اسی نے لکھا ہے کہ تفلیس میں تو ارزانی کا یہ حال ہے کہ بیس بیس سال رطل شہد خالص وہاں ایک ایک درہم میں مل جاتا ہے۔ [صفحہ ۲۴۲]

واقعہ یہ ہے کہ کم از کم کھانے پینے کی چیزوں کی ارزانی کا حال مسلمانوں کے عہد میں تقریباً ان کے اکثر ممالک میں جو رہا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔

لیکن باوجود اس کے تعجب اس پر ہے کہ ان ہی بیان کرنے والوں کی زبانی روپے یعنی درہم و دینار کی کثرت کے قصے بھی جو ہم سنتے ہیں، وہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہیں۔

میرا اشارہ اس دولت اور ثروت کی طرف نہیں ہے جو حکومت کے خزانے میں جمع ہوتی تھی، بلکہ عوام، تجارت و صنعت و زراعت وغیرہ کے ذریعہ سے جو کماتے تھے، اس کا اندازہ ابن حوقل ہی کی ان گواہیوں سے ہوسکتا ہے۔ ایک طرف وہ مغربی افریقہ کے آخری حدود یعنی بادغشت جو سجلماسہ سے بھی دو مہینے کے فاصلہ پر ہے، اسی کے متعلق ابن حوقل کا بیان ہے کہ:

"رأیت صکا کتب بدین علی محمدبن ابی سعدون باودغشت و شهد علیه العدول باثنین و اربعین الف دینار" [ابن حوقل، صفحہ ۴۲]

ترجمہ: میں نے ایک چک بادغشت میں دیکھا۔ محمد بن ابی سعدون کے قرض کے متعلق تھا۔ جس پر عادل گواہوں کی گواہیاں ثبت تھیں۔ رقم جو چک میں مندرج تھیں اسی کی تعداد (۴۲) ہزار اشرفیاں تھیں۔

یہ ایک معمولی قرضہ کا چک ہے۔ بیالیس ہزار دینار (اشرفی) اب اس کو چاندی کے سکے پر حساب کر کے دیکھئے۔ وہی مان لیا جائے جیسا کہ اندلس وغیرہ میں تھا۔ یعنی سترہ درہم کا ایک دینار ہوتا تھا۔ جب بھی یہ کیا معمولی رقم ہے جس کا خیال ہے کہ سود کے بغیر قرض کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ ان کو دیکھنا چاہئے کہ اتنی بڑی بڑی رقمیں بھی بغیر سود کے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دے دیا کرتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ آخرت کا یقین اگر قلوب میں ایسی استواری حاصل کرلے کہ اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی چیزوں اور ان چیزوں میں جنہیں صرف پیغمبر کی آنکھوں کی راہ سے آدمی دیکھ رہا ہے، دونوں میں فرق باقی نہ رہے تو پھر یہ کہنا ہی غلط ہے کہ سود کے بغیر قرض دینے

والا بغیر سود کی توقع کے قرض دے رہا ہے۔ بلکہ بغیر سودی والے قرض پر جس سود کی توقع دلائی گئی ہے وہ سود والے قرض کے منافع سے یقیناً زیادہ محفوظ اور زیادہ قطعی ہے۔ بات صرف طے کرنے کی محض اس قدر ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ پہنچایا ہے خدا ہی کی طرف سے پہنچایا ہے۔

بہر حال یہ تو خیر ایک ضمنی سی بات تھی، میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اشیاء کی ارزانیوں کے باوجود حیرت ہوتی ہے کہ روپیہ بھی اتنا سستا اس زمانہ میں کیسے تھا۔ مغرب کا حال وہ ہے اور مشرق کا یہ ہے۔

ابن حوقل ہی کا بیان ہے، سیراف جو ایران کا قدیم تجارتی بندرگاہ تھا، اس کے تذکرے میں اس نے وہاں کے ایک سوداگر کے متعلق لکھا ہے کہ:

"اوصی ثلث ماله الحاضر عنده الف الف دینار"

ترجمہ: اپنے اس مال کے ثلث کی اس نے وصیت کی جو اس کے پاس موجود تھا۔ اور یہ ثلث مال دس لاکھ اشرفیوں کی شکل میں تھا۔ یعنی ایک ملین اشرفی۔ [ابن حوقل صفحہ ۱۹۸]

جس کی ثروت کا ایک تہائی ایک ملین پونڈ تھا۔ اسی سے حساب کر لیجئے کہ اصل ثروت کی مقدار کتنی ہوگی؟ اور یہ ایک تہائی تو صرف اس ثروت کی تھی جو اس کے پاس وصیت کے وقت موجود تھی۔ باقی اس کے سوا جیسا کہ ابن حوقل ہی نے اس کے بعد لکھا ہے کہ:

"اور مضاربت پر لوگوں کو اس نے جو دے رکھا تھا وہ الگ سرمایہ تھا۔ جو اس رقم کے سوا ہے۔"

سرمایہ ایک کا ہو اور محنت دوسرے کی ہو۔ تجارت کے اس طریقہ کا نام "مضاربت" ہے۔ ضروری نہیں کہ "سرمایہ" ایک ہی آدمی سے لیا جائے یا محنت کرنے والا بھی ایک ہی ہو۔ بلکہ دونوں طرف شرکت کا طریقہ اختیار کر کے بھی اس معاملہ کو کیا جا سکتا ہے جو اس زمانہ میں کیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے موجودہ کمپنیوں کی صورت گویا پیدا ہو گئی تھی۔ سرمایہ داروں کے پسماندہ سرمایہ کے استعمال کی یہ ایک ایسی راہ تھی کہ جس میں سرمایہ دار نفع کے ساتھ نقصان میں بھی محنت کرنے

والوں کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ اسی لیے سودخوری کی وجہ سے جو نتائج آج پیدا ہو گئے ہیں، وہ اسلامی عہد میں نہیں پیدا ہوئے تھے۔

ایک اور دلچسپ لطیفہ اسی کتاب میں عدن کے ایک تاجر کا ہے۔ اس کا نام ''رامشت'' بتایا گیا ہے۔ اس کے لڑکے موسیٰ سے ملاقات ہوئی تو لکھا ہے کہ:

''نقرئی آلات جو موسیٰ کے زیر استعمال تھے، ایک دفعہ تولے گئے تو ایک ہزار دوسو من وزن ان کا ٹھہرا۔''

حالانکہ رامشت کا موسیٰ سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ اور نسبتاً اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں اس کی حیثیت گری ہوئی تھی۔ اسی رامشت کے ایک منشی جس کا نام علی نیلی بتایا ہے اس کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

''آج سے بیس سال پہلے چین سے مال بیچ کر ہم جب لوٹے تو جو کچھ مجھ کو ملا تھا، وہ پانچ لاکھ دینار کی پونجی تھی۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۱۹۸]

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خود اصل مالک رامشت کی دولت کتنی ہوگی اور یہ کوئی دو تاجروں کی استثنائی حالت تھی؟

ابن حوقل نے سیراف کے عام تاجروں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ان الرجل من التجار لینفق علی داره زیادة علی ثلاثین الف دینار" [ابن حوقل، صفحہ ۱۹۸]

ترجمہ: عموماً یہاں کے تجار اپنے مکانوں پر جتنی رقم صرف کرتے ہیں، ان کی تعداد تیس ہزار اشرفیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔

افسوس ہے کہ حکومت اور حکومت سے تعلق رکھنے والوں کی دولت وثروت کا تو کتابوں میں عموماً تذکرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن عہد اسلامی میں حکومت والوں کے سوا عام آبادی کا مالی لحاظ سے کیا حال تھا؟ لوگوں نے اس کی طرف کم توجہ کی ہے۔ اسی لیے عموماً ایک احساس اس قسم کا پایا جاتا ہے بلکہ بعضوں کو تو کہتے ہوئے بھی دیکھا ہے کہ اسلامی عہد کی ارزانیوں کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت

روپیہ کی صورت دیکھنے کے لیے عوام ترستے تھے۔ گزشتہ چند معمولی مثالیں صرف ابن حوقل کی کتاب سے میں نے پیش کی ہیں۔ تفصیل اس وقت میرے سامنے بھی نہیں ہے۔ یہ ایک مستقل بحث کا موضوع ہے۔ ہندوستان تک کی تاریخوں میں لوگوں کو ملے گا کہ ایک تاجر لاکھوں بلکہ کروڑوں کا بندوبست کر سکتا تھا۔

مشہور واقعہ ہے کہ سورت کے ملا عبدالغفور جو عالمگیری عہد کے تاجر ہیں، ان کا سرمایہ کروڑوں روپیہ سے متجاوز تھا۔ [دیکھو مآثر الامراء صفحہ ۳۳۸ ج ا]

عالمگیر کا لڑکا مراد بخش جو گجرات کا گورنر تھا، اس کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ حاجی پیر محمد زاہد علی سے ایک دفعہ چھ لاکھ قرض شہزادے نے لیا۔ اس قسم کے جزئیات اگر جمع کیے جائیں تو ان سے عوام کی ثروت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ آج ہندوستان میں مسلمان جو آباد ہیں، اگر یہ صحیح ہے کہ غوری نے امام رازی سے روپیہ قرض لے کر ہندوستان پر چڑھائی کا سامان کیا تھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک عام مسلمان ہی کی دولت کے طفیل میں ہندوستان فتح ہوا۔ کیونکہ امام رازی کے پاس جیسا کہ سبھوں نے بالاتفاق لکھا ہے۔ رے شہر کے ایک طبیب کی دولت اس راہ سے پہنچی تھی کہ طبیب جو اولاد نرینہ سے محروم تھا اس نے امام صاحب کے لڑکوں سے اپنی لڑکیوں کی شادی کر دی تھی اور جو کچھ کمایا تھا وہ اپنے دامادوں کے حوالہ کر دیا تھا۔ غوری نے امام صاحب سے یہی روپیہ ہندوستان پر غالباً آخری دفعہ چڑھائی کے وقت قرض لیا تھا۔ جس میں اسے کامیابی نصیب ہوئی، اس کا پتہ تو نہ چلا کہ یہ کتنا روپیہ تھا۔ لیکن ایک فوجی مہم اور وہ بھی آخری فیصلہ کن مہم کے لیے قرض کیا دس بیس روپیہ لیا جا سکتا ہے؟

کامل ابن اثیر میں بصرے کے ایک تاجر جس کا نام شریف عمر تھا، اس کے تذکرہ میں میں لکھا ہے کہ ان کی سالانہ آمدنی تجارت سے دو کروڑ پچاس لاکھ درہم تھی۔ [صفحہ ۳ ج ۹]

الفخری نے ایک طحان (چکی پیسنے والا) کے متعلق لکھا ہے کہ پہلے بصرے میں رہتا تھا۔ معتصم باللہ کے زمانہ میں بغداد چلا آیا۔ یہاں کاروبار میں اس کے اتنا فروغ ہوا کہ ایک سو دینار

(اشرفی) روزانہ زکوۃ کی مد میں خیرات کیا کرتا تھا۔ [صفحہ ۲۱۳]

عباسی خلفاء کے عہد میں جوہریوں کی ایک طویل فہرست کتابوں میں ملتی ہے۔ ان ہی جوہریوں میں الجصاص جوہری بھی تھا۔ مقتدر باللہ ایک دفعہ اس سے خفا ہو گیا اور حکم دیا کہ اس کی دولت کا جائزہ لیا جائے۔ لکھا ہے کہ صرف اشرفیاں ایک کروڑ آٹھ لاکھ برآمد ہوئیں۔ ماسوائے اس کے دوسری قسم کی جائیدادیں مثلاً مکانات، گاؤں، گھر کا ساز و سامان یہ چیزیں نقد دولت سے الگ تھیں اور عباسیوں یا امویوں کے دور کو جانے دیجئے۔

خود عہد نبوت اور خلافت راشدہ میں عوام میں دولت مندوں کی کیا کمی تھی۔ مشہور صحابی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ جو اپنی خیر و خیرات کی وجہ سے "الفیاض" کے لقب سے مشہور تھے، لیکن باوجود ان فیاضیوں کے وفات کے بعد جو دولت چھوڑی تھی اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ خزانچی کے پاس بارہ لاکھ درہم نقد موجود تھے۔ جائیداد جو چھوڑی تھی اس کی قیمت تین کروڑ لگائی گئی تھی۔ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وفات کے بعد تین بھار سونا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے خزانے سے برآمد ہوگا۔ بھار گائے کی کھال کو کہتے ہیں۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی ثروت کا قصہ مشہور ہے۔ وفات کے بعد سونے کے ڈلے جب ان کی بیویوں میں تقسیم ہونے لگے تو کاٹنے والوں کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے۔ چار بیویوں میں سے ہر ہر بیوی کو اسی اسی ہزار اشرفیاں ملیں۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی دولت کا اندازہ موجودہ حسابی اصطلاح میں ۳۵ ہزار ملین کی گئی ہے اور عموماً ان لوگوں کے پاس یہ سرمایہ کاروبار یعنی تجارت و زراعت ہی سے اکٹھا ہوا تھا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے تو صراحتہ منقول ہے کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے سب تجارت اور بیوپار سے حاصل ہوا ہے۔ کاشت بھی مختلف مقامات میں کرتے تھے۔ صرف مدینہ منورہ کے کھیتوں اور باغوں کی سیرابی کے لیے بیس اونٹ کام کرتے تھے۔ مدینہ میں گیہوں کی کاشت کی ابتداء آپ ہی نے کی۔ عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تجارت و زراعت اور دوسرے معاشی کاروبار کا قصہ طویل ہے۔

صحابہ کے بعد بھی زمانہ تک مسلمانوں کے اندر تجارتی اولوالعزمیوں کے جس جذبہ کو ہم پاتے ہیں، جس پیمانہ پر اسلامی عہد کے ان شاداب دنوں میں تجارتی کاروبار ہورہا تھا، اس کے لحاظ سے عوام کی مذکورہ دولت وثروت میں شک کرنے کی کوئی وجہ بھی معلوم نہیں ہوتی۔ ابن حوقل نے یہ بیان کرتے ہوئے کہ اردبیل سے مراغہ جانے والوں کو کن کن منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے، ایک منزل کا نام کورسرہ بتایا ہے۔ لکھا ہے کہ وہاں ایک قصر عظیم بڑے قلعہ کے اندر ہے۔ پھر یہ کہتے ہوئے کہ اس کور (ضلع) میں کتنی رساتیق (سب ڈویژن) ہیں، لکھا ہے کہ اس علاقہ میں سالانہ چند میلے چاند کی ابتدائی تاریخوں میں لگتے ہیں۔ آگے یہ بیان کر کے کہ:

"وقد ادرکتھا قدما ودخلتھا وانا حدث" [ابن حوقل، صفحہ ۲۵۲]

ترجمہ: بہت زمانہ ہوا، ان میلوں میں، میں بھی شریک ہوا ہوں۔ جب نوعمر تھا۔

اس میلہ کی تشریح جن الفاظ میں اس نے کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

"ان میلوں میں طرح طرح کے لوگ جو مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں، شریک ہوتے ہیں۔ جن کے پاس مختلف قسم کے تجارتی سازوسامان ہوتے ہیں۔ مثلاً کپڑے، عطر، سرکہ، روشنی کے سامانوں کو بیچنے والے، ٹھٹھیرے، سونا، چاندی، گھوڑے، خچر، گدھے، گائے، بیل، بھیڑ، بکریاں وغیرہ۔

پھر اس کے بعد لکھتا ہے:

"جس زمین اور جس علاقے میں یہ میلہ لگتا ہے اور اس کی نشیبی زمینوں، اس کے ٹیلوں، اس کے پہاڑوں پر جو مخلوق اکٹھی ہوتی ہے اس کو دیکھ کر حج کے موسم کا موقف یاد آجاتا ہے، بلکہ جو جو چیزیں اس میلے میں جمع ہوتی ہیں اور جتنے علاقے کو وہ گھیرتی ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے تو کہا جاسکتا ہے کہ عرفات کے میلے سے بھی یہ میلہ بڑا ہوتا ہے۔ حالانکہ خود عرفات کا میدان جس میں حج کے موسم میں یمن، مصر، عراق، مغرب اقصے، شام، خراسان اور جو جو علاقے ان

مقامات سے ملے ہوئے ہیں، وہاں کے لوگ تین فرسخ (یعنی نو میل کے طول و عرض میں) پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔''

پھر کورسرہ کے اس میلہ میں جس پیمانہ پر کاروبار ہوتا ہے بطور مثال کے اس نے ذکر کیا ہے کہ صرف ایک تاجر ابو اسحاق ماجروانی کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ دو لاکھ جانور تو اس کے اس میلے میں ایک سال بکے تھے۔ ابن حوقل کا بیان ہے کہ میں نے ابو محمد عبدالرحمن ابن السری سے پوچھا کہ کیا یہ واقعہ ہے؟ تو انہوں نے اس کی توثیق کی اور کہا کہ اس بے چارے کا انتقال ہو گیا۔ پھر بیان کیا کہ اسی میلے میں اس نے کبھی دس دس لاکھ بھیڑ بکریاں فروخت کی ہیں، میں نے کہا کہ دس لاکھ؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں، دس لاکھ! بلکہ اضافہ کیا کہ دوسرا تاجر جس کا نام شعیب بن مہران تھا، اس نے بھی اسی قدر جانور فروخت کیے تھے۔ آخر میں خود ابن حوقل نے لکھا ہے کہ:

''اس میلے کے متعلق اور بھی واقعات بعد کو مجھے معلوم ہوتے رہے، لیکن ان چیزوں کی تفصیل میری اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔ واقعہ کے اندازے کے لیے صرف اتنی بات بھی کافی ہے۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۱۵۳]

اور یہ تو ایک نمونہ مشرقی ممالک کی تجارت کا تھا۔ یہی ابن حوقل مغرب کا چشم دید حال ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ یعنی مصر سے نکل کر آدمی جب صحرائے لیبیا کی طرف روانہ ہوتا ہے تو یہ لکھ کر سب سے پہلے جو بڑا شہر اس کے سامنے آتا ہے وہ برقہ ہے اور برقہ سے قیروان کو راستہ جاتا ہے۔ بہر حال مغربی افریقہ کی اس پہلی منزل کی کیفیت یہ تھی:

''اس شہر برقہ میں بکثرت تمہیں تاجر اور دوسرے ممالک کے لوگ ہر وقت اور ہر زمان میں نظر آئیں گے۔ ان لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ کسی وقت بھی منقطع نہیں ہوتا۔ اور یہ سب کے سب بیوپار کی غرض سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ قافلوں پر قافلے تمہیں اس حال میں ملیں گے کہ ان میں کوئی مشرق سے مغرب کی طرف جا رہا ہے۔ کوئی مغرب سے مشرق کی طرف آ رہا ہے اور اس کی وجہ

یہ ہے کہ یہی وہ مرکزی مقام ہے جہاں اوجلہ سے چرم اور کھجور وغیرہ کھنچ کر
آتے ہیں۔ اس شہر میں متعدد بازار اور میلے ہیں جو ہر وقت گرم رہتے ہیں۔
ان میں اون، سیاہ مرچ، شہد، موم، روغن زیتون اور طرح طرح کی چیزیں
مشرقی اور مغربی ممالک میں آتی جاتی رہتی ہیں۔" [ابن حوقل صفحہ ۴۴]

اور اگر ابن حوقل کا یہ کوئی گھڑا ہوا لطیفہ نہیں بلکہ واقعہ ہے تو عہد اسلامی کے تجارتی ولولوں اور اس راہ کے بلند حوصلوں کا کوئی ٹھکانہ ہے، مطلب یہ ہے کہ سیراف جس کے متعلق گذر چکا کہ ایران کی قدیم بندرگاہ ہے، اسی شہر کی تجارت اور اس کے تاجروں کا حال بیان کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ میں بجنسہ اس کے الفاظ ہی نقل کر دیتا ہوں کہ:

"ولقد بلغنی ان رجلاً من سیراف الف البحر حتی انه لم یخرج من السفینة نحو اربعین سنة وکان اذا قارب البر اخرج صاحبه فقضی حوائجه فی کل مدینة یتحول من سفینة الی اخری اذا انکسرت واحتیج الی اصلاحها"

ترجمہ: مجھے معلوم ہوا ہے کہ سیراف کے ایک آدمی (تاجر) کو سمندر سے اتنا انس ہوگیا تھا کہ جہاز سے چالیس سال تک اس نے باہر قدم ہی نہیں رکھا۔ جب خشکی (یعنی کسی سمندر کے ساحل پر) پہنچتا تھا تو اپنے کسی ساتھی کو وہاں بھیج دیا کرتا تھا جو تمام ضروریات کی تکمیل ہر شہر میں کر دیتا تھا اور کوئی جہاز اگر ٹوٹ جاتا یا مرمت کے قابل ہو جاتا تو دوسرے جہاز پر منتقل ہو جاتا۔ (لیکن خشکی پر اترتا نہیں تھا)۔ [صفحہ ۲۰۶]

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اس نے لکھا ہے کہ:

"ان ہی تجارتی اولوالعزمیوں کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ بڑے دولت مند ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مسافرت کی زندگی کو خوب برداشت کرتے ہیں۔ یہی راز ہے اس بات کا کہ جہاں کہیں یہ ہوں وہاں بڑی فراغ بالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

پھر سیراف کے ایک لکھ پتی کا ذکر کیا ہے۔ جس کا نام ابوا بکر احمد بن عمر السیر افی تھا۔ بڑا طویل قصہ اس کا نقل کیا ہے کہ وہ بصرے میں تھا۔ اس کے کسی دوست کا خط لے کر ابن حوقل اس سے بصرے میں کسی ضرورت سے ملا۔ خط لے کر اس نے پڑھا بھی نہیں، صرف زبانی پوچھنے لگا کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے اور قبل اس کے کہ ابن حوقل اپنی بات پوری کرے "اقبل علی خدمہ وذکر مراکبہ وحالہ" (اپنے نوکروں کی طرف متوجہ ہو کر جہازوں کا حال دریافت کرنا شروع کیا)۔

ابن حوقل نے لکھا ہے کہ اس کا یہ متکبرانہ طرزِ عمل مجھے سخت ناگوار گذرا اور اسی وقت اٹھ کر باہر نکل آیا۔ اس کا بیان ہے کہ غصے کے مارے مجھے یہ بھی سوجھ نہیں رہا تھا کہ میں کہا جا رہا ہوں اور میرے سامنے کیا ہے۔ اس کے بعد طویل قصہ ہے کہ تاجر نے مجھے جب نہیں پایا تو نوکروں سے پوچھا۔ لوگوں نے کہا کہ وہ تو غصہ میں چلا گیا۔ آدمی دوڑا کر مجھے واپس بلایا وغیرہ وغیرہ۔ دراصل عام طور پر تاجروں، خصوصاً سیراف کے تاجروں کے متعلق اس کے قلم سے یہ جملہ جو نکل گیا ہے کہ:

"اما تجارهم فالغالب عليهم محبة الجمع للمال والحرص فوق من سواهم من اهل الامصار" [ابن حوقل، صفحہ ۲۰۶]

ترجمہ: سیراف کے تاجروں پر بہ نسبت دوسروں کے مال کی محبت زیادہ غالب ہے۔

دراصل اس کی وجہ احمد بن عمر تاجر کی شاید یہی بے اعتنائی ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ آج جب مسلمان اپنی حکومت اور حکومت کی آمدنی کھو چکے ہیں، خصوصاً ہندوستان میں جتنے بھی اسلامی اور دینی کام انجام پا رہے ہیں عموماً ان ہی مسلمان تاجروں کی سخاوت و سیر چشمی کے رہین منت ہیں۔ میں تو ان اسلامی تاجروں کو اس زمانہ میں "عزة الاسلام والمسلمین" کے لقب سے ملقب کرتا ہوں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ آج ہی نہیں، مسلمانوں کے عام لوگوں کا خوش حال طبقہ جن میں زیادہ تر تاجروں ہی کی جماعت تھی، ان کا یہی حال تھا۔

خود ابن حوقل نے مختلف ممالک کے حالات جو بیان کیے ہیں بطور مثال کے ان نمونوں کو بھی دیکھ لیجئے۔ اسی راستہ کے تذکرے میں جو مصر سے قیروان کو جاتا تھا، برقہ کی منزل کے بعد اس نے اس مرحوم طرابلس الغرب کا ذکر کیا، جس سے ان حالیہ شکنجوں کی ابتداء مسلمانوں پر شروع ہوئی ہے۔ جن سے بیسویں صدی عیسوی میں مسلسل ہم گذر رہے ہیں۔ یہ لکھ کر کہ:

''سفید پتھروں سے بنا ہوا یہ شہر ساحل سمندر کے کنارے بڑا شہر ہے، بازار بھی اس کے وسیع ہیں۔ برقہ سے اس کی بلندی کچھ کم ہے۔ یہاں بعض خاص قسم کے لذیذ فواکہ بھی ملتے ہیں۔ مثلاً امرود اور فرسک (ایک قسم کے نرم چھلکے کا شفتالو) اگر چہ کم ہوتے ہیں، لیکن لذت و شیرینی میں ان کی نظیر کم دیکھنے میں آئی ہے۔''

یہ بھی لکھا ہے کہ:

''یہاں کے بازار میں قیمتی اون اور بہترین لباس جو نفوسیہ کہلاتے ہیں اور نیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح سیاہ جبے جن کی کافی قیمت ہوتی ہے اور اسی قسم کی چیزیں ان جہازوں سے اترتی ہیں، جو یہاں شب و روز لنگر انداز ہوتے ہیں اور صبح و شام تجارت کا یہی قصہ یہاں جاری رہتا ہے۔ روم اور مغربی افریقہ سے مال یہاں آتا ہے جو مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔''

پھر طرابلس کے باشندوں کی کچھ خصوصیات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہ:

''ان لوگوں میں جو ان کے گرد و نواح میں رہتے ہیں، شہر طرابلس کے باشندے عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ خصوصاً ان کا رہن سہن، لباس، حسن صورت اور شریفانہ معتدل زندگی، خاص امتیاز رکھتی ہے۔''

مسلمانوں کی مہمان نوازی اور تعمیری مذاق کی خصوصیات

آخر میں مسافروں اور پردیسی تاجروں کے ساتھ مروت کا جو سلوک ان لوگوں کی طرف سے ہوتا تھا، اس کو بیان کرتے ہوئے ابن حوقل لکھتا ہے کہ:

''ان لوگوں کا برتاؤ دوسروں کے ساتھ بڑا اچھا ہے۔ دل ان کے نرم اور محبت سے بھرے ہوئے ہیں۔ نیتیں ان کی پاک وصاف ستھری ہیں۔ سمجھ درست اور سلجھی ہوئی ہیں۔ جسمانی صحت بھی ان کی قابل رشک ہے۔ لوگوں سے جو معاملہ کرتے ہیں اس میں ان کی ہمیشہ تعریف ہی کی جاتی ہے۔ حکومت کے ساتھ بھی ان کا تعلق امن پسندانہ ہے۔ مسافروں اور پردیسیوں کے ساتھ تو ان کا برتاؤ اتنا اچھا ہے کہ مشکل ہی سے کسی دوسرے شہر کی لوگ اس باب میں ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ سرائیں بھی ان کے شہر اور علاقہ میں بکثرت ہیں۔''

پھر مسافرنوازی کی سلسلہ میں انکے طریقہ خاص کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے کہ:

''جب ان کی بندرگاہ پر جہاز پہنچتے ہیں تو اس علاقہ میں تیز وتند ہوائیں چونکہ چلتی رہتی ہیں اس لئے سمندر میں بڑا تلاطم رہتا ہے، جہاز کہاں پر لنگر انداز ہوں؟ اس کے فیصلہ میں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔ لیکن شہر والوں کا قاعدہ ہے کہ جوں ہی کسی جہاز پر نظر پڑتی ہے فوراً اپنی اپنی کشتیوں اور جہازوں کو لنگر دینے کے لئے جن رسوں کی ضرورت ہوتی ہے لے کر پہنچ جاتے ہیں اور یہ معاملہ کسی معاوضہ کی توقع پر نہیں کرتے، بلکہ رضا کارانہ طور پر ایک رواج ہے جو اس علاقہ میں جاری ہوگیا ہے اور فوراً ہی رسوں کو پھینک کر چند لمحوں میں بڑی پھرتی سے جہاز کو لنگر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ کام کچھ اس طرح انجام دیتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کوئی زحمت ہی اٹھانی نہیں پڑتی اور لطف یہ ہے کہ

ایک حبہ اس کام کا معاوضہ جہاز والوں سے نہیں چاہتے۔ صرف پردیسیوں کی خدمت اور ان کے لئے آسانی بہم پہنچانے کا ایک شوق ہے جو ان سے اس کام کو انجام دلاتا ہے۔" [ابن حوقل صفحہ ۷۴]

پھر مغرب کے مسلمانوں کی زندگی کا ایک نمونہ تھا۔ اب مشرق کا تماشہ بھی ابن حوقل ہی کی آنکھوں سے ملاحظہ کیجئے۔

وہ ایران کے ان باشندوں کا جو اس کے زمانہ میں وہاں آباد تھے، ان الفاظ میں تذکرہ کرنے کے بعد کہ:

"وبفارس سنة جميلة وعادة فيما بينهم" [ابن حوقل صفحہ ۲۰۷]

ترجمہ: ان لوگوں میں بعض اچھی قدیم روایات اور عمدہ عادتیں پائی جاتی ہیں۔

عجیب وغریب مہمان نوازی

پھر اس کی تفصیل کے بعد اسی مشرقی حصہ ملک کے ایک رئیس جن سے ابن حوقل نے بھی ملاقات کی تھی ان کا نام جعفر بن سہل بتاتا ہے اور وہ حارث بن افریقون کے کاتب (سیکریٹری) تھے۔ صرف اس ایک شخص کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ:

"پچاس سال کی مدت میں ایسا کوئی آدمی شاید ہی ہوگا جو خراسان پہنچا ہو۔ اور اس امیر کے بذل ونوال سے مستفید نہ ہوا ہو۔ یا کوئی نہ کوئی احسان کسی نہ کسی طریقہ اس پر اس امیر کی طرف سے نہ ہوا ہو۔ خواہ اس کی ملاقات بھی اس امیر سے نہ ہوئی ہو بلکہ خط یا تحفہ ہی کے ذریعہ سے اس کی رسائی اس کے دربار تک ہوئی ہو۔"

اور آخر میں اس خیر مجسم کے متعلق لکھتا ہے:

"بلکہ اس شخص نے تو بعض ایسی مخفی تدبیریں اختیار کر رکھی ہیں جن کے ذریعہ سے ان لوگوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ جنہوں نے اس شخص تک

پہنچنے اور رسائی حاصل کرنے کی کوشش بھی نہ کی ہو اور اپنی حاجت کسی طریقہ سے بھی اس پر ظاہر نہ کی ہو۔"

اور وہ تدبیر جو اس امیر نے مسافروں کے متعلق اختیار کر رکھی تھی، اس کی تفصیل ان الفاظ میں کرتا ہے کہ:

"اس شخص نے ان تمام مواضع و مقامات میں جو اس کی جاگیر میں ہیں، سرائیں تعمیر کرا دی ہیں اور ان سراؤں پر ان ہی مواضع اور مقامات کی آمدنی کا ایک حصہ وقف کر رکھا ہے۔ کیا یہ ہے کہ اس قسم کے تمام مقامات میں اس امیر کی طرف سے گائیں پلی ہوئی ہیں۔ قوام (یعنی جو اس کے ان مقامات میں مینجر اور چیزوں کی دیکھ بھال کے لئے اس کی طرف سے نگراں اور داروغہ ہیں) ان گایوں کے دودھ کو نکلواتے ہیں اور راہ گیروں اور آنے جانے والوں کی تواضع اسی خالص دودھ سے کرتے ہیں۔ صرف دودھ ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ دوسرے کھانے اور اطعمہ بھی ہوتے ہیں، جو ان مسافروں کی ضرورت کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ اسی طرح گرمیوں کے دنوں میں اس امیر کی ان تمام سراؤں میں رائب (دہی یا لسی) کا نظم رہتا ہے۔ حکم ہے کہ انتہائی اخلاق اور مہربانی کے ساتھ ہر اس شخص کو یہ پلایا جائے جو اس کی جاگیر کے ان علاقوں سے گذرتے ہیں۔"

حکومت آصفیہ کی آخری یادگار

اس موقعہ پر بے ساختہ مغلی تمدن کی اس آخری یادگار کا قدرتاً خیال آ جاتا ہے، میرا اشارہ حکومت آصفیہ کے سابق مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی سے ہے۔ کہنے والے سچ کہتے تھے کہ خواہ وہ مسلمان ہو یا نہ ہو۔ لیکن اسلامی تمدن جو ہندوستان میں قائم ہوا تھا۔ اس کی وہ یقیناً آخری یادگار تھا۔ بیس پچیس سال تک خود اس فقیر نے دیکھا کہ ٹھیک ان کا حال بھی حیدرآباد

میں یہی تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ حیدر آباد میں باہر سے کوئی آدمی آجائے اور مہاراج تک کسی طرح اس کی رسائی ہوئی ہو اور وہ خالی ہاتھ واپس کیا گیا ہو۔ مگر وہ آخری آدمی تھا، اب وہی حیدر آباد ہے اور وہی آصفیہ حکومت ہے۔ آمدنی کے لحاظ سے بحمد اللہ اب اس کی حالت بہ نسبت سابق کے بہتر ہے، لیکن جس تمدن نے اب ہندوستان میں اپنا خیمہ گاڑا ہے، حیدر آباد اس کے سائے سے کیسے بچ سکتا تھا، حالانکہ سننے میں آتا ہے کہ آج سے چالیس پچاس سال پہلے حیدر آباد میں صرف ایک مہراج ہی نہیں تھے بلکہ امراء کی فیاضیاں، مسافر نوازیاں عام تھیں۔ لیکن جہاں ان کا تمدن مدفون ہوا وہیں وہ بھی مدفون ہو گئے۔

مہمان نوازی کیلئے سرائے میں مویشی

ابن حوقل نے یہ بتاتے ہوئے کہ ہر سرائے میں اس امیر کی طرف سے جو گائیں رہتی ہیں ان کی تعداد کیا ہوتی ہے، میں تو پڑھ کر حیران ہو گیا کہ بادشاہ نہیں، وزیر نہیں، ایک معمولی حکومت کا عہدہ دار یعنی سیکریٹری! اور فیاضی کا حال یہ ہے۔ سنئے ابن حوقل راوی ہے:

"وما من قرية ورباط له الا وفيه المائة بقرة الى فوق ذلك لهذا الوجه والمقصد دون بقرة العاملة له فى اسباب منافعه"

ترجمہ: اس شخص کا کوئی گاؤں اور اس کی کوئی سرائے ایسی نہیں ہے، جس میں سو اور سو سے اوپر گائیں محض اسی مقصد (یعنی مسافروں کے لئے) نہ رہتی ہوں، یہ گائیں ان بیلوں کے علاوہ ہیں جو خود امیر کے ذاتی کاروبار کو انجام دینے کے لئے وہاں رکھے جاتے ہیں۔

[ابن حوقل، صفحہ ۲۰۹]

اس سے آپ کو اس زمانے کے مسلمانوں کے اس ذوق کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے جو مویشیوں کی پرورش اور نگہداشت کے متعلق رکھتے تھے۔ خیال تو کیجئے، ہر ہر قریہ اور ہر ہر رباط میں علاوہ عام کاروباری ضرورتوں کے سو اور سو سے اوپر گایوں کا رکھنا اور اس طور پر رکھنا کہ مسافروں کو ان کے دودھ سے ہر وقت تمتع و استفادہ کا موقع ملتا رہے۔ کیا معمولی نگہداشت اور

توجہ کا محتاج ہے؟

جانوروں اور پرندوں کو پالنے کا شوق

جانوروں، پرندوں اور اسی قسم کی چیزوں کے پالنے کا ایک عام ذوق اسلامی امراء میں پایا جاتا تھا۔ پھر کوئی کتاب لکھنا چاہے تو لکھ سکتا ہے۔ لیکن ایک ہندوستانی امیر نے باغ حیوانات اپنے یہاں قائم کیا تھا۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ موجودہ زمانہ کے باغ حیوانات میں بھی وہ چیزیں اس وقت تک کہیں جمع کی گئی ہوں، بلکہ جمع کرنے کا خیال بھی کسی کو مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔ صاحب مآثر الامراء نے فیض اللہ خان جو شاہجہانی اور عالمگیری عہد کے امراء میں ہیں، ان کے متعلق یہ لکھ کر کہ ''بجز مویشیوں، چوپاؤں، درندوں، وحشی جانوروں، پرندوں اور حشرات الارض کے اور کسی کی صحبت مشکل ہی سے یہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لئے یہ دنیا کے شہروں اور مختلف بندرگاہوں سے اس قسم کی چیزیں لے کر لوگ آتے رہتے ہیں۔'' آخر میں یہ روایت نقل کی ہے:

> ''گویند کہ جانورے بود از وحشی وانسی و متعارف و غیر متعارف کہ در سرکارش فراہم نیامدہ''

انتہا اس ذوق کی یہ تھی کہ:

> ''کیک پشہ و سوس و شپش رادر اوانی چوبی ومسی نگاهداشتے و پرورش مے دادے''

یعنی پسو، مچھر، دیمک، جوں جو غلوں میں پڑتے ہیں اور جوئیں تک جیسی چیزوں کو لکڑی اور تانبے کی بنے ہوئے ظروف یعنی ڈبیہ وغیرہ میں ان کو محفوظ کئے ہوئے تھے اور ان کی پرورش کرتے۔ [مآثر الامراء صفحہ ۳۰۰ ج ۳]

سانپ، بچھو تک تو عجائب خانوں میں دیکھے گئے ہیں، لیکن مچھروں، کیڑوں اور چوہوں وغیرہ جیسی چیزوں کو بھی زندہ عجائب خانہ میں شریک کرنا یہ اسی مسلمان رئیس کی اپج تھی۔

ماوراءالنہر کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی ابن حوقل نے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ:

''کھانے پینے، لباس وغیرہ کے لحاظ سے یہ لوگ جس فراخی اور فراغ بالی کی حالت میں ہیں اس کا ذکر میں کر چکا۔ یہی حال ان کے پانی کا ہے۔ حد سے زیادہ شیریں، ٹھنڈا اور ہلکا پانی ہر جگہ ماوراالنہر میں باآسانی میسر ہے، جو اس ملک کے پہاڑوں اور مرغزاروں میں دوڑتا رہتا ہے اور اس پر لطف یہ ہے کہ باآسانی جمد (قدرتی برف) بھی ان کے قابو میں ہے۔ ہر جگہ یہ برف یہاں ملتی ہے۔''

اس تذکرہ کے بعد لکھتا ہے کہ:

''ان کی مویشیاں اور جو بچے ان سے حاصل ہوتے ہیں وہ ان تمام ضرورتوں کے لئے کافی ہیں، کیونکہ ان مویشیوں کے ساتھ ان کا گہرا تعلق ہے اور یہی حال خچروں، اونٹوں، گدھوں کا ہے۔''

اس نے لکھا ہے کہ:

''ان کی بھیڑ بکریاں بھی اتنا دودھ دیتی ہیں، جو ان کی ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بکریاں عموماً غزیہ اور خرلجیہ ہوتی ہیں۔ ان کے پاس زیادہ بچے جننے والی بکریاں اور دوسرے مویشی بکثرت ہیں۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۳۳۶]

ان غزیہ اور خلجیہ بکریوں کا حال ان ہی لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ:

"ولا تضع الشاة للترك اقل من اربعة واذا كثرت فخمسة اوستة شبه الكلبة فاما الاثنان والثلثة فلا تضع الا فى الفرد"

ترجمہ: ترکوں (یعنی جو غز اور خلجی کہلاتے تھے ان ہی ترکوں) کی یہ بکریاں چار سے کم بچے تو دیتی ہی نہیں۔ زیادہ پانچ اور چھ تک تعداد ان کے بچوں کی پہنچ جاتی ہے۔ گویا ان کا حال کتیا کا سا ہے۔ (یعنی وہ بھی اسی قدر زیادہ بچے دیتی ہے)۔ باقی دو یا تین بچے کبھی کبھی انفرادی طور پر ایسا بھی ہوتا ہے۔ (لیکن عام حال وہی ہے)۔ [الہمدانی وابن حوقل، صفحہ ۲۹]

اور سچ تو یہ ہے کہ ابن حوقل کا یہ بیان ماوراء النہر اور اس کے فواکہ کے متعلق اگر صحیح ہے یعنی اس نے اس علاقے کے میووں اور فواکہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''باقی ان کے فواکہ تو تم سغد دریا کی وادی اور اشروشنہ فرغانہ شاش کے علاقوں میں سفر کرتے ہوئے اگر گھسو گے تو تم کو خود معلوم ہو جائے گا کہ اتنے پھل دنیا میں شاید ہی کہیں ہوتے ہوں۔ کثرت ہی کا نتیجہ ہے کہ عموماً ان پھلوں کو ان کے جانور اور ان کے مویشی کھاتے ہیں۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۳۲۷]

خیال کرنے کی بات ہے کہ بکریوں اور بھیڑیوں، گایوں کو جہاں سیب، ناشپاتی، شفتالو، اور خدا جانے کیا کیا پھل، جس کی تفصیل بھی مختلف مواقع پر ان لوگوں نے کی ہے، یہ چیزیں کھلائی جاتی ہوں، وہاں کے آدمیوں سے تو کیا جانوروں سے بھی ان ملکوں کے آدمی برابری نہیں کر سکتے، جس کی قسمت میں ان پھلوں کے صرف نام ہی ہیں۔

اہل ماوراء النہر کی مہمان نوازی

بہر حال گفتگو تو اس میں ہو رہی تھی جو ان ممالک کے لوگوں، پردیسیوں اور مسافروں کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے۔ ایران کے بعد ایک اور نمونہ ماوراء النہر بھی دیکھتے چلئے۔ ابن حوقل نے یہ لکھ کر کہ باقی اس علاقہ کے رہنے والوں کی سیر چشمیاں، مسافر نوازیاں، سو اس کا حال یہ ہے، ابن حوقل کے الفاظ میں سنئے۔ لکھتا ہے:

"فان الناس فی اکثر ماوراء النهر كانهم فی دار واحدة ماينزل احد باحدالا كانه دخل فی دار نفسه لايجد المضيف من طارق يطرقه كراهية بل يستفرغ جهده فی اقامة اوده من غير معرفة تقدمت ولا توقع لمكافاة"

ترجمہ: ماوراء النہر کے اکثر علاقوں کا حال یہ ہے کہ وہاں کے لوگ گویا ایک ہی گھر کے رہنے والے معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کے گھر جب مہمان ہو کر آتا ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا

ہے کہ خود اپنے ہی گھر میں اترا ہے۔ میزبان مسافروں کے آنے سے بجائے کسی گرانی کے عموماً مسافروں کی ضرورتوں کی تکمیل میں کوشش کرتے ہیں۔ خواہ پہلے سے شناسائی نہ بھی ہو اور نہ کسی معاوضہ کی توقع سے ایسا کرتے ہیں۔ [صفحہ ۲۲۸]

اسی سلسلہ میں اور بہت سی دوسری چیزوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک نمونہ کا ذکر ابن حوقل نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''میں نے سغد کے علاقے میں خود ایک مکان کو دیکھا۔ اب تو وہ بند پڑا ہوا ہے، لیکن مجھے صحیح ذریعہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ تقریباً سو سال تک اس دیوڑھی کا پھاٹک کبھی بند نہیں ہوا اور اس طویل عرصہ میں کسی مسافر کو اترنے سے یہاں منع نہیں کیا گیا۔''

اور آخر میں یہ نقل کرتا ہے کہ:

''بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ اچانک بغیر کسی سابقہ اطلاع کے سو سو دو دو سو آدمی بلکہ اس سے بھی زیادہ اپنے اپنے جانوروں اور سواریوں، ساز و سامان اور نوکر چاکر کے ساتھ جانوروں اور سواریوں، ساز و سامان اور نوکر چاکر کے ساتھ رات کو پہنچے ہیں۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ ان کے جانوروں کو بھی کافی گھاس، چارہ، دانہ پہنچا دیا گیا اور خود ان کے کھانے پینے، اوڑھنے بچھانے کا انتظام اس طور پر کر دیا گیا تھا کہ خود اپنے سامان کو کھولنے کی ضرورت ان مسافروں کو نہیں پڑی اور لطف یہ ہے کہ یہ سارا سامان اتنی آسانی سے ہو گیا کہ خود صاحب مکان کو کوئی غیر معمولی دشواری اٹھانی نہیں پڑی۔ جس کی وجہ وہی ہے کہ مہمان نوازی کے تمام ساز و سامان یہاں کے باشندے عموماً تیار رکھتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان مسافروں کی مختلف ضروریات کے لئے مختلف خدام جو ان ہی کے ساتھ مختص ہوتے ہیں، تیار رہتے ہیں۔ صاحب مکان کو

کسی جدید حکم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ملازمین کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کیا کیا کام کرنا چاہیے۔

میزبان کا کام فقط اس قدر رہتا ہے کہ اپنے مہمانوں سے بخندہ پیشانی ملتا جلتا رہے اور ان مہمانوں میں سے کسی کو یہ محسوس نہ ہونے دے کہ میزبان نے کسی کے ساتھ کوئی خاص ترجیحی برتاؤ کیا ہے۔''

سوچنے کی بات ہے، سو سو، دو دو سو مہمانوں کو اتارنے، ان کے سونے بیٹھنے، رہنے سہنے کے لیے کتنے بڑے بڑے مکانوں کی ضرورت ہوگی۔ اس سے مسلمانوں کی تعمیری اولوالعزمیوں کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔

مسلمانوں کا تعمیری ذوق

میرا مقصد اسلامی تعمیرات کے ان قصوں سے نہیں ہے جو سلطنتوں کی طرف سے بنائی گئی ہے۔ وہ تو ایک الگ بجائے خود مستقل داستان ہے۔ لکھنے والے اس پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ قصر زہراء، قصر حمراء، ابن طولون کی مصری عمارتیں یا دار السلام بغداد، سر من رٰی، اور دوسری اسلامی تخت گاہوں میں تو ان کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے تعمیرات کا سلسلہ کما وکیفا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کے زمانہ میں اس حد کو پہنچ چکا تھا۔ جیسا کہ ''ازالۃ الخفاء'' میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے کہ:

> ''درزمان خلافت عمر رضی اللہ عنہ ہزار وسی ۱۰۳۶ وشش شہر باتوابع آں مفتوح شدوچہار ہزار ۴۰۰۰ مسجد ساختہ گشت ونہ صد ۹۰۰ منبر بر جنوب محاریب جوامع بجہت خطبۂ جمعہ بناکر دند''
> [صفحہ ۶۵ ج ۲]

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں ایک ہزار چھتیس ۱۰۳۶ شہران

کے ملحقہ علاقہ کے ساتھ فتح ہوئے۔ اس زمانے میں چار ہزر ۴۰۰۰ مسجدیں تعمیر ہوئیں اور نو سو ۹۰۰ منبر محرابوں کے بازو میں جمعہ کے خطبہ کے لئے بنائے گئے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ ہر مسجد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں منبر نہیں قائم کیا گیا تھا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ خوب فرماتے ہیں کہ نماز جمعہ اور نماز ظہر میں فرق ہے۔ یعنی ظہر کی نماز تو ہر جگہ اور ہر شخص پر فرض ہے، لیکن جمعہ کی حیثیت یہ نہیں ہے۔ اس کے لئے خاص قسم کی جگہ کی ضرورت ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کتنا کھلا ہوا مسئلہ ہے۔ تمام صحابہؓ کے سامنے یہ واقعہ ہوا اور کسی سے منقول نہیں ہے کہ اس نے یہ مطالبہ کیا ہو کہ جہاں جہاں مسجدیں بنائی گئی ہیں وہاں منبر بھی قائم کئے جائیں۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ اسی زمانہ میں صحابہؓ کا اس پر اجماع قائم ہو چکا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مشہور اثر " لا جمعة ولا تشريق الا فی مصر جامع " کے متعلق جن لوگوں نے یہ توجیہ پیش کی ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام کے عہد میں خوارج چونکہ مسجدوں میں حضرت کے خلاف سازشی کمیٹیاں کرتے تھے۔ اس لئے عام مسجدوں میں آپ نے عام اجتماع کی ممانعت کر دی تھی۔ گویا یہ حکم سیاسی مصالح پر مبنی تھا۔ یہ کتنی غلط توجیہ ہے کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پہلے ہی اس نظام کو قائم کر دیا گیا تھا۔

ابن حوقل اور وغیرہ عموماً شہروں اور آبادیوں کا حال لکھتے ہوئے یہ بھی تصریح کرتے جاتے ہیں کہ یہاں منبر ہے یا نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے زمانہ تک جمعہ کی نماز آبادی میں نہیں ہوتی تھی، بلکہ عموماً مرکزی مقامات کی مسجدوں میں منبر ہوتا تھا۔ ٹھیک جیسے جاہلی تمدن میں آبادیوں کے فرق کو بتاتے ہوئے آج کل یہ لکھا جا سکتا ہے کہ یہاں سینما اور تھیٹر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ وہ کوئی معمولی گاؤں ہے اور جہاں بتایا جائے کہ یہاں سینما ہال ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ کوئی معقول آبادی ہے۔ اسی طرح عہد اسلامی میں آبادیوں کے اس فرق مراتب کو منبر یا ہے نہیں اس سے ظاہر کیا جاتا تھا۔

یہ تو کمیت اور مقدار کا حال ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کل چودہ پندرہ سال کے بعد

مسجدوں کا یہ نظام سارے مفتوحہ علاقے میں قائم کر دیا گیا تھا۔ باقی کیفیت سو اس کا اندازہ آپ کو مورخین کی اس قسم کی عبارتوں سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً کوفہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے جو مسجدیں بنی تھیں، معجم البلدان میں اس کو متعلق لکھا ہوا ہے۔ میں بجنسہ الفاظ نقل کرتا ہوں:

"وکتب عمر بن الخطاب الی سعد ان اختط موضع المسجد الجامع علی عدة مقاتلتکم فخط علی اربعین الف انسان فلما قدم زیاد زاد فیه عشرین الف انسان وجاء بالاجر وجاء باساطینه من الاهواز"

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (کوفہ کے والی) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا کہ جامع مسجد کی داغ بیل ان سپاہیوں کی تعداد کے مطابق ڈالو جو کوفہ کی چھاؤنی میں سکونت پذیر ہیں۔ اس فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مسجد کی بنیاد رکھی، جس میں چالیس ہزار آدمیوں کی گنجائش تھی۔ پھر کوفہ کا والی جب زیاد ہوا تو بڑھا کر بیس ہزار آدمیوں کی گنجائش کا اور اضافہ کر دیا۔ اس مسجد کے لئے اینٹیں منگوائی گئیں اور ستون اس کے اہواز سے آئے۔ [معجم البلدان، صفحہ ۲۹۷، جلد ۷]

ایک ایک مسجد جس میں چالیس چالیس ہزار سے بھی آگے بڑھ کر زیاد کی گورنری کے زمانہ میں ساٹھ ہزار انسانوں تک کی گنجائش اس میں پیدا کی گئی ہو! ذرا اس مسجد کے طول وعرض کا اندازہ تو کیجئے، خرچ اس پر کیا ہوا تھا۔ عہد فاروقی کی کفایت شعاری کے باوجود لکھا ہے کہ:

"وقد انفقت علی کل اسطوانة سبع عشر مائة"

ترجمہ: ہر ستون پر سترہ سترہ سو خرچ ہوئے تھے۔ [ایضاً صفحہ ۲۹۹]

بہ ظاہر مراد درہم ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایک ایک ستون پر اتنا خرچ جب آیا تھا تو کل ستونوں پر کتنا خرچ بیٹھا ہوگا؟

بہر حال میری غرض اس وقت مسلمانوں کی ان عمارتوں اور بنیادوں سے نہیں ہے، جن کی تعمیر میں حکومت کا ہاتھ تھا۔ خواہ خود سلاطین نے ان کی تعمیر کرائی ہو۔ یا حکومت کے حکام وولاۃ کے وہ کارنامے ہوں۔ کیونکہ علاوہ سلاطین کے یہ واقعہ ہے کہ اسلامی حکومتوں کے ان حکام وولاۃ

کی اولوالعزمیاں بھی اس راہ میں کچھ کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ خیال تو کیجئے، اسلام کا ابتدائی زمانہ ہے، پہلی صدی ہجری ہے، اور کسی بہت بڑے آدمی نے نہیں، حجاج کے طبیب الدیلمی نے فارس کی ایک نہر جس کا نہر طاب تھا، ابن حوقل نے لکھا ہے کہ رجان نامی قریہ کے دروازہ سے نکلنے کے بعد جو راستہ خوزستان کی طرف جاتا ہے، اسی پر یہ دریا طاب نامی واقع ہے۔ اس پر اسی الدیمی نے ایک پل بنوا دیا تھا۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ:

"وهی طاق واحد سعة مابين عموديه علی وجه الارض ثمانون خطوة وارتقائه مقدار مايجوز فيه راكب بحمل بيده علم من اكبر ما يكون من الاعلام" [ابن حوقل، صفحہ ۲۱۲]

ترجمہ: یہ پل صرف ایک کمان (محراب) ہے۔ دونوں دیواریں جو اس کمان کی زمین پر ہیں، ان کا درمیانی فاصلہ اسی ۸۰ قدم ہے اور بلندی اس کمان کی اتنی ہے کہ اونٹ پر بیٹھ کر اونچے سے اونچا جھنڈا لے کر آدمی اس کے نیچے سے گذر سکتا ہے۔

اور یہ تو خیر عرب سے باہر کا حال ہے، پہلی صدی ہجری میں خود مدینہ منورہ کا حال تعمیری لحاظ سے کس معیار تک پہنچ چکا تھا۔ عام لوگوں کی عمارتوں کی کیفیت کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ سیرین جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے غلام تھے اور بعد کو بطریقہ کتابت انہوں نے آزادی حاصل کر لی تھی۔ عموماً تجارتی کاروبار کرتے تھے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ ان کے پڑپوتے بکار بن محمد بیان کرتے تھے:

"رأيت مجلس سيرين الذی بناه بجذوع بعت انا منها اربعين جذعاً كل جذع بدينار" [طبقات ابن سعد، صفحہ ۸۸ ج ۷]

ترجمہ: میں نے سیرین کی بنائی ہوئی نشست گاہ دیکھی تھی۔ شہتیروں سے بنائی گئی تھی (یہ شہتیریں کیسی تھیں، اس کا اندازہ اس سے کرو کہ) خود میں نے اس کی ایک ایک شہتیر ایک ایک اشرفی میں فروخت کی تھی۔

اور جب ایک پردیسی غلام کی عمارت کا یہ رنگ ہے، اسی سے عام شرفائے مدینہ کی

عمارتوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

تاریخوں میں حضرت طلحہؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت سعدؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت وغیرہ کی حویلیوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ الہمدانی نے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ میں ساگوان اور صنوبر کی لکڑیاں بصرہ کی بندرگاہ سے درآمد ہوئی تھیں اور بطن نخل کی کوئی جگہ تھی۔ جہاں خاص طور پر معلوم ہوتا ہے کہ چونہ بنانے کی بھٹیاں بنائی گئی تھیں۔ وہیں سے مدینہ چونہ جاتا تھا۔ [الہمدانی صفحہ ۱۰۹]

صحابہؓ ہی میں آخر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ بھی ہیں اور کیسے صحابی؟ لیکن عموماً کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ نے کوفہ میں، بصرہ میں، اسکندریہ میں، فسطاط (مصر) میں الگ الگ قصور بنوائے تھے۔

خیر یہ قصہ تو بہت طویل ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بڑے بڑے مکانات اور کتنے بڑے بڑے کہ بوقت واحد جیسا کہ گذر چکا ایسے مکانات مسلمانوں کے عموماً ہوتے تھے۔ جن میں سو سو، دو دو سو مہمان با آسانی اتارے جا سکتے تھے اور ان کے آرام و آسائش کا وہاں نظم کیا جا سکتا تھا۔ پس یہی دیکھنے کی بات ہے کہ تعمیری وسعتوں کے اس شوق کے پیچھے مسلمانوں کے اندر اس زمانہ میں محرکات کیا ہوتے تھے۔ الہمدانی نے اگرچہ ایک موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ اس زمانہ میں عام خیال بھی تھا کہ:

"سعة الدار تزيد فى العقل كما ان ضيقها ينقص عقله"

ترجمہ: گھر کی کشادگی سے عقل میں اضافہ ہوتا ہے اور مکان کی تنگی سے عقل گھٹتی ہے۔ [صفحہ ۱۵۴]

کئی سال ہوئے معارف میں ایک صاحب جو غالباً یورپین ہی تھے، ان کے ایک مضمون کا ترجمہ یا خلاصہ چھپا تھا، جس میں اسی نظریہ پر بہت زور دیا گیا تھا اور لکھنے والے کے بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ اس زمانہ کا یہ کوئی خاص نظریہ ہے۔

اور اس زمانہ میں یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اونچے اور بڑے مکانوں میں رہنے

والوں کے خیالات میں بھی تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بلندی اور وسعت پائی گئی ہے اور تنگ و تاریک مکانوں میں رہنے کے جو عادی ہوتے ہیں، عموماً دیکھا گیا ہے کہ ان کی ہمتیں پست او رحوصلے تنگ ہوتے ہیں۔

مسلمانوں میں وسعت مکانی کے اسباب

لیکن اسی کے بعد خود الہمدانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک خیال اس زمانہ میں یہ بھی تھا کہ:

''گھر ہی گھر والے کی دنیا ہوتی ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ اپنے دیوان خانے (یعنی زنانے کے سوا جو مردانہ حصہ ہوتا ہے اس کو) ذرا خوبصورت بنائے۔ اور نفاست و لطافت کا اس کی تعمیر میں خاص طور پر خیال کرے۔ کیونکہ وہی حصہ تو مکان کا چہرہ ہوتا ہے اور مہمانوں کے ٹھہرانے کی جگہ بھی وہی ہوتی ہے۔ دوستوں سے ملنے جلنے کا مقام بھی وہی ہوتا اور نوکروں چاکروں کے آرام لینے کی جگہ بھی وہی ہوتی ہے۔ پھر بچوں کے پڑھانے کے لئے معلم کو بھی اسی میں جگہ دینی پڑتی ہے اور اجازت لے کر جس حد تک بیرونی لوگ آسکتے ہیں، وہ بھی مکان کا یہی حصہ ہوتا ہے۔'' [الہمدانی، صفحہ ۱۵۴]

جس سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ بڑے بڑے مکانوں کے بنانے سے مسلمانوں کے سامنے اس زمانہ میں کیا کیا اغراض ہوتے تھے اور مکان کے بیرونی حصہ سے کیا کیا کام لیا جاتا تھا۔ گویا مہمان خانہ، ملاقات کا کمرہ، بچوں کا مکتب خانہ، نوکروں اور شاگرد پیشہ والوں کے رہنے کی جگہ، الغرض ان ساری چیزوں کی گنجائش کا خیال کر کے عموماً مکان بنوائے جاتے تھے اور یہ تو الہمدانی نے لکھا ہے، باقی ابن حوقل نے ماوراء النہر کے مسلمانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو لکھا ہے:

''یہاں کی لوگوں میں سب سے بڑا شوق اور سب سے بڑا حوصلہ جس چیز کا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں ہر شخص اپنی اپنی وسعت و گنجائش کے مطابق یہ

چاہتا ہے کہ مہمانوں کے لئے اپنے گھر کو جس حد تک ممکن ہو سجا کر سلیقہ کے ساتھ رکھا جائے۔''

پھر یہ لکھنے کے بعد بیان کرتا ہے کہ:

''ان کے اس جذبہ کا اندازہ کرنے کے لئے شاید یہ مشاہدہ کافی ہوسکتا ہے کہ ان میں کوئی آدمی جو کوئی گاؤں یا جائیداد رکھتا ہے، اس پر بس یہی دھن سوار رہتی ہے کہ کوئی بڑا کشادہ کھلا ہوا قصر (مکان) مہمانوں کے لئے تعمیر کرے۔ عام طور ان لوگوں کو تم پاؤ گے کہ آنے والے مسافروں کے خیال سے وہ اپنے گھر کے ساز و سامان کے درست کرنے اور اس کے سجانے، مرتب کرنے کے مشغلے میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی حال میں کہیں کوئی مہمان اگر آگیا تو یہ واقعہ ہے کہ باہم ایک دوسرے سے اس معاملہ میں الجھ جاتے ہیں۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ اس کو اپنا مہمان بنائے۔ ماوراء النہر میں کسی شخص کو میں نے نہیں دیکھا، جس پر یہ جذبہ مہمان نوازی کا مسلط نہ ہو۔ اس قصے میں وہ اپنے روپے، پیسے، مال و متاع کو اس بے دردی سے خرچ کرتے ہیں اور اس خرچ میں اسی طرح مقابلہ کرتے ہیں، جیسے دوسرے علاقے کے لوگ مال کے جمع کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۳۳۸]

اس سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ زیادہ تر مکانی وسعتوں کے شوق کا محرک مسلمانوں میں کونسا جذبہ تھا؟ گو آخری الفاظ ابن حوقل کے ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید چوتھی صدی ہجری میں مہمان نوازی کا یہ جذبہ صرف ماوراء النہر ہی کے مسلمانوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود اسی شخص نے اپنی اسی کتاب میں جہاں کہیں کے مسلمانوں میں پہنچنے کا ذکر کیا ہے، عموماً ان کی مہمان نوازیوں کی اس نے تعریف ہی کی ہے۔ حتیٰ کہ سجلماسہ (مغربی افریقہ) کے مسلمانوں کا ذکر ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ:

''یہاں کے باشندے خوشحال، خوش جمال ہیں۔ ان کی آبادیوں کے چاروں طرف گھنے باغات اور نخلستان پائے جاتے ہیں۔ ان میں بڑی مروت اور سیر چشمی میں نے دیکھی، ان کے مکانات عموماً کوفہ کے مکانات جیسے ہیں۔ یعنی بڑے اونچے اونچے دروازے اور بھاری بھرکم محلات۔''

آخر میں خود سجلماسہ اور سجلماسہ سے سوس، اغمات، فاس، تاہرت کے قرب و جوار اور تنس (یہ ٹیونس نہیں بلکہ دوسری جگہ کا نام ہے۔ ٹیونس سے یہ سارے مقامات مہینوں کے فاصلہ پر ہیں۔ مغربی افریقہ کے معمورہ کے گویا یہ آخری حدود ہیں) مسیلہ، طبنہ، باغالے، سے اکربال، ازفون اور بوتہ تک کے علاقوں میں جہاں کہیں مسلمانوں کی آبادیاں ہیں، لکھتا ہے:

''یضیفون المارۃ و یطعمون الطعام'' [صفحہ ٦٦]

ترجمہ: مسافروں کی مہمان نوازی کرتے ہیں، انہیں کھانا کھلاتے ہیں۔

بلکہ اس علاقے کے بعض بربری قبائل کے مسلمانوں کے متعلق اسی مہمان نوازی کے سلسلے میں بعض ایسی باتیں نقل کی ہیں کہ دل انکی تصدیق پر آمادہ نہیں ہوتا۔

بہرحال مجھے تو صرف یہ دکھانا تھا کہ اکرام ضیف کا یہ قصہ کچھ ماوراء النہر کے مسلمانوں ہی کی خصوصیت نہ تھی بلکہ مشرق سے مغرب کے آخری کناروں تک مسلمان جہاں کہیں بھی آباد تھے، اس کو ایک قسم کا اسلامی شعار سمجھتے تھے۔

ابن حوقل کے ساتھ پیش آمدہ دلچسپ واقعہ

خود ابن حوقل نے تفلیس (طفلس جورڈس کے ڈکٹیٹر اسٹالن کا مولد ہے) وہیں کا ایک طویل قصہ اسی مہمان نوازی کے متعلق نقل کیا ہے، یہ لکھ کر کہ:

''اس شہر (تفلیس) کے لوگ بھی پردیسیوں اور مسافروں کے ساتھ خاص انس رکھتے ہیں۔ یہ عموماً سنی ہیں۔ قدیم روش کے پابند ہیں۔ علم حدیث سے ان کا خاص تعلق ہے۔ اسی لئے محدثین کا خصوصاً اور جن میں علم و ادب کی کچھ

خو بو پائی جاتی ہو ان کا عموماً احترام کرتے ہیں۔" [ابن حوقل، صفحہ ۲۴۳]

آگے تقریباً ایک صفحہ میں اس داستان کو اس نے ادا کیا ہے۔ آخری فقرے اس کے کچھ مبہم اور نامفہوم ہے۔ غالباً طباعت کی غلطی کا نتیجہ ہے یا اور کوئی بات ہو، بہرحال اسکا خلاصہ یہ ہے کہ کسی وجہ سے ابن حوقل نے یہ قسم کھائی تھی کہ میں یہاں کسی کا مہمان بن کر نہیں رہوں گا۔ یہ حال جب شہر کے بعض معززین کو معلوم ہوا تو وہ لکھتا ہے:

"فعقد لی مجلس للمناظرة علی هذا الیمین فی دار امیرهم وحضر القاضی فابتدأنی دونهم" [ایضاً]

ترجمہ: میری اس قسم کے متعلق لوگوں نے ایک خاص مجلس اپنے امیر کے گھر پر منعقد کی۔ اس مجلس میں شہر کے قاضی بھی تھے۔ گفتگو کی ابتداء قاضی ہی نے کی۔

پھر قاضی کی پوری تقریر نقل کی ہے جس کا آخری فقرہ یہ ہے کہ:

"فانا منذا درکنا شیوخنا نسمع تفاوضهم واصلاحهم علی انه لایجوزان یبیت غریب ببلدنا فی منزله ولا خادمین له"

ترجمہ: ہم نے اپنے بڑے بوڑھوں کو جب سے دیکھا ہے اور ان کے رسوم و رواج کو ہم جانتے ہیں، وہ یہی ہے کہ ہمارے شہر میں یہ نہیں ہوسکتا کہ مسافر اور مسافر کے نوکر چاکر اپنے گھر میں اتریں۔ [صفحہ ۲۴۳]

آخر میں قاضی نے ابن حوقل کو صاف صاف کہہ دیا کہ:

"جو صورت ہم پیش کر رہے ہیں، اگر تم اس پر راضی نہیں ہو تو پھر تمہارا ہمارے یہاں سے کوچ ہی کر جانا بہتر ہے۔ تاکہ تم کو دیکھ دیکھ کر ہم لوگوں کو جو تکلیف ہوتی رہے گی اس سے تو ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ باقی قسم کا عذر جو تم پیش کرتے ہو تو مسلمانوں کے یہاں قسم کا کفارہ بھی تو دیا جاسکتا ہے۔ ہم تمہاری طرف سے کفارہ ادا کریں گے۔"

کچھ بھی ہو جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے اکرام ضیف کی عادت مسلمانوں کی

عام عادت معلوم ہوتی ہے۔ خود ہندوستان کا حال اس وقت تک جب تک اسلامی تعلیم کا اثر یہاں کے مسلمانوں میں باقی تھا۔ مہمان نوازی میں جہاں تک میں جانتا ہوں، یہی حال تھا۔

اہل گیلانی کی مہمان نوازی

مجھے اپنے بچپن کے زمانے کی یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ گیلانی جو فقیر کا آبائی وطن ہے، بہار کا حالانکہ ایک مختصر سا گاؤں ہے۔ بہ مشکل بیس پچیس شریف مسلمانوں کے مکان وہاں ہیں ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے اور مسافر خانہ بھی اس کی ساتھ ہے، جس میں بوقت واحد آٹھ دس آدمی رات گذار سکتے ہیں، لیکن اس گاؤں میں بھی عموماً یہ دیکھا کرتا تھا کہ کسی وقت بھی مسافروں کی خواہ کتنی بڑی تعداد ہی کیوں نہ اتر آئی ہو، بستی والے بے چارے مسلمان جو معمولی خوش باش زندگی رکھنے والے تھے، ان کے کھلانے پلانے، سونے پڑنے کا نظم ضرور کر دیتے تھے۔ بعض بعض موقعوں پر میں نے دیکھا ہے کہ دس گیارہ بجے آٹھ ٹھ نو نو مسافروں کا مجمع مسجد کے مسافر خانہ میں آ کر ٹھہر گیا ہے۔ دیہات کے لوگ سویرے کھا پی کر سو رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ لوگ سوئے ہوئے ہیں۔ لیکن جوں ہی خبر ملی کہ مسافر آ گئے ہیں جس سے جو بھی بن پڑتا ان کے سامنے لا کر حاضر کرتا۔ اس کو اپنی بستی کی بڑی ہتک سمجھتے تھے کہ مسافر بھوکا سو گیا۔ لیکن بتدریج حیوانی تمدن کے آثار سے جب ملک متاثر ہونے لگا تو تیس چالیس سال کے اندر اندر اب یہ انقلاب ہو گیا ہے کہ مسافر آتے ہیں، موذن گھروں میں جا کر اطلاع دیتا ہے۔ لیکن عموماً اب اس کو یہی جواب ملتا ہے کہ کھانے کا نظم ہمارے یہاں سے نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ مالی حیثیت سے پچھلوں کی حالت پہلوں سے بہتر ہے۔ چند قدامت پرست گھر ہیں، جو اب تک اس پرانی لکیر کو پیٹتے جاتے ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ یہی حال اب عموماً لوگوں پر اپنا اثر قائم کر رہا ہے۔

قصور اس میں ہندوستان والوں کا نہیں ہے، بلکہ اس تمدن کا ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح اپنی مادہ کے سوا جانوروں کو اپنے ماں باپ سے بھی تعلق باقی نہیں رہتا۔ بچوں سے بھی ربط اسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک رزق طلبی کی قوت ان میں خود

پیدا نہیں ہوجاتی۔ اس کے بعد وہ اپنے بچوں سے بھی اسی طرح بیگانہ ہوجاتے ہیں جیسے ان سے ناآشنا ہوتے ہیں، جن کے وہ بچے ہوتے ہیں۔ جب ہندوستان کی تربیت اسی حیوانی تمدن کے اصول کے تحت ہو رہی ہے تو اب مسافر نوازی اور مہمان پروری کی قصے پارینہ قصے نہ بن جائیں گے تو اور ہوگا کیا۔ کیا چیلوں اور کوؤں کے گھر بھی آپ نے مہمانوں کو اترتے دیکھا ہے؟ بلکہ بعض حیوانوں میں تو وطنی جذبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ ان کا ہم جنس ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر کہیں بھولا بھٹکا ان کے گاؤں کی طرف وہ پردیسی بے چارہ نکل آتا ہے تو دانت نکالے بھونکتے ہوئے اس کی طرف دوڑتے ہیں۔

گجرات کے مسلمانوں کی مسافرنوازی

افسوس اسلام نے اس ملک کو ایک بڑی شریفانہ عادت سے روشناس کیا تھا۔ لیکن اسلام کا دباؤ ہی جب قلوب سے اٹھ گیا تو اس کے نتائج کا انتظار کیوں کیجئے۔ اس سلسلہ میں ایک مفید بات کا خیال آ گیا۔ گجرات کے مسلمانوں میں ایک خاص بات جس کا مسافر نوازی سے تعلق ہے بڑی اچھی ہے۔ شہر، قصبے، گاؤں، سب ہی میں یہ دستور مروج ہے کہ کسی خوشحال آدمی کا انتقال جب ہوتا ہے تو اس کی طرف سے توشک، لحاف، تکیہ وغیرہ بنوا کر لوگ مسجد میں بھیج دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ گاؤں گاؤں کی مسجدوں میں مسافروں کے لئے اوڑھنے بچھانے کا اتنا کافی سامان موجود رہتا ہے کہ مسافر سردی کے سخت ترین موسم ہی میں کیوں نہ وہاں پہنچ جائے، کسی قسم کی تکلیف اس کو نہیں ہوتی۔ ایک اچھی سنت ہے۔ دوسرے علاقہ کے مسلمان جو بھی اکرام ضیف کو اپنے پیغمبر کا حکم یقین کرتے ہیں، وہ بھی اس طریقے کو اگر اختیار کریں تو اچھا ہے۔

خیر ذکر تو عام مسلمانوں کے مکانوں اور تعمیری خصوصیتوں کا ہو رہا تھا۔ کیونکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، میری بحث کا تعلق صرف عوام ہی کے مکانات سے ہے۔ خلفاء وسلاطین یا ان کے وزرا، امراء اور ان کی تعمیری اولوالعزمیوں کے محرکات اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہیں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ان کا مقابلہ بھلا بے چارے عوام خوش باش لوگ کیا کر سکتے تھے، جہاں

صرف معماروں کی سبزی اور ترکاری پر ہزار ہا روپے صرف ہوتے ہوں، جیسا کہ ''جامع اموی'' دمشق کے تذکرے میں الہمذانی نے لکھا ہے کہ:

''وثمن البقل الذی اکله صناع الجامع الاموی فی مدة ایام العمل ستة الاف دینار'' [الہمذانی صفحہ ۱۰۷]

ترجمہ: جامع اموی کے بنانے والوں کی صرف ترکاری پر جو کچھ خرچ ہوا تھا اس کی مقدار چھ ہزار اشرفی تھی۔

تعمیری اخراجات

پھر جس جس قسم کے قیمتی پتھر اور سونے، چاندی کو پانی بنا کر ان عمارتوں میں لوگ صرف کرتے تھے، ان کا تو ایک عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے۔ اسلامی سلاطین کو آپ جو کچھ چاہے کہئے، مگر عام مسلمانوں کا فہم عمومی بحمد اللہ اعتدال کے حدود سے زندگی کے اکثروں شعبوں میں متجاوز نہیں ہوا ہے۔

اسی جامع اموی میں کہتے ہیں کہ ایک کروڑ بارہ لاکھ دینار ولید بن عبد الملک نے خرچ کر ڈالے۔ یہ یا اسی طرح دوسرے مسلمان سلاطین کی ان فضول خرچیوں کا ذکر، اس زمانے کے بعض مورخین مزے لے لے کر کرتے ہیں۔ مگر سچ عرض کرتا ہوں کہ ان واقعات کو کتابوں میں جب میں پڑھتا ہوں تو شرم سے گردن جھک جاتی ہے۔ خبط کے سوا بھلا اس کو اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اچھے خاصے شہروں کا طول آٹھ دس میل ہوتا ہے۔ لیکن مسعودی نے لکھا ہے کہ معتضد نے ''الثریا'' نامی قصر جو بنایا تھا صرف طول اس کا نو میل تھا۔ اسی طرح مقتدر کا ''دار الشجرہ'' جس کے اندر سونے چاندی کی ترکیب سے مشہور درخت بنائے گئے تھے، جن کی ہر ہر شاخ میں پھول پتے جواہر اور موتیوں سے تیار کئے گئے تھے اور مختلف پرندے نقرئی وطلائی ان شاخوں پر اس طرح بنائے گئے تھے کہ جب ہوا چلتی تھی تو یہ سارے مصنوعی پرندے چہچہانے لگتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعی زندہ پرندے ہیں۔ اسی طرح ابن طولون کے بیٹے خمارویہ نے مصر میں جو عیاشیاں

کیں تو حد کر دی کہ گداز توشک کی جگہ اس نے ایک بڑا حوض بنوا کر اس میں لاکھوں روپیہ کا پارہ بھرا تھا۔ اس پر ہوا سے بھرا ہوا چمڑے کا گدا بچھا دیا تھا۔ اسی پر لیٹ کر یہ احمق اس گدے پر اچھلتا تھا اور کیا کیا بیان کیا جاوے کہ خدا ناترس حکام نے مسلمانوں کے روپے کو کس طرح ضائع اور برباد کیا۔ صرف ایک عورت زہرا نامی کی خواہش کی تکمیل کے لئے اندلسی خلیفہ نے دو کروڑ اشرفیاں خرچ کر کے قصر زہرا بنوایا اور ان حماقتوں کو میں کہاں تک شمار کراؤں خود ہندوستان میں بھی اس سلسلہ میں بے ترتیبیاں کیا کم ہوئی ہیں۔

مسجد کی ہیبت

الہمدانی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں جامع اموی کے جواہرات اور زر ونقرہ کو چاہا تھا کہ نکلوا کر بیت المال میں جمع کر دیا جائے۔ اسی فکر ہی میں تھے کہ روم سے قیصر کے سفراء کا ایک وفد دمشق آیا۔ وفد کو لے کر حضرت مسجد کی طرف تشریف لے گئے تو دیکھا کہ مارے حسد کے سفیروں کے چہرہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے آواز بھی نہیں نکل سکتی۔ اس مشاہدے کے بعد آپ نے رائے بدل دی اور فرمایا کہ "اری مسجد کم هذا غیظاً علی الکفار" (اے مسلمانو! میں دیکھتا ہوں کہ کافروں کے قلوب کا ہماری مسجد غصہ بن گئی) گویا شوکت کفر پر اس سے بھی گونہ ضرب پڑ گئی تھی۔ پس اس واقعہ نے آپ کو اپنے ارادے سے باز رکھا۔ ہم بھی جب سوچتے ہیں تو ان واقعات کے تذکرے سے اتنا فائدہ تو ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے قلوب میں اپنی عظمت رفتہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہی یاد کسی زمانہ میں اس شیر کو اپنی حقیقت سے پھر مطلع کرے جو بکریوں کے ساتھ اس وقت گھاس چرنے میں مصروف ہو گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان امیرانہ چونچلوں کی کچھ توجیہ ہو سکتی ہے تو یہی ہو سکتی ہے، مسلمان سلاطین و امراء کی ان تعمیری فضول خرچیوں کے متعلق آج ہی نہیں پہلے بھی دلوں میں سوالات پیدا ہوئے ہیں۔ المقدسی نے خود اپنا قصہ بیان کیا ہے کہ "میں نے اپنے چچا حسن سے عرض کیا کہ مسلمانوں کے مال کو ولید نے دمشق کی جامع مسجد پر جو خرچ کر دیا

اس سے کہیں بہتر بات یہ تھی کہ سڑکوں اور پلوں، قلعوں وغیرہ کے بنانے میں اس رقم کو لگا تا۔ چچا نے یہ سن کر کہا کہ بیٹے ایسا خیال ہرگز نہ کرنا۔ میرے نزدیک تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولید کو توفیق عطا کی گئی تھی اور شاید اس پر یہ کھولا گیا کہ شام عیسائیوں کا ملک ہے، جہاں ان کے بہترین بڑے بڑے گرجے بنے ہوئے ہیں، جن کی آرائش وزیبائش میں بڑا زور صرف کیا گیا ہے۔ مثلاً قمامہ کا یالد کا گرجا، مسلمان ان گرجوں کو دیکھ کر ممکن تھا کہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے۔ ولید کو خدا نے توفیق دی اور ایسی چیز بنا کر چلا گیا کہ اس کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہو رہا ہے۔

ایک طرف تو آپ ان طلسم ہوشربائی داستانوں کو سن رہے ہیں جو اسلامی سلاطین کے متعلق بیان کرنے والے بیان کرتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان سلاطین کے گرد و پیش میں جو امراء رہتے تھے ان پر بھی ان کی بری صحبتوں کا کچھ اثر پڑا ہو۔

سردی اور گرمی کا عجیب وغریب نظام

ابن ابی اصیبعہ نے بغداد کے ایک طبیب کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ جس کمرے میں وہ رہتا اور آرام کرتا تھا اس کے اطراف میں اس نے بعض ذیلی مکانات ایسے بنا رکھے تھے، جن میں گرمیوں کے موسم میں برف کے تودے جمع کر دیئے جاتے تھے اور اس کے غلام اس پر پنکھا کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح جاڑوں میں بجائے برف کے اس میں دہکتے ہوئے انگاروں کا انبار جمع کر دیا جاتا تھا اور لوہار جس طرح مشکوں سے اپنی بھٹی کو پھونکتے ہیں، اس کے غلام ان انگاروں کو پھونکتے تھے اور یہ ساری کارروائی اس طریقہ سے انجام دی جاتی تھی کہ کمرے میں بیٹھنے والوں کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ [دیکھو عیون الانباء، صفحہ ۱۴۰ ج ۱]

لیکن اس قسم کی عیاشیاں بشرطیکہ انہیں اس زمانہ میں عیاشی قرار دی جائے محض چند مخصوص امراء تک محدود تھیں ورنہ جہاں تک ان ہی مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گو طویل وعریض مکانوں کے بنانے کا تو مسلمانوں کو ضرور شوق تھا، مصر والوں کے متعلق ابن حوقل ہی نے لکھا ہے کہ:

''ان لوگوں کی حویلیاں اور ڈیوڑھیاں چند منزلوں کی ہوتی ہیں۔ چھ چھ، سات سات اور پانچ پانچ منزلوں سے کم نہیں ہوتیں۔ بسا اوقات ایک ایک گھر میں دو دو سو آدمی رہتے ہیں۔''

پھر ایک لطیفہ یہ بیان کیا ہے کہ:

''فسطاط (مصر کا قدیم پایہ تخت) میں دار عبدالعزیز کے نام سے ایک مکان مشہور ہے۔ اس مکان کے رہنے والوں کے لئے روزانہ چار سو پکھالوں کے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۲۶]

اس زمانے کا تعمیری مواد

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ معمولی قصبوں اور دیہاتوں ہی میں نہیں، بڑے بڑے عظیم الشان شہروں میں مسلمان مکان عموماً مٹی کا بنایا کرتے تھے اور بہت زیادہ تکلف سے کام لیا گیا تو آجر (پکی اینٹ) اور جص (گچھ) استعمال کرتے تھے۔ یہ ان کے تکلف کی انتہاء معلوم ہوتی ہے۔

ابن حوقل نے آذربائیجان کے عنوان کے نیچے لکھا ہے کہ اس علاقہ کا سب سے بڑا شہر اس وقت اردبیل ہے۔ اسی میں معسکر (چھاؤنی) بھی ہے اور دار الامارۃ بھی، اسی کا بیان ہے کہ ثلاثین فرسخ (یعنی نوے میل تک) اس ضلع کے حدود ہیں۔ لیکن بتاتا ہے:

''والغالب علی بنائها الطین والاجر'' [ابن حوقل، صفحہ ۲۳۷]

ترجمہ: زیادہ تر مکانات اس علاقے کے مٹی اور اینٹ کے ہیں۔

پھر ''الدیلم'' کے تحت لکھتا ہے کہ سب سے بڑا شہر اس علاقے کا ''رے'' ہے۔ مگر:

''هی مدینة بناؤ هامن طین و یستعمل فیها الاجر والجص''

ترجمہ: اس شہر کی عمارتیں بھی مٹی ہی کی بنی ہوئی ہیں۔ جس میں اینٹ اور گچھ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ [ابن حوقل، صفحہ ۲۶۹]

دوسری جگہ پھر اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے:

"والری مدینة لیس بعد بغداد بالمشرف مدینة اعمر منها الا ان نیشاپور اکبر منها عرصة" [ابن حوقل]

ترجمہ: رے مشرق کا اتنا بڑا شہر ہے کہ بغداد کے بعد مشرق میں اس کی بڑائی کا کوئی دوسرا شہر مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ہاں صرف نیشاپور اپنے طول وعرض میں اس سے بڑا ہے۔

مگر عمارتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے متعلق بھی وہی کہتا ہے کہ:

"والغالب علی بنائها الطین" [ابن حوقل، صفحہ ۲۶۵]

ترجمہ: عمارتوں میں زیادہ تعداد ان ہی کی ہے جو مٹی سے بنائی گئی ہیں۔

اسی طرح ہمدان کے ذکر میں بھی لکھا ہے:

''یہ نیا بسایا ہوا اسلامی شہر ہے، اس کی چاروں طرف فصیل بھی ہے۔ چار دروازے ہیں جن پر لوہے کے پھاٹک جڑے ہوئے ہیں، لیکن عمارتیں یہاں کے باشندوں کی مٹی ہی کی ہیں۔ ان کے یہاں بھی پانی کی کثرت ہے۔ باغوں سے بھرا ہوا ہے، بہتے ہوئے چشموں سے کھیتی ہوتی ہے۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۲۶۰]

اپنے زمانے کے اصفہان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''عراق سے خراسان تک، رے کے بعد اصفہان سے بڑا کوئی شہر نہیں ہے۔''

اسی اصفہان اور اس کے ایک محلہ کے متعلق جس میں کسی زمانے میں یہودی رہتے تھے، اس لئے اس حصہ کا نام یہودیہ پڑ گیا تھا اور دوسرے محلہ کا نام شہرستانہ تھا، بہرحال دونوں ہی کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ:

''الجبال کے علاقہ کا سب سے زیادہ زرخیر سیر حاصل خطہ ہے، بہت وسیع ہے۔ آبادی، دولت، تجارت، ہر قسم کی سہولت، فواکہ، میوہ جات، الغرض جس لحاظ سے دیکھو الجبال میں اس کا مقابل کوئی دوسرا شہر نہیں ہے۔''

مگر باوجود ان تمام باتوں کے:

"بناؤ هما من طين"

ترجمہ: اصفہان کے دو محلوں (یہودیہ اور شہرستانہ) دونوں کی عمارتیں مٹی کی ہیں۔

اور میں کہاں تک مثالیں دیتا چلا جاؤں، انتہا یہ ہے کہ بجستان کا مرکزی شہر جس کا نام ابن حوقل نے زرنج بتایا ہے اور لکھا ہے کہ:

''اس علاقے کا سب سے بڑا شہر زرنج ہے۔ یہ بھی فصیل رکھتا ہے۔ عمارتیں اس کی وسیع ہیں۔ مکانوں کی کثرت ہے۔ اسی علاقے کا دارالامارت ہے۔ خندق جو فصیل کے چاروں طرف ہے، اسی کے اندر ایک چشمہ ہے اور دوسرے چشمے بھی اسی میں آ کر گرتے ہیں۔ پانچ دروازے ہیں۔''

پھر ہر دروازے کا نام اور اس کی صفت بیان کرنے کے بعد اسی نے لکھا ہے کہ اس علاقے کی آب و ہوا ایسی ہے کہ لکڑیوں میں فوراً گھن لگ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں کے لوگ اپنے مکانوں میں لکڑی نہیں خرچ کرتے۔ مگر باوجود اس کے بھی:

"ابنيتها كلها طين آمزاج معقودة" [صفحہ ۲۹۸]

ترجمہ: سارے مکانات اس علاقہ کے بھی مٹی کی کہگل کے ہوتے ہیں۔

مقصود اس طول بیانی سے یہ ہے کہ سلاطین اور ان کے ولاۃ و حکام کے مقابلہ میں مسلمانوں کا مذاق تعمیر کے متعلق عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ایک طرف تو قرآن:

﴿اتبنون بكل ريع اية تعبثون وتتخذون مصانع لعلكم تخلدون﴾

ترجمہ: کیا تم ہر اونچے مقام پر بے ضرورت یادگاریں بناتے اور بڑے بڑے محل تعمیر کرتے ہو۔ گویا تمہیں دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔ [سورہ شعراء]

کی کڑتی ہوئی آواز میں "الحیوۃ الدنیا" کی حقیت جو واضح کر رہا تھا، یعنی یہاں اس قسم کا کوئی کام کرنا جس سے معلوم ہوتا ہو کہ کام کرنے والے کو اپنے متعلق شاید خلود اور واقعی بقائے دوام کا مغالطہ لگ گیا ہے، بدترین حماقت ہے۔ اس لئے قرآنی روشنی میں اس قسم کی

حماقتوں سے بچ کر وہ خود بھی آرام سے رہنا چاہتے تھے اور اپنے مہمانوں اور عام مسافروں کو بھی آرام پہنچانا چاہتے تھے۔ ان دونوں مسئلوں میں تطبیق دینے کی یہی شکل ہو سکتی تھی کہ بنانے کے لئے یوں تو وہ بڑے بڑے مکان، اونچی اونچی دیواریں اور اونچے اونچے دروازے وسیع اور طویل وعریض کمرے بناتے تھے۔ گذر چکا کہ ایک ایک مکان میں دو دو سو آدمیوں کی گنجائش ہوتی تھی۔ اتنے ہی بڑے بڑے مکان بخارا میں بھی ملتے ہیں اور مصر میں بھی۔ لیکن اسی کو ثابت کرنے کے لئے بنانے والے کو خلود کا مغالطہ نہیں لگا ہے۔ عموماً مٹی یا زیادہ سے زیادہ اینٹوں اور گچ تک وہ پہنچتے تھے۔

مٹی کے مکانات کی حکمت

یہ ہو سکتا ہے کہ مٹی کے ان مکانات کے متعلق کوئی طبی نقطہ نظر بھی ان کے سامنے ہو۔ الہمذانی جو تیسری صدی ہجری کا مصنف ہے، صحت وعافیت کے لحاظ سے مکانوں کے متعلق مسلمانوں میں کس قسم کے خیالات اس زمانے میں پھیلے ہوئے تھے، ان ہی کو ظاہر کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ:

> ''مکان بنانے کا بہترین محل وموقعہ ٹیلہ اور بلند جگہ ہے، تاکہ اس میں رہنے والوں کی نگاہ نیچے کی چیزوں پر پڑتی رہے۔ اسی طرح مکانوں کے رخ اور دروازے، کھڑکی وغیرہ کے لئے بہترین سمت مشرق ہے، کیونکہ بدن کی صحت پر اس کا اچھا اثر اس لئے پڑتا ہے کہ آفتاب کی شعاعوں اور اس کی روشنی سے استفادے کا موقعہ اس قسم کے مکانات میں بہت جلد حاصل ہوتا ہے۔ چاہئے کہ مکان جب بنائے جائیں تو وہ کشادہ ہوں اور بلندی ان میں کافی رکھی جائے اور اس کا تو ہمیشہ خیال کرنا چاہئے کہ دروازہ جب مکان کا ہو تو مشرق ہی کی طرف ہو۔'' [ابن الفقیہ الہمذانی صفحہ ۱۰۳]

کیا تعجب ہے کہ مٹی کے مکان کے متعلق مسلمانوں کا یہی خیال ہو کہ گرما و سرما اور ہر قسم

کے موسم میں وہ عافیت بخش ہوتا ہے۔ گرمیوں میں زیادہ تپتا نہیں ہے۔ اور سردیوں میں حد سے زیادہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ البتہ مٹی کے مکانوں کے لئے ایک چیز کی سخت ضرورت ہے۔ یعنی اس کی صفائی، لیپ، پوت کی طرف پوری توجہ رکھنی پڑتی ہے اور آپ دیکھ چکے ہیں۔ ماوراء النہر کے مسلمانوں کا اس باب میں ابن حوقل نے کیا حال بیان کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے تعمیری مذاق کی اس خصوصیت پر جب مجھے تنبہ ہوا ہے ایک بڑا مسئلہ حل ہوگیا۔ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں پہنچنے کے بعد بیان کرنے والوں کی زبانی مختلف قصبات و دیہات کے متعلق اس قسم کی باتیں جب سننے میں آتی ہیں کہ عہد اسلامی میں اس بستی کے لوگ بڑے خوشحال تھے، اتنی سواریاں روزانہ نکلا کرتی تھیں، یہ تھا وہ تھا۔

لیکن عموماً اس قسم کے مقامات میں خاک کے ایک بڑے تودے کے سوا چونکہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے دل سوال کرتا ہے کہ اگر واقعی یہاں کے باشندے کسی زمانہ میں فراغبالی اور امارت و ریاست کی زندگی بسر کرتے تھے تو ان کے مکانوں کے ٹوٹے پھوٹے آثار تو کہیں ملنے چاہئیں۔ لیکن بجز خاص خاص، بستیوں کے جہاں اب بھی پتلی اینٹوں کی بڑی بڑی حویلیاں اپنے بنانے والوں کی عظمت و شان کی نوحہ خوانیوں میں مصروف ہیں۔ عموماً ''تودۂ خاک'' کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ملتی تھی اور جیسا کہ اس زمانہ میں یہ اور کرادیا گیا ہے کہ اپنے اسلاف کے حالات کے بیان کرنے میں مسلمان عموماً مبالغہ، بلکہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ خیال گذرتا تھا کہ شاید یہ بھی اسی قبیل کی چیز ہو۔

کچے مکانات

لیکن بحمد اللہ جب سے مسلمانوں کے اس عام تعمیری مذاق کا علم ان مورخین کے ذریعہ سے ہوا ہے، مسئلہ واضح ہوگیا۔ واقعہ یہی تھا کہ عموماً مسلمان خام یعنی کچے مکانوں ہی کے بنانے کے عادی تھے۔ امارت اور غربت کا فرق مکان کے طول و عرض، وسعت و کشادگی سے نمایاں ہوتا تھا۔ ورنہ مٹی سے بنانے میں امیر ہوں یا غریب دونوں برابر تھے۔

مسلمانوں کی بعض پرانی بستیاں جواب ویران ہو کر کھنڈر بن چکی ہیں۔ ان میں اب بھی جا کر آپ دیکھ سکتے ہیں۔ بڑی بڑی اونچی اونچی دیواریں ان کی آپ کو نظر آئیں گی، لیکن ہوں گی وہ دیواریں مٹی ہی کی۔

مکانات کی تعمیر میں روشنی اور ہوا کا خاص خیال

مکان کے مسئلہ میں مسلمانوں کا عام مذاق جیسا کہ بیان کر چکا ہوں یہ تھا کہ وسعت و کشادگی اور فراخی کے لحاظ سے تو وہ ایسے ہوتے تھے کہ دو دو سو مہمانوں تک کے اتارنے کی گنجائش آنِ واحد میں ایک ایک مسلمانوں کے گھر میں نکل آتی تھی۔ اسی کے ساتھ ہوا اور روشنی کا بھی معلوم ہوتا ہے کہ عموماً خیال رکھا جاتا تھا، لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں با ایں ہمہ ہوتے تھے اکثر و بیشتر یہ مکان مٹی ہی کے۔ میں نے کہا تھا کہ ویران ہونے کے بعد بھی وجہ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں کی بستیاں کھنڈروں کی شکل میں نظر نہیں آتیں بلکہ جہاں سے اٹھ کر کسی وجہ سے دوسری جگہ لوگ منتقل ہو جاتے تھے تو وہی مٹی جو دیواروں اور مکانوں کی دوسری چیزوں میں اٹھا کر لگائی جاتی تھی پھر زمین ہی میں واپس ہو کر زیادہ سے زیادہ کسی ٹیلہ کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ لیکن ایسے ویران کھنڈر جنہیں دیکھ کر آدمی کو وحشت ہو اور خواہ مخواہ ذہن اس طرف منتقل ہو کہ ان میں بھوت اور جن رہتے ہیں۔ عموماً مسلمانوں کی عام آبادیاں اس شکل کو اختیار نہیں کرتی تھیں۔ الا ماشاء اللہ۔

جنوں اور دیوؤں کی تعمیر

قدیم شہروں کے خرابے مثلاً بعلبک، اصطخر اور مصر وغیرہ کے پرانے ویران شہروں کو دیکھ کر یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے عوام عموماً ان کے متعلق خیال کر لیتے تھے کہ وہ جنوں اور دیوؤں کے بنائے ہوئے ہیں۔

الہمدانی نے ایک موقعہ پر یہ قصہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ لد کے کسی شخص سے ہم نے کہا کہ تمہارے یہاں یہ بڑے بڑے کوہ ہیکل مکانوں کے کھنڈر جو دور تک پھیلے ہوئے ہیں، کیا جنوں نے سلیمان علیہ السلام کے لئے ان کو بنایا تھا؟ اس پر اس لدی نے

جو غالباً عیسائی یا یہودی تھا، کہا کہ "تم مسلمانوں کا عجیب حال ہے کہ جب کوئی عمارت ایسی تمہیں نظر آتی ہے جو تمہارے خیال میں غیر معمولی ہوتی ہے تو اس کو تم لوگ جن اور شیاطین کی طرف منسوب کردیا کرتے ہو۔" [الہمدانی صفحہ ۱۱۷]

قبر کو کچا رکھنے کی حکمت

اور میں تو سمجھا ہوں کہ مسلمانوں کو مقابر کے متعلق جو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں کچی رکھیں اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ پختہ قبروں والے قبرستان امتدادِ زمانہ سے ٹوٹی پھوٹی قبروں، گری پڑی چھتوں اور الٹے ہوئے تعویذوں وغیرہ کی وجہ سے کچھ ڈراؤنے سے ہوجاتے ہیں۔ کچے قبرستانوں میں یہ کیفیت نہیں پیدا ہوسکتی۔ پس آدمی جس مٹی سے پیدا ہوا تھا اسی میں واپس کردیا گیا۔ کچھ دن قریب قریب کے رشتہ داروں کی تسلی کے لئے ذرا قبر کی پشت نمایاں کردی جاتی ہے، لیکن عموماً ایک دو پشت کے بعد پھر کسی کو خیال بھی نہیں رہتا کہ اس کی اوپر والی سیڑھیوں والے کون لوگ تھے اور کہاں مرے، کہاں دفن ہوئے۔ فراموشیدگی اور نسیان کے اس عہد کے آنے تک کچی قبروں کے کوہان بھی ذہن سے برابر ہوجاتے ہیں اور پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہاں لوگوں کی قبریں تھیں بھی یا نہیں۔

بہرحال جہاں تک قرائن وقیاسات کا اقتضاء ہے، میں ان ہی کی بنیاد پر یہ کہنا چاہتا تھا کہ منجملہ دیگر اغراض کے اپنے مکانوں کی تعمیر میں عموماً مسلمان پردیسی مسافروں اور مہمانوں کا بھی خاص طور پر خیال کیا کرتے تھے۔ المقریزی نے گو صرف مصر کے مسلمانوں کا یہ حال بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

> "صاحب مقدرت گھرانوں میں قاعدہ ہے کہ کھانا عموماً ضرورت سے زیادہ اس لئے پکوایا جاتا ہے کہ وقت پر اگر کوئی مہمان یا مسافر آجائے تو اسے تکلیف نہ ہو۔ اور زائد از ضرورت کھانے کی مقدار بھی کافی ہوتی ہے۔ اگر اس دن مہمانوں یا مسافروں کا کوئی مجمع نہیں پہنچتا ہے تو نوکر چاکر اسے لے

جاتے ہیں اور اپنے بال بچوں میں تقسیم کرتے ہیں یا اس کو بیچ کر پیسے کھرے کر لیتے ہیں۔'' [المقریزی صفحہ ۳۱۸ ج ۱]

یہ بات کہ اس دستور کا تعلق کچھ مصر کے خوشحال مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا۔ اس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ ہندوستان تک کے مسلمانوں میں اپنی حکومت کے آخری دنوں تک ہم اس دستور کے آثار ونتائج کو محسوس کرتے ہیں۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ امیر الامراء حسین علی خاں جس زمانے میں اورنگ آباد کے صوبہ دار تھے، ان کے باورچی خانے میں اتنا کھانا پکتا تھا کہ عام طور پر ایک پیسہ میں ان کے نوکروں سے بریانی کا ایک ایک قاب لوگوں کو مل جاتا تھا۔ خود حیدر آباد کے ارباب نعمت وثروت کا تماشا آج سے تیس چالیس برس پہلے جن لوگوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا ہے وہ اب بھی اس کی شہادت ادا کرتے ہیں کہ ان گذرے ہوئے امیروں کے مطبخ کا عام دستور یہی تھا۔ یہی وجہ اس بات کی ہے کہ مغربی تمدن کا قدم جب تک راسخ نہیں ہوا تھا، آپ کو حیدر آباد میں اس قسم کے بڑے بڑے ہوٹل، کیفے نہیں مل سکتے تھے جن سے آج اس شہر کا گوشہ گوشہ معمور ہے۔ دراصل مہمان نوازی اور مسافر پڑوہی کے عام دستور نے کرایہ کے ان طعام خانوں اور قیام خانوں کی ضرورت ہی پیدا ہونے نہیں دی تھی۔

خیر میں پھر دوسرے مسئلہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ گفتگو مکانوں کے متعلق ہو رہی تھی۔ میرے دعوے کی تائید میں ابن حوقل ہی کا وہ بیان بھی قابل توجہ ہے جو ماوراء النہر ہی کے حالات کے سلسلہ میں اس نے بیان کیا ہے کہ:

''تم عموماً یہاں کے ارباب ثروت ونعمت کو پاؤ گے کہ اپنی دولت کا بہت بڑا مصرف ان لوگوں کے نزدیک اس قسم کی باتیں ہیں۔ مثلاً سرائیں بنوانے، راستوں کا درست کرنا اور پلوں کی تعمیر، عام حال یہی ہے۔ چند استثنائی صورتوں میں نہیں کہتا۔''

اس کے بعد وہ لکھتا ہے:

"لیس من بلاده طریق مطروق ولا قریة آھلة الا وفیھا من الرباطات مایفضل عمن ینزل به ممن یطرقه" [ابن حوقل ص ۳۳۹]

ترجمہ: کوئی شہر یا کوئی گذرگاہ جس میں لوگوں کی آمد و رفت ہو یا کوئی آباد گاؤں ایسا نہیں ہے جس میں بڑی بڑی سرائیں بنی ہوئی نہیں ہیں، اتنی بڑی کہ اترنے والوں کے بعد بھی جگہ اس میں باقی رہتی ہے۔

مسافر خانوں اور سراؤں کی تعداد

پھر ان رباطوں یعنی مسافر خانوں اور سراؤں کے اعداد و شمار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ صرف اس علاقے (ماوراء النہر) میں دس ہزار سے اوپر رباطات (سرائیں) ہیں۔"

اور کیسے رباطات؟ اسی کے الفاظ ہیں:

"فی کثیر منھا اذا نزل النازل اقیم علف دابته وطعامه"

ترجمہ: بہت سی سرائیں تو ایسی ہیں جن میں اس کا انتظام ہے کہ مسافروں کو ان کے جانوروں کو کھانا چارہ سرائے ہی کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ [ایضاً صفحہ ۳۳۹]

پانی پلانے کا انتظام اور رفاہِ عام کے اوقاف

اور گو اس زمانہ میں ہر جگہ اس کا انتظام ناممکن تھا، لیکن ابن حوقل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ماوراء النہر میں علاوہ قیام و طعام کے مسلمانوں نے مسافروں اور عام راہ گیروں کے لئے فیاضی کے ساتھ جس چیز کا نظم کر رکھا تھا وہ برف کا پانی تھا۔ میں بجنسہ ابن حوقل کے الفاظ نقل کر دیتا ہوں۔ لکھتا ہے اور اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے:

"وقل مارأیت خاناً اوطرف سکة اومحلة او مجمع ناس الی حائط بسمرقند یخلو من ماء جمد مسبل" [ابن حوقل، ص ۳۳۹]

ترجمہ: اور میں نے ایسا بہت کم دیکھا کہ کہیں مسافر خانہ ہو، یا سڑک کا موڑ یا ناکہ ہو، یا کوئی محلہ ہو، یا کسی دیوار کے کنارے (سایہ لینے کے لئے) لوگ جمع ہوتے ہوں، وہ برف کے پانی کی سبیل سے خالی ہو۔

"مسبل" کا لفظ بہ ظاہر سبیل سے بنالیا گیا ہے۔ اللہ کی راہ میں ثواب کی نیت سے کوئی کام کرنا، سبیل کے معنی لغت میں یہی لکھے ہیں۔ منتہی الارب میں ہے "مسبلہ تسبیلا" (دریافت آنرا در راہ خدائے تعالٰی) مشین سے برف بنانے کا عام طور پر اگرچہ رواج اس زمانہ میں نہیں تھا۔ لیکن جن ممالک مین سردیوں کے زمانے میں برف پڑتی تھی اور سردسیر ممالک کا یہ عمومی حال ہے، ماوراء النہر بھی ان ہی علاقوں میں ہے۔ جیسا کہ میں نے براہ راست اپنے رفقاء درس سے جو بخارا وغیرہ کے رہنے والے تھے سنا ہے کہ سردیوں کے موسم میں لوگ بڑے بڑے عمیق گڑھوں اور خندقوں میں برف کو گاڑ دیتے ہیں۔ پھر جب گرمی کا موسم آتا ہے تو ان ہی گڑھوں سے نکال نکال کر خرچ کرتے ہیں۔

زمانۂ طالب علمی کے قصے

بے ساختہ اس وقت زندگی کے وہ پرانے دن یاد آ گئے جب ٹونک اور دیوبند میں یہ فقیر طالب العلمی کرتا تھا۔ میرے ساتھ یہ عجب حسن اتفاق ہوا کہ جہاں کہیں رہا بخارا، سمرقند، ہرات، ترمذ، کابل، قندھار کے طلبہ سے عموماً میرے روابط دوستانہ ہو جاتے تھے۔ زیادہ تر ان علاقوں سے میری دلچسپی ان ہی لوگوں کی صحبت اور طویل رفاقت کا نتیجہ ہے۔ ان میں بعض میرے ہمدرس تھے اور بعض خصوصی طور پر مجبور کر کے مجھ سے پڑھتے تھے۔ قازان (روس) کے ایک بزرگ عاصم نے جب دیوبند میں شروع شروع آئے اور اردو سمجھنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی تو منطق اور فلسفہ کی کتابیں بطور مشغلہ کے عربی زبان کے توسط سے وہ مجھ سے پڑھتے رہے۔ یہ ایک روشن خیال روسی ترک تھے۔ فوج سے بھاگ کر مکہ معظمہ چلے گئے اور مکہ معظمہ سے ہندوستان آئے۔ ہندوستان میں تلاش کر کے دیوبند کو اپنا ٹھکانا انہوں نے بنالیا تھا۔ اخبار پڑھنے

کا ان کو بہت شوق تھا۔ اردو نہیں آتی تھی۔ بہت الجھتے تھے، آخر میں بہت جلد اردو سمجھنے لگے۔ زار کی حکومت کا تختہ جب الٹ رہا تھا اور بولشویک اقتدار تام کی آخری خبر جس دن اخباروں میں چھپی تو باوجود باوقار آدمی ہونے کے عاصم بے کو میں نے دیکھا کہ وہ ناچ رہے ہیں۔ شورائی حکومت سے ان کی بڑی توقعات تھیں، جو غالباً غلط ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد وہ وطن چلے گئے۔ پھر پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے۔ اسی طرح ٹونک میں ایک نوجوان بہت ہی خوش رو سبزہ آغاز طالب العلم معلوم نہیں کہاں سے بھٹک کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ یہ شاش کے رہنے والے تھے، جسے اب تاشقند کہتے ہیں۔ باوجود حسین ہونے کے اس شخص کے چوڑے ہڑے پنجے اور مجموعی ہیئت کذائی اتنی خوفناک تھی کہ دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ یہ بھی زمانہ تک نظامیہ درس کی ابتدائی کتابیں قطبی، شرح تہذیب، کنز وغیرہ مجھ ہی سے پڑھتے تھے۔ فارسی ذریعہ تفہیم تھی۔ غصہ ناک پر رکھا رہتا تھا۔ ہمیشہ اس وہم میں رہتے کہ غریب الوطن ہونے کی وجہ سے لوگ مجھ سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ ادنیٰ شبہ بھی اس کا ہوا اور منہ لٹکا لیتے تھے۔ اسی لئے میں نے مزاحاً ان کا نام غضبان رکھ چھوڑا تھا۔ اور اسی نام سے وہ مشہور ہو گئے۔ حتیٰ کہ اصلی نام ان کا مجھے یاد بھی نہیں رہا۔ وہ ہفتہ میں کم از کم ایک دفعہ مجبور کرتے کہ ''گذر پلاؤ'' جو خاص طریقہ سے وہ پکاتے تھے۔ وہ ان سے پکواؤں۔ بہت جلد تیار کر لیتے تھے۔ گاجر کو کدوکش کر کے چاول میں ملا لیتے تھے اور کچھ دوسرے مصالحوں کے ساتھ گوشت، یہ واقعہ ہے کہ اپنی ساری عمر میں مولوی غضبان کے گذر پلاؤ کی لذت مجھے دنیا کے کسی کھانے میں نہیں ملی۔ میں نے ان کو ایک دن دیکھا کہ بیٹھے رو رہے ہیں۔ مولانا غضبان! کیا ہے؟ چیخ مار کر بولے۔ حضرت استاذ! آج گرمی کے موسم میں مجھے اپنا گھر بے ساختہ یاد آ رہا ہے۔ یہی موسم ہے جس میں ہمارے یہاں عموماً دستور ہے کہ لوگ مہینے دو مہینے کے لئے اپنے اپنے باغوں میں چلے جاتے ہیں۔ عورتیں، بچے سب ساتھ باغ میں رہتے ہیں۔ بہتے ہوئے چشموں سے سیراب درختوں میں خصوصاً سیب جس کی بیسیوں قسم بتاتے تھے اور طرح طرح کے پھل، دنبہ کا گوشت، چشمے کا پانی، بس یہی اس زمانے کی غذا اور پھلوں کی نگرانی، یہ ہم لوگوں کا کام ہوتا ہے۔

میرے بھائی اور بہنیں، والد، والدہ، سب باغ میں ہوں گے اور میں بدقسمت اس سنگستان، اجڑے دیار راجپوتانہ میں ہوں۔ میں ان کو قصے سنا سنا کر تسلی دیتا تھا۔ بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ ان کا بھی حال معلوم نہ ہو سکا کہ کیا ہوئے۔

دیوبند میں مولانا عبدالحکیم بخاری حدیث کے دورے میں میرے ساتھی تھے۔ اللہ اللہ ان کے اخلاق کریمانہ، مجھ سے عمر میں بہت زیادہ تھے، لیکن سبق سے واپس آنے کے بعد مجھ سے کہتے کہ استاذوں کی سنی ہوئی تقریروں کو پھر تم سمجھادو، حضرت مولانا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے درس کا نوٹ عربی میں، میں التزاماً لکھا کرتا تھا۔ ضخیم مجلد کی شکل اس نے اختیار کر لی تھی۔ مولوی عبدالحکیم نے حرف حرف اس کو نقل کیا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ بخارا پہنچ کر اسی کے ذریعہ سے تیری یاد کو تازہ کرتا رہوں گا۔ باوجود مسافرت اور غریب الوطنی کے ہمیشہ کچھ نہ کچھ پکا کر کھلایا کرتے۔ ایک قسم کا پلاؤ یہ بھی پکاتے تھے۔ میرے سمرقندی دوست نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ اب وہاں کا حال کیا پوچھتے ہو۔ بہت بڑا مشغلہ شہر والوں کا یہ رہ گیا ہے کہ کسی خاص میدان میں لوگ انڈے لے لے کر اکٹھے ہوتے ہیں اور ان ہی کو لڑاتے ہیں۔ جس کا انڈا ٹوٹ جاتا وہ اپنا انڈا ہار جاتا ہے۔ سب سے زیادہ ہمارے یہ ماوراء النہری کے احباب اپنے ملک کی جس بات کے شاکی تھے وہ اس ملک کی اخلاقی پستی تھی۔ علماء تک کا کردار جیسا کہ ان ہی لوگوں کا بیان تھا ناگفتہ بہ حد تک برباد ہو چکا تھا۔ میں ان سے پوچھتا تھا کہ سارا علم تو ہندوستان میں اسی علاقے سے آیا۔ بخاری شریف بخارا میں لکھی گئی، شفا اور اشارات کا مصنف بھی بخاری ہے۔ لیکن یہ کتابیں چھپتی ہندوستان میں ہیں۔ وہاں کے مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے؟ قرآن تک چھپا ہوا بخارا کا نظر سے آج تک نہیں گذرا۔ نہ کوئی مصنف پیدا ہوا۔ نہ مدرس، نہ شاعر۔ تو گردن جھکا لیتے اور اس کی توجیہ میں وہ ایسی باتیں بیان کرتے تھے کہ کلیجہ کانپ جاتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ان ممالک پر جو مصائب آئے ہیں ان میں غیروں کے ساتھ ساتھ خود ان کے مظالم کو بھی دخل ہے۔ خدا کرے کہ مصیبت کا پہاڑ جو ان پر ٹوٹا ہے، وہ ان کی بیداری کی

وجہ بن جائے۔ بہر حال کچھ بھی ہو، اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام اور پیغمبر اسلام سے ان کا اعتقادی رشتہ مسلمانان ہند سے کسی طرح کم مضبوط نہیں نظر آتا۔ میں یہ ماننے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہوں کہ ماوراء النہر کے سارے مسلمان مرتد اور دہریے ہو گئے ہیں۔ کاش! خدا کا کوئی بندہ ان ممالک کے مسلمانوں کی صحیح رپورٹ لاتا۔ بے ساختہ دماغ میں اس وقت یہ خیالات موجزن ہوئے اور خواہ مخواہ قلم تک آ گئے۔ معلوم نہیں ان لوگوں پر کیا گذری۔

قصبہ قراتگین نواحی بخارا کے مولانا عبدالرحمن اور کابل کے مولانا حفیظ اللہ کی یاد شاید دن میں ایک دفعہ تو ضرور آ جاتی ہے، اللھم ارحم اینما کانوا۔

مفت میں ٹھنڈا پانی

اور پیچھے جو گذری یہ تو ابن حوقل کی عینی شہادت ہے، اسی کے بعد سنی ہوئی ایک روایت یہ درج ہے کہ:

> ''ایسے آدمی سے جن کی خبر پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ شہر سمرقند کی فصیل کے احاطہ میں دو ہزر سے زیادہ مکان ایسے ہیں جن میں برف سے ٹھنڈا کیا ہوا پانی مفت بہم پہنچتا ہے۔ اس کے لئے اوقاف ہیں اور ان ہی اوقاف کی طرف سے سقابے بنے ہوئے ہیں۔ کہیں مسی اور کسی جگہ مٹی کے بڑے بڑے خم اور مٹکوں میں پانی روزانہ بھروا دیا جاتا ہے اور لوگ ان سے نفع اٹھاتے ہیں۔''

اوقاف اور ان کے مصارف کی مختلف نوعیت کے لحاظ سے مسلمانوں کی تاریخ میں عجیب چیزیں ملتی ہیں۔ یہاں تو خیر برف کے پانی کے لئے وقف کا ذکر ہے۔ اس قسم کے اوقاف دمشق میں بھی تھے اور مراکش میں بھی۔

مختلف ممالک میں وقف کے مصارف

ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ دمشق ہی میں ایک وقف کا مصرف صرف یہ ہے کہ کسی غلام

سے چینی کے برتن اگر ٹوٹ جائیں تو فوراً غلام کی طرف سے اس برتن کا معاوضہ برتن ہی کی شکل میں مالکوں کے پاس پیش کر دیا جائے۔ لکھا ہے کہ ہر سال اس وقف میں کافی ذخیرہ چینی کے ظروف کا اسی لئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح مختلف علاقوں میں غرباء کی لڑکیوں کی شادی کے لئے اوقاف ہوا کرتے تھے۔

ایک صاحب نے مکہ معظمہ میں اس لئے وقف کیا تھا کہ کتوں کو شہر مکہ میں نہ داخل ہونے دیا جائے۔ اسی کا نظم ان کے وقف کی آمدنی سے کیا جاتا تھا۔ بعضوں نے اس لئے اوقاف کئے تھے کہ جن مسلمانوں کی عورتوں کے پاس زیور نہ ہوں، عاریۃً ان کو ضرورت کے وقت زیور دیئے جائیں۔ مکہ معظمہ ہی میں ایک وقف اس لئے تھا کہ تقریبات کے موقعہ پر فرش وفروش کا انتظام کیا جائے۔

مسلمان بچوں کی ختنہ کے لئے بعضوں نے ٹیونس میں وقف کیا تھا۔ دلچسپ وقف ٹیونس ہی میں ایک یہ تھا کہ سال کے خاص موسم میں ساحل ٹیونس پر ایک خاص قسم کی لذیذ مچھلیاں نمایاں ہوتی تھیں، قیمت ان کی اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ ہر شخص خرید کر کھا نہیں سکتا تھا۔ کسی امیر نے اسی لئے جائیداد وقف کر دی تھی کہ اس کی آمدنی سے یہ موسمی مچھلیاں غرباء کو مہیا کی جائیں۔ ایک اور لطیف وقف اس مقصد سے کیا گیا تھا کہ میاں بیوی میں کسی کے اگر جھگڑا ہو جائے اور بیوی روٹھ کر میاں کے گھر سے باہر ہو جائے تو جب تک دونوں میں میل نہ ہو بیوی کے مصارف ان کے وقف سے ادا کئے جائیں۔ ان عورتوں کے لئے ایک مکان بھی مراکش میں بنا ہوا تھا۔ جس کا نام دار الدقہ تھا۔ مراکش میں ایک اور بڑا وقف ان لوگوں کی خبر گیری کے لئے ہے جو مجنوں اور دیوانے ہو جائیں، اور یہ کہ شہر کے غرباء میں ہر سال موسم سرما میں کپڑے تقسیم کئے جائیں۔

ایک فرانسیسی سیاح نے مراکش ہی کے متعلق لکھا ہے کہ وہاں ایک اسلامی وقف ہے جس کے مصارف سے اتنا بڑا مکان بنایا گیا ہے، جس میں اسی سیاح نے دیکھا کہ چھ ہزار اندھوں کو پناہ ملی ہوئی تھی۔ ان کے کھانے پینے، لباس اور تمام ضرورتوں کا کفیل وقف تھا۔

غرضیکہ کوڑھیوں، معذوروں، بیماروں وغیرہ کے لئے اوقاف کی فہرست اسلامی ممالک کی بہت طویل ہے۔ [دیکھو حاضر العالم الاسلامی کا حاشیہ از شکیب ارسلان، صفحہ ۲۹۲ ج ا]

اور سچ تو یہ ہے کہ جس ملک کی ہر سڑک اور ہر محلہ میں برف سے بجھے ہوئے پانی کا مفت انتظام تھا اسی ملک کے کسی شہر کے چند ہزار گھروں کو بھی یہی پانی مفت اگر پہنچایا جاتا ہو تو تعجب کی کیا بات ہے۔ اور گو ابن حوقل نے ماوراء النہر کے حالات میں اس انتظام کا ذکر کیا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، ہر وہ ملک جہاں باآسانی برف کا بندوبست اس زمانے میں ہوسکتا تھا، عام ارباب خیر کی طرف سے اس قسم کی سبیلیں جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، قائم تھیں۔ ماوراء النہر کی شہادت تو آپ سن چکے۔ امیر شکیب ارسلان نے ''حاضر العالم الاسلامی'' کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ:

''وفی مدینة مراکش وقف لسقی الماء الثلوج فی ایام القیظ کما فی دمشق'' [صفحہ ۲۹۲ ج ا]

ترجمہ: شہر مراکش میں اس کام کے لئے ایک وقف ہے کہ برف کا بجھا ہوا پانی گرمیوں کے موسم میں لوگوں کو پلایا جائے۔ دمشق میں بھی اسی غرض سے اوقاف تھے۔

دمشق میں خروب کی سبیل

دمشق کے متعلق امیر ہی نے لکھا ہے کہ علاوہ برف کے پانی کے بعض سبیلوں میں خروب کا پانی بھی پلایا جاتا ہے۔

خروب کی ایک خاص قسم جو شامی خروب کے نام سے مشہور ہے، ایک قسم کا پھل ہے، جس کے عرق سے وہاں شربت اور رب (جام) وغیرہ بناتے ہیں۔

آپ نے دیکھا اسلامی ممالک کے اس زمانے میں یہی حدود تو تھے، ایک طرف مشرق میں سمرقند و بخارا تھا، دوسری طرف مراکش اور بیچ میں دمشق تھا۔ دیکھ رہے ہیں کہ تینوں مقامات میں مسلمانوں کا ایک ہی مذاق ہے اور راستہ میں سراؤں، مہمان خانوں کا انتظام۔ ان

میں عام مسافروں کے قیام وطعام کا نظم کون نہیں جانتا کہ علاوہ عام مسلمانوں کے خود حکومت اپنی بہت بڑی اہم ذمہ داری اس کو سمجھتی تھی، مسلمانوں کا ایسا کونسا ملک تھا، جس کی تاریخ میں حکومت کے اس نظم کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ آج وہ نظم درہم وبرہم ہوگیا۔ لیکن جہاں کہیں تھوڑا بہت اس کا موقعہ باقی ہے کہ آزادی کے ساتھ اپنے اسلامی احساسات کو عملی شکل مسلمان عطا کرسکتے ہیں، وہاں اب بھی کچھ نہ کچھ اس کے آثار پائے جاتے ہیں۔

طرابلس میں سنوسیوں کے زاویے

۱۹۱۰ء میں جب طرابلس کی جنگ چھڑی تو غازی انور پاشا کے ساتھ اور بھی چند باحمیت مسلمان طرابلس پہنچ گئے تھے۔ ان میں ایک امیر شکیب ارسلان بھی تھے۔ بعض مشاہدات کے معائنہ کا موقع ان کو اس سلسلہ میں اس صحرائی علاقے میں ملا تھا، جس میں ایک چیز سنوسیوں کے زاویے یا خانقاہیں تھیں، جن کا جال ہزاروں میل تک اس ملک میں ایک طرف سے دوسری طرف تک پھیلا ہوا تھا۔ ان زاویوں کی نوعیت کیا تھی؟ مختصراً اس کو بیان کرتے ہوئے پہلے تو ان زاویوں کی حالت یہ بتائی ہے کہ:

> ''تقریباً ہر قبیلہ میں ایک زاویہ ہے، زاویہ کے متعلق آس پاس کی زمینیں ہوتی ہیں۔ ان زاویوں کے قیام کے لئے اس علاقے کا بہترین حصہ منتخب کیا جاتا ہے۔ زمین اس مقام کی عموماً زرخیز ہوتی ہے۔ اس میں بڑے گہرے عمیق کنویں بنے ہوئے ہیں۔ جن کا پانی ختم نہیں ہوسکتا۔ جہاں جہاں یہ زاویے ہیں، ان سنوسی درویشوں نے اس مقام کو باغ وبہار بنا رکھا ہے۔ میں اپنے سفر کے سلسلہ میں شاید کسی زاویہ سے نہیں گذرا، جس کے متعلق میں نے کسی باغ کو نہ دیکھا ہو۔ بلکہ بعض زاویوں کے اطراف میں تو متعدد باغ اور بساتین نظر آئے۔ ان باغوں میں ہر قسم کے فواکہ اور پھلوں کو میں نے پایا اور ان ہی کے ساتھ اطراف کی زمینوں میں طرح طرح کی سبزیاں، ترکاریاں لہلہا رہی

تھیں۔ صحرا میں یہ نظارہ بڑا نزہت انگیز اور کیف آور تھا۔''

پھر لکھا ہے کہ:

''قاعدہ یہ ہے کہ جس قبیلہ سے زاویہ کا تعلق ہوتا ہے، اس قبیلے کے ہر مرد پر ایک دن یہ واجب ہے کہ زاویہ کے متعلق باغات اور زمینوں میں کام کرے۔ اس کی جہ سے نظم با آسانی بہت ہی معمولی خرچ سے مکمل ہو جاتا ہے۔''

آخر میں جو بات لکھی ہے، اسی کا پیش کرنا مقصود ہے، امیر لکھتے ہیں:

''یہ سنوسی زاویے اس وقت اس لق ودق صحرا میں مسافروں کی پناہ گاہوں کا کام تنہا انجام دے رہے ہیں۔ آنے جانے والے جتنے بھی ہیں ان کا ٹھکانہ یہی زاویے ہیں۔''

پھر خود اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ:

''میں جب طرابلس کے جہاد پر روانہ ہوا تو اسکندریہ سے ریل پر سوار ہو کر آخری مقام جہاں ریل کو میں نے وداعی سلام کیا، یہ وہ جگہ تھی جہاں سے تقریباً ایک ماہ چل کر میں لڑائی کے مقام بن غازی تک پہنچا۔ پہلا زاویہ جہاں سے صحرائی سفر کا میرے آغاز ہوا، سیدی ہارون القناشی کا زاویہ تھا۔ لیکن میں نے اپنے پورے اس سفر میں یہ پایا کہ منزل سے نکلنے کے بعد تین گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گذرنے پاتا تھا کہ کوئی نہ کوئی سنوسی زاویہ میرے سامنے نہ آجاتا ہو اور یہ ان زاویوں کے سوا زاویے ہیں جو سلطانی راستے سے ہٹ کر اندرون ملک میں بطور جال کے پھیلے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہاں تو نظم ہی یہ ہے کہ ہر قبیلہ اپنا ایک مستقل زاویہ رکھتا ہے اور وہی ان کے دین ودنیا کا مرکز وحید ہے۔ بلکہ ایک ایک قبیلہ کی جو مختلف شاخیں ہیں ان شاخوں کا بھی اپنا الگ الگ زاویہ ہوتا ہے۔ مثلاً عبدیوں کا قبیلہ ایک بڑا قبیلہ ہے۔ اس کی مختلف شاخیں ہیں جو

مختلف عائلوں کے نام سے مشہور ہیں۔ان میں ہر عائلہ (خاندان) اپنا مستقل علیحدہ زاویہ رکھتا ہے۔مثلاً عائلہ منصور کا زاویہ، عائلہ مریم کا زاویہ، عائلہ جازیہ کا زاویہ۔''

امیر کی جس چیز کو میں پیش کرنا چاہتا تھا وہ ان کے یہ آخری الفاظ ہیں کہ:

''وان الغریب اوالسائل او الفقیر المعتر لینزل براویۃ من ھذا الزاو یا فیقیم مایشاء و یتضیف مایشاء ولا یسألہ احد عن شئی''۔

ترجمہ: مسافر اور راہ گیر یا فقیر محتاج ان زاویوں میں سے کسی زاویے میں اتر پڑتے ہیں، پھر جب تک ان کا جی چاہے، اس وقت تک ان میں قیام کرتے ہیں اور مہمان بنے رہتے ہیں۔ان سے کوئی کچھ نہیں پوچھتا۔ [صفحہ ۱۰۸]

اور یہی چیز مسلمانوں کے تمدن کا ایک امتیازی عنصر تھا۔خدا ہی جانتا ہے کہ طرابلس کے صحراء میں بھی حیوانی تمدن کے دباؤ نے اس سلسلہ کو باقی رہنے کا موقعہ دیا، یا وہاں بھی ختم ہو چکا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے دور دراز علاقوں کے درمیان آمد و رفت، تجارت اور بیوپار کا غیر منقطع سلسلہ مسلمانوں کے عہد میں جو جاری تھا، اس میں بہت زیادہ دخل مسافر نوازیوں کے اس عام دستور کو بھی تھا، جس کے قیام میں عام مسلمانوں کے علاوہ خود اسلامی حکومتیں بھی بہت بڑا حصہ لیتی تھیں۔آج تو عہد اسلامی کا نقشہ کچھ ایسے انداز میں کھینچا جاتا ہے کہ بری ہوں یا بحری، ہر قسم کے راستوں پر ڈاکو اور چور بیٹھے رہتے تھے۔بچ کر کوئی مسافر اس زمانے میں منزل مقصود تک اگر اتفاقاً پہنچ جاتا تھا تو گویا یہ اس کی بہت بڑی خوش قسمتی تھی۔کرانے والے بھی باور کرا رہے ہیں اور باور کرنے والوں نے بھی باور کر لیا ہے۔

بری اور بحری راستوں کی حفاظت کا انتظام

حالانکہ علاوہ ان خانات اور سرایوں کے جن کے سلسلہ اسلامی ممالک کے طول و عرض میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا، خود اسلامی حکومتوں کی طرف سے بھی راہ گیروں اور مسافروں کی حفاظت

میں بھی کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا تھا۔ یہی ابن حوقل جس کے معلومات سے میں اپنے اس مضمون میں زیادہ تر مستفید ہوا ہوں، مشرق سے مغرب تک گھوما ہے۔ لیکن اشارۃً و کنایۃً کہیں بھی اس نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہے، جس سے معلوم ہو کہ اس کے زمانے میں راستوں میں ڈاکو، چور، اچکے مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ اپنی اس پوری کتاب میں یہ مشکل صرف ایک جگہ یعنی ''صحرائے خراسان'' کے راستوں کی جہاں اس نے تفصیل لکھی ہے، لکھتا ہے کہ:

''یہ ایسا لق و دق غیر آباد صحراء ہے کہ ان نشانات کے سوا جو حکومت کی جانب سے تھوڑی تھوڑی دور پر قائم کر دیئے گئے ہیں کسی اور چیز سے نہ منزل کا پتہ چل سکتا ہے، نہ مقام کا، جس کی وجہ یہ ہے کہ علاوہ ان مقامات اور آبادیوں کے جو کہیں کہیں راستے میں مل جاتی ہیں، اس صحراء میں زیادہ بستیاں ہی ہیں اور نہ ان کے رہنے والے۔''

اور اسی کے بعد اس نے یہ ذکر کیا ہے کہ:

''دنیا کے تمام صحراؤں میں یہی ایک ایسا صحراء ہے جس میں نسبتاً چور اور بٹ مار زیادہ پائے جاتے ہیں۔''

مگر اسی کے بعد وجہ اس کی اس نے جو لکھی ہے وہ بھی سنئے، لکھتا ہے جس کا حاصل یہ ہے:

''چوروں اور بٹ ماروں کی کثرت اس علاقے میں اس وجہ سے ہے کہ اس صحراء کا تعلق کسی خاص اقلیم اور علاقے سے اس کا تعلق ہوتا تو اس وقت اس اقلیم کی حکومت اس کی ذمہ دار ہوتی کہ اس قسم کے فساد سے اس کو پاک رکھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس صحراء کے چاروں طرف مختلف اور متعدد حکومتوں کی سرحدیں پھیلی ہوئی ہیں۔ متعدد سلاطین کے قبضے میں صحراء کے اطراف کے یہ علاقے ہیں۔ یعنی بعض حصہ تو اس کا خراسان اور قومس سے متعلق ہے اور بعض بجستان سے اور بعض کا تعلق کرمان و فارس، اصفہان، قم، کاشان، رے وغیرہ

سے ہے۔"

آخری الفاظ اس کے یہ ہیں:

"فاذا أفسد القاطع فی عمل دخل فی عمل اخر"

ترجمہ: جب راہ زن کسی ایک علاقہ میں کوئی فساد برپا کرتے ہیں تو دوسرے علاقہ میں جا کر وہ پناہ گزیں ہو جاتے ہیں۔ [ابن حوقل، صفحہ ۲۸۸]

ابن حوقل ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس صحراء کے قریب ایک دشوار کوہستان بھی ہے، جسے جبل کرکس کہتے ہیں۔ یہ جتنے مفسدین، راہ زن، چور، ڈاکو ہیں، ان کی پناہ گاہ اسی کوہستان کی گھاٹیاں اور چوکیاں ہیں۔ اسی میں وہ اپنی لوٹ اور چوری کے مال کو جا کر چھپا دیتے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ دیکھنے میں تو یہ کوئی بڑا پہاڑ نہیں ہے، لیکن صحراء کے بیچ میں دوسرے پہاڑی سلسلوں سے بالکل ہرا چونکہ اس کا محل وقوع ہے اس لئے تعاقب کرنے والوں کی رسائی میں دشواری ہوتی ہے۔ ابن حوقل نے لکھا ہے کہ ہم بھی اس پہاڑ کو تفصیل کے ساتھ نہ دیکھ سکے۔ بالکل اس کے دامن سے گذر گئے۔ غالباً اس پر بھی خوف طاری ہوگا۔ اس نے لکھا ہے کہ اسی وجہ سے میں اس کی تفصیلات نہیں بیان کر سکتا۔ [صفحہ ۲۸۸]

مقدسی نے بھی اپنی کتاب میں اس مفازہ کے چوروں اور راہ زنوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ "کان البلوص اشر منھم" (یعنی ان ڈاکوؤں اور چوروں میں سب سے زیادہ بلوچ تھے) مسافروں کو جن بے دردیوں سے قتل کرتے تھے، پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ سانپ کے سر کو پتھر سے جیسے لوگ کچلتے ہیں، یہی سلوک یہ لوگ ان مسافروں کے ساتھ کرتے تھے۔ جو ان کے ہاتھ آ جاتے تھے۔ مقدسی نے اپنے زمانہ کا حال لکھا ہے کہ دیلمی بادشاہ عضد الدولہ نے ان راہزنوں کا قلع قمع کر دیا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ بطور یرغمال کے ہر سال ایک خاص تعداد ان لوگوں کی فارس کی حکومت کے پاس رہتی ہے۔ ہر قافلہ کے ساتھ شاہی بدرقہ بھی اس راستہ میں ہوتا ہے۔ [صفحہ ۴۹۰]

اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ''صحرا خراسان'' کی اس خاص نوعیت کا نتیجہ تھا کہ پوری قوت کے ساتھ فساد کا ازالہ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر باوجود اس کے خود ابن حوقل جیسا کہ اسی کا بیان ہے، دو دفعہ اس صحراء سے گذرا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ایک دفعہ تو اس نے لکھا ہے کہ اونٹوں کے قافلوں کے ساتھ میں گذرا ہوں اور دوسری دفعہ کے متعلق اس کا لفظ ہے کہ ''مع المفردہ'' گذرنے کی نوبت آئی۔ ''مفردہ'' سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیدل مسافروں کی کسی چھوٹی ٹولی کے ساتھ گذرا ہوگا۔ لیکن دونوں دفعہ اس کے ساتھ یا اس کے رفقاء کے ساتھ کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

اب میں کیا کہوں کہ یہ مباحث میرے اس وقت کے موضوع سے خارج ہیں، اس لئے ان کی تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ ورنہ مسلمانوں کے زمانہ میں راستوں کی حفاظت اور صفائی مسافروں کے آرام کے متعلق جو جو انتظامات کئے جاتے تھے کی ایک طویل داستان ہے۔ بنی امیہ کی حکومت کا ابتدائی زمانہ ہے۔ حکومت کو اطلاع ملتی ہے کہ انطاکیہ اور لصیصہ کے درمیانی علاقے میں شیروں کی کثرت ہوگئی ہے۔ سننے کے ساتھ ولید بن عبدالملک نے جو اس وقت بادشاہ تھا، حکم دیا کہ شیروں کو شکار کر کے ختم کر دیا جائے۔ لکھا ہے کہ شیروں کو پھنسانے کے لئے جو بھینسے اور بھینسیں گڑھوں میں جو باندھی گئی تھیں ان کی تعداد چار ہزار تھی۔ الہمدانی کے الفاظ یہ ہیں کہ:

"فوجه اربعة الاف جاموس وجاموسة فنفع الله عزوجل"

ترجمہ: چار ہزار بھینسے اور بھینسیں اس طرف بھیجی گئیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے نفع پہنچایا۔ (یعنی شیر اس علاقہ کے ختم ہوگئے)۔ [الہمدانی، صفحہ ۱۱۳]

اسی ابن حوقل نے دریائے دجلہ کے انتہائی دہانہ کا جب وہ شط العرب میں گرتا ہے، نہر ابلہ کے پاس لکھا ہے کہ وہاں پر "خور عظيم الخطر" ہے۔ یعنی مختلف سمت سے سمٹ کر پانی کے جمع ہونے اور رواں ہونے کی وجہ سے ''گرداب عظیم'' کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا بیان ہے کہ:

"ماء جسيم دائم الضرر وكانت اكثر السفن تسلم من سائر الا ماكن فى البحر حتى ترده فيبتلعها وتغرق فيه بعد ان تدور على وجه

الماء ایاماً و کان یعرف بجور الابلہ" [ابن حوقل، صفحہ ۱۶۰]

ترجمہ: یہاں پر پانی بھی بہت گہرا ہے۔ جس سے ہمیشہ نقصان پہنچتا تھا۔ اکثر جہاز سمندر کے تمام مقامات سے صحیح وسالم بچ کر نکل آتے تھے۔ لیکن جوں ہی اس گرداب میں آخر پھنس جاتے تھے تو ان کو وہ نگل جاتا تھا اور جہاز ڈوب جاتے تھے۔ (ہوتا یہ تھا کہ اس گرداب میں) پانی کی سطح پر پھنسنے کے بعد جہاز کئی دن تک گھومتا رہتا تھا۔ (آخر ڈوب جاتا تھا)۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دریا کا یہ مقام کتنا گہرا ہوگا، جس میں سمندروں سے بچ کر نکل آنے والے جہاز ڈوب جاتے تھے۔ لیکن ایک مسلمان خاتون زبیدہ ہارون رشید کی بیوی کی نسبت لکھا ہے کہ:

''زبیدہ نے اس گرداب کو پہلے کشتیوں کے ذریعے سے قابو میں لانے کا حکم دیا اور آخر میں مسلسل پتھر کی چٹانوں کو ڈال ڈال کر اس کو بھروادیا اور اب بحری سفر کے مسافر اس گرداب کی آفت سے محفوظ ہو گئے۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۱۶۰]

المقدسی بحر ہند اور بحر عرب کے اہم مقامات اور ان سمندروں کے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے اس کی بھی شہادت ادا کرتا ہے کہ:

"ولا بد فی کل مرکب من مقاتلة ونفاطین"

ترجمہ: یعنی ہر ہر جہاز میں جنگی سپاہیوں کا اور ان لوگوں کے ایک گروہ کا ہونا ضروری ہے جو نفط (پٹرول) کے ذریعہ دشمن پر آگ پھینکتے ہیں۔ [صفحہ ۱۲]

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحری قزاقوں اور ڈاکوؤں سے بھی حفاظت کا سامان حکومت کی جانب سے لازمی طور پر ہر جہاز میں کیا جاتا ہے۔ ان ہی سیاحوں نے مختلف شہروں کے ذکر میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ عموماً ان کے بازار کی سڑکیں پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔ گرم سیر ممالک میں بازاروں کو مسقف کرنے کا بھی رواج عام تھا۔ [ابن حوقل، صفحہ ۲۴۹]

بہرحال بری اور بحری اور آبادی کے اندر کے راستوں کے متعلقہ خدمات کے چند معمولی نمونے بطور مثال کے میں نے پیش کردیئے ہیں، ان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اپنے عہد

میں رعایا کے آرام و آسائش کا اسلامی حکومتوں کو کتنا خیال تھا۔ قیاس کرنے کے لئے اتنا اجمال کافی ہے۔ ورنہ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ تو ایک بڑی داستان کا موضوع بن سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جی چاہتا ہے کہ اس چیز کا بھی یہاں ذکر کر دیا جائے جس کا ذکر عموماً جغرافیہ کی کتابوں کے ان مصنفین نے کیا ہے۔

سرحدوں کی فوجی چھاؤنیاں

رباط کا لفظ جسے بعد کے لوگوں نے سرائے اور مسافر خانوں کے معنی میں استعمال کرنا شروع کیا اور اس وقت بھی مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کی عام سرائیں جن میں ہر سال حجاج جا کر اترتے ہیں رباط ہی کے نام سے مشہور ہیں، لیکن درحقیقت اسلامی عہد کا یہ ایک جہادی عنصر تھا۔ یعنی فتح کرتے ہوئے مسلمان زمین کے جس حصے تک پہنچ کر جاتے تھے تو ٹھیک اپنی مفتوحات کی آخری سرحد پر جسے ثغور کہتے تھے، سرحدی چھاؤنیاں دشمن کے علاقے کو رخ پر رکھتے ہوئے مدافعت کے لئے بناتے تھے اور ان ہی سرحدی چھاؤنیوں کا نام رباط تھا۔ علاوہ ان لوگوں کے جو باضابطہ فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔ عام مسلمانوں کا مدت تک یہ ایک دلچسپ مشغلہ تھا کہ دنیاوی کاروبار میں کچھ دن صرف کرنے کے بعد رضاکانہ طور پر وہ ان ہی رباطوں میں سے کسی ایک رباط میں جہاد کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے چلے جاتے تھے۔ چونکہ ان سرحدی چوکیوں پر دشمنوں سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ عموماً جاری ہی رہتا تھا، اس لئے جہادی ولولوں کی تکمیل کا موقعہ لوگوں کو ملا کرتا تھا۔ بسا اوقات درجہ شہادت پر لوگ اسی ذریعہ سے فائز ہوتے تھے جو موت جیسی دشوار شے کے حل کا مسلمانوں کو ایک نہایت ہی آسان نسخہ مل گیا تھا۔ بڑے بڑے جلیل القدر ائمہ مثلاً عبداللہ بن مبارک، حضرت ابراہیم بن ادہم، اور بھی دوسرے بزرگوں کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ سال کا کچھ حصہ ان سرحدی چوکیوں میں سے کسی چوکی پر یا اگر لڑائی کہیں ہوتی تو اس میں شریک ہو کر فریضہ جہاد کو ادا کرتے تھے۔ ابن مبارک کا تو کلی قاعدہ تھا کہ چار مہینے تجارت، چار مہینے درس اور چار مہینے جہاد۔ بس پورا سال ان ہی تین حصوں پر منقسم تھا۔ جس میں کبھی تخلف واقع

نہیں ہوا۔

بہر حال ان رباطوں کا حال کیا تھا؟ ابن حوقل کی زبانی سنئے۔ منجملہ اور رباطی مقامات کے شام کی اس سرحدی سمت میں جو رومیوں کے ملک سے ملتی تھی ایک مشہور سرحدی چھاؤنی طرطوس نامی بھی تھی۔ ابن حوقل نے اسی کے تذکرہ میں یہ لکھتے ہوئے کہ:

''اس میں سوار اور پیادے کی ایک کافی تعداد ہمیشہ مقیم رہتی ہے، اور اسلحہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اس میں مہیا رکھا جاتا ہے۔''

اس نے بیان کیا ہے کہ:

''معتبر لوگوں سے مجھے معلوم ہوا کہ اس رباط میں ایک لاکھ تو صرف سوار فوج رہتی تھی اور یہ زیادہ دن کی بات نہیں ہے، خود میں نے بھی اس رباط کو اسی حال میں دیکھا ہے۔''

پھر آخر میں اس نے لکھا ہے کہ:

''واقعہ یہ ہے کہ بجستان و کرمان، فارس، خوزستان، جبال، طبرستان، الجزیرہ، آذربائیجان، عراق، حجاز، یمن، شامات اور مصر و مغرب وغیرہ ان سارے ممالک کے سرحدی مقامات پر بڑے بڑے مکان اور عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ جن میں اس علاقے کے مجاہدین فروکش ہوتے ہیں اور مرابطہ (اسلامی حدود کی حفاظت) کے فرض کو انجام دیتے ہیں۔''

اسی کا بیان ہے کہ:

''ان سرحدی چوکیوں میں رہنے والے مجاہدین کے ساتھ لوگ بڑی فیاضی کا سلوک اور دل کھول کر داد و دہش کرتے ہیں۔ حکومتوں کی طرف سے بھی اور عام ارباب ثروت و دولت کی طرف سے بھی، بڑی بڑی بیش قرار رقمیں اور مختلف قسم کی چیزیں مسلسل آتی رہتی تھیں۔ مسلمان ان میں رہ کر رضا کارانہ

طور پر اس اسلامی فرض کو پورا کرتے تھے۔ میں نے جن جن علاقوں کا ذکر کیا ہے ان میں کوئی قابل ذکر رئیس یا بڑا آدمی ایسا نہیں پایا جاتا ہے جس کی طرف سے ان رباطی مقامات پر بڑے بڑے زرخیز دیہات اور شہروں کی دکانیں وقف نہ ہوں۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۱۲۳]

دوسری جگہ اسی ابن حوقل نے مغرب اقصٰی کے آخری حدود کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''وادی فاس کے آگے، برغواطہ نامی شہر ہے، یہاں سے ڈاک کی چوکی سے ایک منزل کے قریب فاصلہ پر سلا کی وادی ہے، اور یہی وہ وادی ہے جہاں پر مسلمانوں کے علاقہ کی آخری حد ہے۔''

اس کے بعد آخری حد کی رباط یا سرحدی چوکی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

''اس علاقہ کا یہی مقام یہاں کی رباط ہے جس میں مسلمان مرابطہ (اسلامی حدود کی حفاظت) کا فرض اسی میں مقیم ہو کر انجام دیتے ہیں۔ اسی وادی کے ساحل پر سلا کا پرانا شہر تھا، جو ان دنوں صرف کھنڈر بن کر رہ گیا ہے۔ اسی کھنڈر کے چاروں طرف مسلمانوں کی چھاؤنیاں ہیں۔''

آخر میں بیان کرتا ہے کہ:

''بسا اوقات اس سرحدی چوکی میں ایک ایک لاکھ آدمی بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کبھی بڑھ بھی جاتے ہیں اور کبھی گھٹ بھی جاتے ہیں۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۵۶]

اور یہی حال اس نے مسلمانوں کے آخری مشرقی حدود کا، اس زمانے کا بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے:

''ماوراء النہر کے تمام سرحدی علاقے جو دار الحرب سے ملے ہوئے ہیں اور خوارزم سے شروع ہو کر اسبیجاب تک ان کا جو سلسلہ چلا گیا ہے تو یہ غزی

ترکوں (جو اس زمانہ تک مشرف باسلام نہ ہوئے تھے) کے مقابلہ کی سرحدی چوکی ہے اور اسبیجاب سے فرغانہ تک خزلجی کافر قبائل کے مقابلہ کے ثغور ہیں۔''

آخر میں لکھتا ہے کہ:

''مسلمان ہمیشہ ان غیر مسلم اقوام کو روکے اور دبائے رکھتے ہیں، جو اس علاقے میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں کوئی دارالحرب (یعنی کافروں کا علاقہ) ترک کے اس علاقہ سے زیادہ سخت نہیں ہے۔ پس یہی مسلمان ان ترکوں کے مقابلہ میں سرحد کی حفاظت کا کام کرتے ہیں اور دارالاسلام کی طرف چڑھ دوڑنے سے ان کو روکے رہتے ہیں۔ یہ جتنی ماوراء النہر کی سرحدی چوکیاں ہیں، ہمیشہ غزا اور جہاد ہی میں مصروف رہتی ہیں۔ دشمن کے مقابلہ میں جنگ کا جب اعلان ہوتا ہے تو یہ بات عام طور پر سمجھی جاتی ہے اور شہرت رکھتی ہے کہ نصر بن احمد کے زمانے میں جو اندازہ کیا گیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ تین لاکھ جنگ جو افراد یہاں سے اکٹھے کئے جاسکتے ہیں۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۳۴۰]

بہر حال ان چند بیانات سے مسلمانوں کی مرابطت اور رباط کے نظم کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ حکومت کی جانب سے ان علاقوں میں مکانات کا ایک طویل سلسلہ بطور بیرکس کے بنا ہوا رہتا ہے۔ ان عمارتوں کی نوعیت کیا ہوتی تھی؟ اس کا پتہ الہمدانی کے اس بیان سے چل سکتا ہے جو اس نے ہارونیہ نامی سرحدی چوکی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

''ہارونیہ شام کا ایک شہر ہے، دراصل یہ فوجی چھاؤنی ہے، یہاں پر عرافہ کے لئے دو دو کمرے اس طور پر بنے ہوئے ہیں کہ ہر کمرہ میں دو دو منزلیں ہوتی ہیں ایک بالائی اور ایک نشیبی۔''

پھر عرافہ کی تشریح اس نے خود یہ کی ہے کہ:

''دس سے پندرہ آدمیوں کے ٹولی عرافہ کہلاتی ہے۔'' [الہمدانی، صفحہ ۱۶۴]

جس سے معلوم ہوا کہ دس سے لے کر پندرہ سپاہیوں کی کمپنی کے لئے اس قسم کی دو منزلہ بیرکیں ان چھاؤنیوں میں عموماً بنی ہوئی تھیں۔ گویا ایک عرافہ کے قبضہ میں نیچے اور اوپر کی منزلوں کو ملا کر چار چار کمرے ہوا کرتے تھے۔

رہا ان چھاؤنیوں کا محل وقوع، سو اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے جو ابن حوقل نے شام ہی کی مشہور سرحدی چوکی مصیصہ کے متعلق لکھا ہے، یہ بھی رومیوں کی مدافعت کے لئے بنائی گئی تھی۔ کسی زمانہ میں اسے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بڑے بڑے محدثین اور علماء اس چھاؤنی کے رہنے والے سپاہیوں کی تربیت و تعلیم کے لئے یہاں رہتے تھے۔ جس کا اسلامی تاریخوں میں بکثرت ذکر آتا ہے۔ بہر حال ابن حوقل اسی مصیصہ کے متعلق لکھتا ہے کہ:

''مصیصہ دراصل دو شہروں کا مجموعہ ہے۔ ایک کا نام تو دراصل مصیصہ ہی ہے اور دوسرے کو کفربیا کہتے ہیں۔ جیحان دریا (یہ شام کا دریا ہے ماوراء النہر والے جیحون سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے) کے دونوں کناروں پر یہ دونوں چھاؤنیاں آباد ہیں۔ دونوں کو ایک سنگین پل کے ذریعہ سے متصل کر دیا گیا ہے۔ دونوں کی دونوں بڑی مستحکم اور مضبوط ہیں، محل وقوع ان کا ایک بلند قطعہ اراضی ہے۔ جامع مسجد میں بیٹھ کر آدمی جب سامنے سمندر کی طرف دیکھتا ہے تو قریب قریب بارہ میل تک نظر سمندر کی سطح پر پھیل جاتی ہے۔ گویا ایک خنک بخش تر و تازہ نظارہ اس کے سامنے جلوہ پرواز ہوتا ہے۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۱۲۲]

اورنگزیب کے پوتے کا بسایا ہوا شہر ''عظیم آباد''

ابن حوقل کے اس بیان کو پڑھ کر بے ساختہ سلطان عالمگیر اورنگزیب کے پوتے شہزادہ عظیم الشان کا بسایا ہوا شہر مرحوم ''عظیم آباد'' یاد آ گیا۔ جو خود تو اپنی ویرانی کی داستان اپنے

کھنڈروں کی زبانی کہہ رہا ہے، لیکن بجانب مغرب کچھ دور ہٹ کر انگریزوں کے عہد کی آبادی بنام بانکی پور اس سے بھی آگے خود انگریزوں کی سول آبادی بنام ''نیو پٹنہ'' آباد ہوگئی ہے۔ اس مرحوم ''عظیم آباد'' کی وہ جامع مسجد جو خود تو دست و برد زمانہ سے ایک حد تک محفوظ اب تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، لیکن چاروں طرف اس کے صرف ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے آثار دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مسجد کافی وسیع اور خوبصورت بنی ہوئی ہے۔ محل وقوع اس مسجد کا بھی ٹھیک مصیصہ کی جامع مسجد کے مشابہ ہے۔ بالکل لب گنگا ایک بلند ٹیلے پر تعمیر کی گئی تھی۔ گنگا کا پاٹ وہاں پر دو ڈھائی میل سے کم عریض نہ ہوگا۔ مسجد کی دیواروں سے گویا یوں سمجھئے کہ گنگا کے شفاف، رواں پانی کی موجیں ٹکراتی رہتی ہیں۔ مسجد میں کھڑے ہو کر میلوں دور کا پانی ہی پانی کا وہ نظارہ کتنا جان بخش اور روح پرور ہوسکتا ہے۔ لیکن جب کبھی اس مسجد میں جانے کا اتفاق ہوا، خصوصاً تنہائی میں تو بجائے سرور کے آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب ہی جاری ہوا۔ تخیل اپنے سامنے اضطراراً اس عہد کو لا کر کھڑا کر دیتا تھا۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی ہے اور اطراف کے حجرے جن کے متعلق معلوم ہوا کہ طلبہ کے حجرے تھے، طلبہ ان میں آباد ہیں۔ مدرسین جس وقت اس مسجد کے صحن اور برآمدے میں بیٹھ کر سامنے گنگا کی موجوں کے رقص کا تماشا کرتے ہوئے مشغول درس ہوں گے تو وہ کیا دن ہوں گے۔ پٹنہ کے گورنر کی سواری جمعہ کے دن جب اسی مسجد میں آتی ہوگی، کیا شان اور کیا شکوہ ہوگا۔ تخیل اس تماشے کو سامنے لاتا تھا اور آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ پوری مسجد یہاں سے وہاں تک خالی ہے، نمازوں کے اوقات بھی بجز چند ٹوٹے پھوٹے گرے پڑے غریب مسلمان یا فرتوت بوڑھوں کے کوئی جھانکنے کے لئے بھی نہیں آتا۔ علماء کہاں گئے؟ طلبہ کیا ہوئے؟ مغل حکومت کے گورنر کہاں ہیں؟ شاہی سطوت و صولت کدھر گئی؟ کلیجہ اگر پھٹ نہ جائے تو آپ ہی بتائیے کہ اور کیا ہو۔

ہند کا چپہ چپہ ان جگر خراش نظاروں سے معمور ہے۔ اب ہمارے لئے اس ملک میں صرف یہی باقی رہ گیا۔

فانا لله وانا اليه راجعون ، ان الارض لله يورث من يشاء ، ولا ينال عهدی الظالمین.

مسلمانوں کا علمی شغف اور امراء کی فیاضیاں

مسجد کے ذکر کے سلسلہ میں ابن حوقل کی بعض ان باتوں کا خیال آتا ہے جو اس زمانہ میں مسلمانوں کی مسجدوں کی خصوصیت تھی۔ اس نے ہراۃ کی جامع مسجد کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بیان کر کے کہ:

''یہاں کی جامع مسجد بیچ شہر میں واقع ہے، جس کے چاروں طرف بازار ہے اور قید خانے کی عمارت جامع مسجد کے قبلہ کی دیوار کی پشت پر ہے۔''

اس مسجد کے متعلق لکھا ہے کہ:

''میں نے ماوراء النہر اور جبال (وسط ایران کا قدیم صوبہ) کے ان تمام علاقوں میں اس جامع مسجد سے زیادہ آباد کسی مقام کی جامع مسجد نہیں دیکھی۔ شب و روز لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ اس میں جاری رہتا ہے اور یہی حال میں نے بلخ کی جامع مسجد کا بھی دیکھا ہے اور قریب قریب یہی کیفیت بجستان کی جامع مسجد کی بھی ہے۔

لیکن یہ آبادی اور گہما گہمی جس کا نظارہ ان مساجد میں ابن حوقل نے کیا، کن لوگوں سے تھی؟ اس کا بیان ہے کہ:

''وجہ اس کی یہ ہے کہ ان مسجدوں میں ایک بڑا گروہ علماء اور فقہاء کا مقیم ہے اور جیسے شام یا مسلمانوں کی سرحدی چوکیوں کی مسجدوں کا حال ہے، وہی حال ان کا بھی ہے۔ یعنی ان علماء سے استفادہ کرنے والوں کی حالت یہ ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔'' [صفحہ ۳۲۴]

اور یہ بھی اس زمانہ کا حال تھا کہ مسلمانوں کی یہی مسجدیں دراصل مدرسہ کا کام دیتی

تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں ابن حوقل ان علاقوں میں آیا ہے اس وقت تعلیمی اور تدریسی حیثیت سے مشرق میں ہراۃ اور بلخ کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ جیسے مغربی اور اسلامی ممالک کے وسطانی علاقوں کی مسجدیں بڑی بڑی تعلیم گاہوں کی شکل اختیار کئے ہوئے تھیں۔

بلخ کے تذکرے میں بھی اس نے پھر اسی بیان کو دہراتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''بلخ بھی مسلمانوں کا ایک بہت بڑا شہر ہے، مرو اور ہرات کی طرح اس کی آبادی بھی گھنی ہے۔ ایک کشادہ اور مسطح میدان اس شہر کا محل وقوع ہے۔ کوئی پہاڑ بھی اس کے قریب نہیں ہے۔ قریب ترین پہاڑ کا فاصلہ قریب قریب بارہ میل سے کم نہیں ہے۔ جامع مسجد اس کی بھی ٹھیک بیچ شہر میں واقع ہے اور بازار کی دکانیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ یعنی جامع مسجد کے اطراف کو ان دکانوں نے گھیر رکھا ہے اور صبح وشام، ہر وقت، ہر گھڑی لوگوں کی آمدورفت کا تانتا اس مسجد میں بندھا رہتا ہے۔ اسی کی ایک نہر ہے جس کا نام دہ آس ہے، یعنی دس پن چکیوں والی نہر۔ یہ نہر نوبہار کے قریب سے گذرتی ہے اور سیاہ جرد نامی قصبہ تک دوسرے قصبوں کو سیراب کرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ بلخ کے تمام دروازوں کے باہر (جہاں تک دیکھو) بساتین، باغات اور تا کستان ہی تا کستان نظر آئیں گے، اس شہر کی شہر پناہ بھی مٹی کی ہے۔''

جامع مسجد کے قریب نوبہار کا ذکر اور اس شہر کے لوگوں کے خصوصی علمی ذوق میں ممکن ہے کہ اس نوبہار کو بھی دخل ہو۔ دراصل یہ وہی لفظ ہے جس کا تلفظ ویہار ہے۔ بودھ مت کے مدارس کہیے یا خانقاہوں کا ہندی نام تھا۔ واو نے کثرت تلفظ سے ''ب'' کی شکل اختیار کر لی۔ جیسی بیدوید کو، ودیا کو بدیا لوگ عموماً کہتے ہیں۔ ہندوستان، خصوصاً بہار میں بودھ والوں کے ان بہاروں یا وہاروں کی تو اتنی کثرت تھی کہ آخر ایک پورا صوبہ ہی بہار کے نام سے موسوم ہوگیا۔ خود بخارا لفظ بھی وہار ہی کے تلفظ کی ایک شکل ہے۔ سرحد میں اب بھی ح کا تلفظ لوگ خ سے کرتے ہیں۔ یہ سارا

علاقہ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، بودھ مت کا پابند تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلخ کا وہار اسب سے آخری اور نیا وہارا تھا۔ اسی لئے نو بہار کے نام سے موسوم ہے۔ اس نو بہار کے تفصیلی حالات ہماری کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہاں مہاتما بدھ کی بڑی بڑی عملیقی قد کی دو مورتیاں ہیں جن میں ایک کا سرخ اور ایک کا رنگ سیاہ ہے۔ ہندوستانی علوم کا رشتہ عربی زبان سے جو ملا، اس میں سچ پوچھئے تو بلخ کے اسی نو بہار کا ہاتھ شریک ہے۔ اسی نو بہار کا افسر اعلیٰ جسے برمک کہتے تھے، یعنی بڑا مونک (monk) جو بودھ مذہب کے علماء وفقراء کا خطاب ہے، اس کا بڑا مونک برمک کے نام سے موسوم تھا۔ الہمدانی نے اس کا طویل قصہ لکھا ہے کہ اس نے کشمیر میں طب اور نجوم فلسفہ وغیرہ ہندوستانی علوم کی تعلیم حاصل کی تھی۔ یعنی مسلمان ہوکر عباسی دربار میں داخل ہوا اور بتدریج اس کے خاندان والوں نے وہ عظمت وجلالت حاصل کی جس کے ذکر سے اسلامی تاریخ کی کتابیں معمور ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کشمیر میں تعلیم پانے ہی کا اثر تھا کہ جب بغداد میں بیت الحکمۃ قائم ہوا تو یونانی علوم کے ساتھ ہندی علوم وفنون کے ترجمہ کی سفارش برامکہ نے کی۔ نیز ان کے نزدیک قدیم مذہب کا بھی تعلق ہندوستان ہی سے تھا۔ [الہمدانی صفحہ ۳۲۴]

آخر میں لکھتا ہے کہ:

"اس شہر کے باشندوں پر عموماً علم وادب کا ذوق غالب ہے، غور وفکر اور دقیق علوم کے مسائل سے انہیں بڑی دلچسپی ہے۔ یہاں سے بڑے بڑے علماء اٹھے ہیں۔" [ابن حوقل، صفحہ ۳۳۶]

اور یہ واقعہ ہے، خصوصاً ابتدائے اسلام کے بعض جلیل القدر اکابر صوفیہ بلخ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حضرات ابراہیم بن ادہم اور شفیق بلخی رحمہما اللہ۔

علم کا انہماک

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ مسلمانوں نے چونکہ مسجدوں خصوصاً ہر شہر کی جامع مسجد ہی کو مدرسہ بنا رکھا تھا، یہی وجہ ہے اس بات کی کہ تعلیم کی اس عام اشاعت کے باوجود ابن حوقل

وغیرہ جیسے محتاط مورخین کی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم والعہدۃ علی الراوی۔ یعنی خوزستان کے شہروں سے جب وہ گذر رہا تھا (تستر، جند سابور، اہواز وغیرہ جس علاقہ میں واقع ہیں) وہ لکھتا ہے، میں بجنسہ اس کے الفاظ ہی ترجمہ کے ساتھ نقل کر دیتا ہوں:

"ولقد رأیت حمالاً عبر وعلی رأسه وقر ثقیل اوعلی ظهره وهو
یسائر حمالاً اخر علی حاله وهما یتنازعان فی التاویل وحقائق
الکلام غیر مکترثین بما علیهما فی جنب ماخطر لهما"

ترجمہ۔ میں نے ایک حمال (قلی) کو گذرتے ہوئے دیکھا کہ اس کے سر پر یا پیٹھ پر بھاری بوجھ لدا ہوا تھا ور ایک دوسر حمال بھی اسی کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا اور دونوں التاویل (یعنی قرآنی آیات کی تفسیر) اور علم کلام کے حقائق و مسائل پر جھگڑتے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان دونوں پر جو بوجھ لدے ہوئے تھے اپنے خیالات کے مطابق ان کی کوئی پرواہ ان کو نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یورپ اور امریکہ میں بھی آج تعلیم عام ہے، لیکن عام تعلیم کا معیار ان ممالک میں کیا اس سے زیادہ ہے کہ مادری زبان کے حروف کی لکیروں سے وہ آشنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اتنی دماغی تربیت قلیوں تک کی کہ تفسیر اور کلام کے مسائل و مباحث پر وہ اتنے انہماک سے گفتگو کرنے میں مشغول ہوں کہ سر کے بوجھ کی خبر بھی انہیں باقی نہ رہتی ہو۔ میں نہیں جانتا کہ مغرب کی عام حالت آج بھی ان نتائج کو پیش کر سکتی ہے؟

حکمرانوں کی طرف سے اہل علم کی ہمت افزائی

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج و اقبال میں علم کی قدر و منزلت میں جو خدمات انجام دی ہیں، اس وقت تک دنیا کی قومیں ان کی نظیریں مشکل ہی سے پیش کر سکتی ہیں۔ حکومت اور سلطنت کے سوا عام مسلمانوں میں علم و فضل کا جو احترام تھا، اگر ان واقعات کو کوئی جمع کرنا چاہے تو ایک کتاب بن سکتی ہے۔ جاحظ جو تیسری صدی ہجری کا ایک منشی اور ادیب ہے خود

اس کا بیان ہے کہ:

''میں نے کتاب ''الحیوان'' لکھ کر عبد المالک الزیات کی خدمت میں ہدیہ کی تو اس کے صلہ میں پانچ ہزار اشرفیاں اس نے مجھے بھیجیں۔ پھر میں نے اپنی کتاب ''البیان والتبیین'' احمد بن ابی دواد کے دربار میں پیش کی، اس نے بھی اس وقت پانچ ہزار اشرفی سے میری ہمت افزائی کی۔ پھر کتاب ''الزرع و النخل'' لکھ کر میں نے ابراہیم بن عباس الصولی کے پاس بھیجی، جواب میں اس نے بھی پانچ ہزار اشرفیاں روانہ کیں۔'' [الجاحظ صفحہ ۳۴]

اور سچ تو یہ ہے کہ علم والوں کو جس قوم نے سونے اور چاندی سے تول تول کر رکھ دیا ہو، ادباء کی ہمت افزائیوں کے سلسلہ میں یہ واقعہ کر کے دکھا دیا کہ ان کے منہ موتیوں سے بھر دیئے گئے۔

تیمور کی علم دوستی

تیمور جیسے آتشیں مزاج آدمی نے جس نے محض خلاف شان ایک فقرے سے ترکی بادشاہ یلدرم کے ملک پر حملہ کر دیا تھا اور یلدرم کو قفس آہنی میں بند کرنے کا جو عہد کیا تھا، اسے پورا کر کے رہا ہو۔ اس کا سارا غصہ علم کے مقابلہ میں اس طرح ٹھنڈا ہو کر رہ جاتا ہو کہ گویا اس کے مزاج میں کبھی غصہ تھا ہی نہیں۔ کیا دنیا کی کسی گذشتہ یا موجودہ قوموں میں علمی عظمتوں کی ان مثالوں کو تلاش کر سکتے ہیں اور تلاش بھی کریں تو اپنی اس کوشش میں آپ کامیاب ہو سکتے ہیں؟ اس مسئلہ پر اردو زبان میں لکھنے والوں نے کافی مواد جمع کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے زمانے میں علماء اور طلبہ کے ساتھ نہ صرف حکومت بلکہ عام پبلک کا جو سلوک تھا، میں نہیں جانتا کہ آسمان نے اس کے تماشے کبھی کہیں اور بھی دیکھے ہوں گے۔

اہل یورپ کا طالب علم کے ساتھ برتاؤ

یورپ جسے اپنی تعلیمی قدر شناسیوں پر آج بہت ناز ہے، لیکن زیادہ دن کی بات نہیں

ہے، انیسویں صدی عیسوی کے آخری سالوں کا واقعہ ہے، بلکہ صاحب واقعہ تو بیسویں صدی تک زندہ رہا۔ میری مراد ویمبری سے ہے۔ جس نے رشید آفندی کے نام سے اسلامی ممالک خصوصاً وسط ایشیا، ترکستان، بخارا، خیوہ کا سفر بعض باطنی اغراض کے تحت کیا تھا اور اسلام دشمنی میں خصوصی شہرت رکھتا ہے۔ ہمیشہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کی تحقیر و توہین اس کا عام شیوہ ہے۔ لندن میں مسلمان قاریوں کے لہجہ کی نقل بنا بنا کر وہاں کی سوسائٹیوں کا گویا مسخرہ بنا ہوا تھا۔ متعدد زبانوں، خصوصاً عربی، فارسی، ترکی کا ماہر تھا۔ اس نے وسط ایشیاء والے سفرنامے میں خود اپنی ابتدائی تعلیمی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ابتداء میں ہنگری کے مدرسہ سینٹ جارج میں جو پیٹرس برگ کے قریب تھا، داخل ہوا۔ رات کا کھانا مجھے سات مختلف کنبے ہفتہ میں دیا کرتے تھے۔ ہر روز ایک کنبہ کے ہاں رات کا کھانا کھاتا تھا اور جب کھا چکتا تھا تو وہ مجھے ایک روٹی صبح کے ناشتہ کے لئے بھی دے دیتے تھے اور اس مدرسہ میں جو امیر طالب علم تھے ان کے اتارے ہوئے کپڑے بھی مجھے مل جاتے تھے''۔

اگرچہ یہ ایک زندگی کا شخصی حال ہے، لیکن اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یورپ کے عام باشندوں کا طلبہ علم کے ساتھ انیسویں صدی کے آخر تک کیا برتاؤ تھا۔ ایک طالب علم کو بھی دونوں وقت کھانے دینے کی ہمت وہاں کے لوگوں کو نہیں ہوئی تھی۔ سات کنبوں نے وہ بھی صرف رات کے کھانے کی ہفتہ میں ایک ایک دن کی ذمہ داری لی تھی۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں اب آپ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ پڑھ جائیے۔ شمال میں، جنوب میں، مشرق میں، مغرب میں، جہاں کہیں وہ تھے، طلبہ علم کو کس طرح ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ خود ہندوستان کا حال اس معاملہ میں آج سے کچھ دن پہلے کیا تھا، اس کی تفصیل آپ کو میری کتاب ''برصغیر میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت'' میں مل سکتی ہے۔

البتہ اینٹ اور چونے کے ساتھ تعلیم جیسی عام اور آزاد شے کو مقید کرنا، مسلمان اس کو

غیر ضروری سمجھتے تھے اور یہی چیز لوگوں کے لئے باعث غلط فہمی بنی ہوئی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، مدرسوں کی عمارتوں کی جگہ مسلمانوں میں مسجدوں کا تو جال پھیلا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ مجھ ہی سے سن چکے کہ بہت دن بعد نہیں، بلکہ پیغمبر اسلام ا کے بعد کل ۱۵ سال کے اندر اندر چار ہزار مسجدیں ممالک اسلامیہ میں تعمیر ہو چکی تھیں اور جب قرطبہ کا یہ حال تھا تو بغداد کا پوچھنا ہی کیا ہے اور کیسی مسجدیں؟ گذر چکا کہ صرف ایک کوفہ کی مسجد میں کم و بیش چالیس ہزار نمازیوں کی گنجائش تھی۔ وہی ولید والی جامع اموی جس کے معماروں پر ہزار کی سبزی اور ترکاریاں خرچ ہوتی تھیں۔ الہمذانی نے لکھا ہے کہ:

"انه فی الجامع الاموی مقعد عشرین الف رجل"

ترجمہ: جامع اموی میں بیس ہزار آدمیوں کی نشست گاہ ہے۔ [الہمذانی صفحہ ۱۰۷]

اور یہی حال فسطاط مصر کی جامع عمرو بن عاص کا تھا۔

قرطبہ کی مسجد کا طول و عرض آخر میں جس نوبت پر پہنچ کر رہا تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۲۹۳ ستونوں پر یہ مسجد کھڑی تھی اور ان ستونوں سے جو بیچ بیچ میں قبے بن گئے تھے، جنہیں اس زمانہ میں ثریا کہتے تھے ان کی تعداد ۲۸۰ تھی۔ گویا یہ ۲۸۰ درسگاہیں تھیں۔ کیا اتنی بڑی بڑی عمارتیں جو صرف نماز کے وقتوں میں نماز کے کام آتی تھیں، ان کے رہنے والے مسلمانوں کو مدرسوں کے لئے علیحدہ عمارتوں کی بنانے کی ضرورت باقی بھی رہی تھی؟ مگر انہوں نے یہ واقع ہے کہ باوجود غیر ضروری ہونے کے مدارس بھی بنوائے، جن کے حالات سے آپ لوگ کافی طور پر واقف ہو چکے ہیں۔

اس زمانہ کے لباس اور کھانے پینے کی تفصیلات

اپنے ابتدائی تخمینہ سے اب یہ "عجالہ" کافی متجاوز ہو چکا ہے۔ تاہم چند چیزوں کا ذکر اور سن لیجئے!

ابن حوقل اور اسی صنف کے دوسرے مورخین نے دوسرے امور کے ساتھ ساتھ کہیں

کہیں اس زمانے کے لباس اور ان کے کھانے پینے کی خصوصیتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کا نقطہ نظر اس باب میں باوجود مذہب اور دین ہونے کے کچھ مسامحت ہی کا تھا۔ بلکہ لوگوں کو جیسا کو معلوم ہے۔ قرآن ہی میں اعلان کردیا گیا ہے کہ "طیبات من الرزق" یعنی صاف ستھری پاک و خوشگوار غذاؤں اور خدا نے جن چیزوں کو اپنے بندوں کے تجمل اور زیب و زینت کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کو حرام ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ سمجھا جائے کہ ان چیزوں سے احتراز کی روش اختیار کرنے والوں کی قرآن نے سرزنش کی ہے تو یہ اس کے کھلے کھلے نصوص کا اقتضاء ہے۔

بہر حال یہ ایک الگ مستقل بحث ہے۔ میری کتاب ''اسلامی معاشیات'' میں اسلام کے تفصیلی نقطہ نظر کو آپ پڑھ سکتے ہیں۔ اس وقت میری گفتگو کا تعلق اصول سے نہیں بلکہ واقعات سے ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خلافت نے جب سے بجائے خلافت کے ''ملوکیت'' کی شکل اختیار کی اس وقت سے مسلمان سلاطین اور بادشاہوں کا بہ تدریج حدود سے گذر کر تکلفات کی طرف قدم بڑھتا چلا گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں۔ مسلمانوں کی لئے ان چیزوں کا ذکر ندامت اور شرمندگی ہی کے جذبات کو متحرک کرتا ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ:

"اول من تنعم فی مأکلہ ومشربہ وملبسہ معاویۃ"

ترجمہ: مسلمانوں میں سب سے پہلے جن صاحب نے کھانے پینے، لباس وغیرہ میں تکلف کی ابتداء کی وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ [الدمیری، صفحہ ۵۲]

اور اس سلسلہ میں محاضرات و مسامرات کی کتابوں میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق دلچسپ حکایتیں نکل کی جاتی ہیں۔ بلکہ لکھنے والوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ بنی امیہ کے توشک خانہ سے لباس کا جو ذخیرہ برآمد ہوا تھا۔ اس میں حضرت معاویہؓ کے کپڑے اپنی روغنی آستینوں ہی کی علامت سے پہچانے جاتے تھے۔

ایک دلچسپ قصہ

اگرچہ ابن اثیر نے اسی کھانے پینے کے قصے میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ لطیفہ بھی نقل کیا ہے کہ:

''عبیداللہ بن ابی بکر معاویہؓ کے دستر خوان پر ایک دن اپنے صاحبزادہ کے ساتھ کھانے کے لئے بیٹھے، عبیداللہ کے یہ صاحبزادے کچھ پر خور تھے۔ بار بار امیر معاویہؓ کی نظر اس بچے پر پڑ رہی تھی۔ عبیداللہ نے اس کو بھانپ لیا، دوسری دفعہ جب کھانے کے لئے عبیداللہ مدعو ہوئے تو اب کے وہ تنہا بیٹھ گئے۔ امیر معاویہؓ نے دریافت کیا کہ:

"مافعل ابنك التلقامه"

ترجمہ: تمہارا تلقامہ (تلقامہ مبالغہ کا صیغہ ہے لقمہ اس کا مادہ ہے۔ بہت کھانے والا آدمی اس سے مراد ہے) بیٹا کیا ہوا جو آج نہیں آیا؟

اس کے جواب میں عبیداللہ نے کہا کہ ''بیمار ہو گیا ہے'' امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے سن کر فرمایا کہ:

''میں تو پہلے ہی سمجھے ہوئے تھا کہ اس کے کھانے کا جو انداز ہے ضرور کسی بیماری کو دعوت دے گا۔'' [کامل ابن اثیر صفحہ ۵ ج ۴]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بذات خود امیر معاویہؓ کا طرز عمل اس بات میں کچھ ہی رہا ہے لیکن اصولی طور پر ''پر خوری'' کو وہ بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔

لیکن دولت جن لوازم کے ساتھ آئی ہے ان سے مسلمان کیسے بچ سکتے تھے۔ عوام کے متعلق تو نہیں کہتا، لیکن ارباب حکومت کی بے احتیاطیاں جو آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں بجائے کیفیت کے کمیت میں لوگوں نے مبالغہ شروع کیا۔

حجاج کی کثرت خوری

خود حجاج کے متعلق ابن عساکر نے یہ نقل کیا ہے کہ ''ایک ایک نشست میں وہ اتنی اتنی روٹیاں اور ہر روٹی میں ایک کفِ دست مکھن بھر بھر کر نگل جاتا تھا۔ اور بھی اس کے پر خوری کے

قصے کتابوں میں منقول ہیں۔

مشہور ہے کہ اپنے طبیب تیاذوق نامی سے حجاج نے ایک دفعہ ضعفِ معدہ کی شکایت کی۔ اس نے ہدایت کی کہ بھنے ہوئے پستے استعمال کیجئے۔ یہ سن کر اپنے ارباب حاشیہ سے حجاج نے ذکر کیا کہ بھنے ہوئے پستوں کا مشورہ آج تیاذوق نے مجھے دیا ہے۔ خوشامدیوں کے مختلف گھروں سے بھنے ہوئے پستوں کی سینیوں پر سینیاں تھوڑی دیر کے بعد ہی نازل ہونے لگیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ طبیب نے حکم دیا ہے، مٹھیوں میں بھر بھر کر حجاج پستوں کو پھانکنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قریب قریب ہیضہ کی شکل اس نے اختیار کر لی۔ بڑی مشکل سے جان بچی۔

[عیون الانباء صفحہ ۱۲۲ ج ا]

ابن ہبیرہ کی کثرت خوری

بنی امیہ کے گورنروں میں ابن ہبیرہ مشہور ''معلقاموں'' میں تھا۔ وہی ابن ہبیرہ جس نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو تازیانوں سے پیٹا تھا۔ لکھا ہے کہ:

''صبح ہونے کے ساتھ پہلا کام ابن ہبیرہ کا (حاجات ضروری اور نماز وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد) یہ تھا کہ دودھ کا ایک بڑا پیالہ اس کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ شہد یا شکر کو پیالی میں رکھ کر دودھ کو اسی پر نچوڑتے تھے اور اسی تازہ تازہ دودھ کے ''قدح کبیر'' کو وہ چڑھا جاتا تھا۔ آفتاب جب نکلتا تب ناشتہ حاضر کیا جاتا تھا۔ یہ ناشتہ کیا تھا؟ دو تلی ہوئی مرغیاں، دو کبوتر کے پٹھے اور ایک حیوان کا نصف بھنا ہوا دھڑ۔ اس کے سوا مزید چند دوسرے قسم کے گوشت بھی ناشتے کے اس دسترخوان پر ہوتے تھے اور یہ سب کچھ ایک ابن ہبیرہ کا ذاتی ناشتہ تھا۔ اس کے بعد وہ دفتری کاروبار میں مشغول ہو جاتا تھا۔ دوپہر تک کام کرتا رہتا۔ اس کے بعد دفتر سے اٹھ کر پھر آرام گاہ میں اپنے آتا اور اب دوپہر کے کھانے کا دسترخوان چنا جاتا۔ اس وقت بھی بڑے بڑے لقمے اٹھاتا

تھا۔ کیونکہ دوپہر کے کھانے میں اس کے ساتھ دوسرے ارباب حکومت بھی شریک رہتے تھے۔ کھانے کے بعد اندر حرم میں چلا جاتا تھا۔ ظہر کی نماز کے لئے پھر برآمد ہوتا اور نماز کے بعد کاروبار میں مشغول۔ عصر کی نماز پڑھ کر بیٹھتا۔ اس وقت عام مجلس ہوتی تھی۔ خود تو تخت پر بیٹھتا تھا اور گردوپیش میں لوگ کرسیوں پر بیٹھتے۔ اس کے بعد دودھ شہد آمیختہ اور دوسرے قسم کے مشروبات کا دور چلتا۔ اسی عرصہ میں پھر دسترخوان بچھ جاتا۔ جس پر کھانے والوں کی ایک کافی تعداد بیٹھتی تھی۔ عوام کے لئے تو دسترخوان پر کھانے چنے جاتے تھے اور خود ابن ہبیرہ اور اس کے مخصوص درباریوں کے لئے خوان (یعنی چھوٹے چھوٹے پائے کی میز) رکھی جاتی۔ مغرب کے وقت تک کھانے کا یہ قصہ ختم ہوتا تھا۔

بنی امیہ اور ان کی تقلید میں عباسی خلفاء کا ایک دوامی دستور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولاۃ، حکام، جس شہر میں رہتے تھے۔ وہاں کے ممتاز باشندوں کو کم از کم ایک وقت وہ اپنے ساتھ کھانا ضرور کھلاتے تھے اور حکومت کی طرف سے اس کا ان کو اشارہ تھا اور خرچ ملتا تھا کہ عوام کی ہمنوائی اور ہمدردی کے حاصل کرنے کا ایک کارگر ذریعہ اس کو وہ خیال کرتے تھے۔

سلیمان بن عبدالملک کی پرخوری

باقی اموی خلفاء میں سلیمان بن عبدالملک کی پرخوری تو ایک عام مشہور سی بات ہے تقریباً ہر مورخ نے اس لطیفہ کو لکھا ہے کہ:

"طائف موسم گرما بسر کرنے کے لئے ایک دفعہ گیا ہوا تھا کسی باغ میں پہنچا، ستر انار کھانے کے بعد مسلم حلوان اور چھ مرغیاں مسلم بھنی ہوئیں سب کو چڑھا گیا، اس کے بعد طائف کی کشمش مٹھیوں میں بھر بھر کر پھانکتا رہا۔ کچھ نیند آ گئی۔ سو کر بیدار ہوا اور حسب معمول دوپہر کے کھانے میں جو کچھ کھانا تھا۔ سب

کھایا۔ کہتے ہیں کہ اسی میں بے چارے کی جان بھی گئی۔ دراصل سیر کے لئے گیا ہوا تھا۔ قریب میں کوئی نصرانی رہتا تھا۔ دو تھیلیاں تحفہ میں اس نے پیش کیں۔ ایک میں انجیر اور دوسری میں ابلے ہوئے انڈے تھے۔ دونوں تھیلیوں کو صاف کر کے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ گودا اور شکر پیش ہوئی۔ ان کو بھی اپنی زنبیل میں داخل کر دیا۔ اور اسی بھری ہوئی زنبیل کے ساتھ عالم آخرت کی راہ لی۔ تخمہ ہو گیا تھا۔"

مسعودی نے تو بطور ضرب المثل کے لکھا ہے کہ اموی دور میں امیر معاویہ، عبید اللہ بن زیاد، حجاج اور سلیمان اور عباسیوں میں امین کثرت اکل میں مشہور ہیں۔ [صفحہ ۲۶۷ جلد ۲]

بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے کہ "تنعم فی الماکل" کا جو الزام امیر معاویہؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور اس کے زمانہ میں بھی اور ان کے بعد بھی بنی امیہ کی حکومت تک اس "تنعم" کا تعلق بجائے کیفیت کے زیادہ ترکمیت یعنی مقدار کی زیادتی ہی معلوم ہوتا ہے۔ البتہ بنی عباس کے ہاتھ میں جب حکومت آئی تو اس کے بعد کیفیت میں وہ رنگارنگی پیدا ہوئی کہ بیان کرنے والوں کے بیان پر مشکل ہی سے بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

ہزار درہم کا ایک پیالہ

ابراہیم بن مہدی جو ہارون کا حقیقی بھائی تھا، اسی نے ہارون کی دعوت میں، دعوت سے پہلے ایک پیالہ پیش کیا۔ پوچھا گیا کہ کیا ہے؟ تو ابراہیم نے خلیفہ سے عرض کیا کہ "ایک قسم کی مچھلی جس کی زبان لذیذ سمجھی جاتی ہے۔ ان ہی مچھلیوں کی یہ زبان ہے۔" ہزار درہم صرف اس ایک پیالہ پر خرچ ہوئے تھے۔ ہارون کو ابراہیم کا یہ اسراف سخت ناگوار گذرا۔

ابن عساکر نے لکھا ہے کہ "ہارون نے کہا کہ جب تک ہزار اشرفیاں میرے سامنے نہ لائی جائیں گی، جنہیں میں خیرات نہ کر لوں۔ اس وقت تک میں اسے نہیں کھا سکتا۔" ابراہیم نے ہزار اشرفیاں پیش کیں، ہارون نے غرباء میں تقسیم کر دینے کا حکم دیا اور ابراہیم کو مخاطب کر کے اس

نے کہا کہ:

"ارجوان تکون هذه كفارة سرفك"

ترجمہ: مجھے امید ہے کہ شاید یہ تمہاری فضول خرچی کا کفارہ بن جائے۔

اس کے بعد جس جام میں زبان آئی تھی، اس کی قیمت ہارون نے دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ دوسوستر اشرفیوں میں خریدا گیا تھا۔ ہارون نے حکم دیا کہ ابھی اس کو باہر لے جاؤ۔ اور سب سے پہلے جس فقیر پر نظر پڑے اس کو دے دو۔ ابراہیم کا بیان ہے کہ میں نے اپنے بعض ملازموں کو اشارہ کیا کہ جس فقیر کو یہ جام دیا جائے اس سے خرید کر واپس لے آؤ۔ ہارون تاڑ گیا، اس نے حکم دیا کہ فقیر کو جام دیتے ہوئے یہ بھی کہ دینا کہ ڈھائی سو اشرفی سے کم میں اسے نہ فروخت کرے۔ یہ ہی ہوا کہ ابراہیم کے ملازموں نے دوسو اشرفیاں دے کر اس جام کو فقیر سے خرید لیا۔

[عیون الانباء صفحہ ۲۷۰ ج ۲]

ہندوستان میں کثرت خوری کے قصے

اور سچ پوچھئے تو ایک حد تک "حلقاموں" کا یہ طبقہ جو عموماً ہر ملک اور ہر زمانہ میں پایا گیا ہے۔ اپنی شکمی صلاحیتوں کی بنیاد پر کچھ مجبور بھی ہوتا ہے۔ آخر بے چارے کیا کریں۔ انسانی کھانے کی جو عام مقدار ہے اس سے اگر ان کی سیری نہ ہوتی ہو تو اس میں خود ان بے چاروں کا کیا قصور ہے؟ ہندوستان کی تاریخ میں بھی ان حلقاموں کا ایک گروہ مختلف زمانوں میں پایا گیا ہے۔ اکبری دربار کے امیر میر نمکین کے حالات میں لکھا ہے کہ:

"گویند اشتہا بسیار داشت. ہزار انبہ و ہزار سیب شکری، ودو خربزہ یك یك منی، می خورد" [مآثر الامراء، صفحہ ۷۷]

ان کو میر نمکین کا خطاب اس لئے دیا گیا تھا کہ سیندھا نمک کا جو پہاڑ پنجاب میں سندھ ساگر کے دوآبے میں واقع ہے، اسی پہاڑ کی نمکیں چٹانوں سے رکابی، کٹورا بنوا کر اکبر کی خدمت میں تحفہ پیش کیا تھا۔ اس لئے میر نمکین کے نام سے مشہور ہو گئے۔ مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ سیندھا

نمک اس پہاڑی نمک کو اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ سندھ ساگر کے علاقہ میں تقریباً ۲۰ میل کے طول میں یہ پہاڑ وقع ہے اسی کی طرف یہ نسبت ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ سترہ من پر حکومت ایک روپیہ محصول لیتی ہے۔ اسی میں ہے کہ لوگ نمکین پتھر سے طبق، سرپوش اور اقسام اقسام کے ظروف تراشتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ظروف سازی کا ایک عام اور مقبول رواج تھا۔

ابن حوقل نے بھی فارس کے ذیل میں دارابجرد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس علاقہ میں سفید، سیاہ، زرد، سرخ، سبز اور بھی ہر طرح کے رنگ کے متعدد نمک کے پہاڑ ہیں۔ ان کی چٹانیں زمین کے اوپر ہیں، لوگ نمک کی انہی چٹانوں سے تراش تراش کر ٹیبل، کھانے کی میز اور قسم قسم کے برتن بناتے ہیں اور فارس و بیرون فارس کے علاقوں میں جا کر بکتے ہیں۔

[صفحہ ۲۱۵]

اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود سے تجاوز کرنے کے باوجود اس وقت تک کھانے کی ان رنگینیوں کو عموماً پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ بظاہر عباسیوں میں ان چیزوں کی اشاعت کے ذمہ دار دربار کے ایرانی و رومی عناصر ہیں۔

ہارون کے دربار کے عیسائی طبیب بختیشوع کے متعلق ابن اصیبعہ نے لکھا ہے کہ گرمیوں میں جو چوزے مرغیوں کے وہ کھاتا تھا، خود اسی کا بیان تھا کہ ان چوزوں کو غذا میں صرف بادام و پستہ دیا جاتا ہے۔ اور عرقِ انار پلا پلا کر ان کی پرورش کی جاتی ہی۔ اسی طرح جاڑوں میں وہ چوزوں کو چھلے ہوئے اخروٹ کھلواتا تھا۔ اور دہی پلواتا تھا۔

لکھا ہے کہ بخور کے لئے کوئلے خاص طور پر بنواتا تھا۔ یعنی اولاً جن لکڑیوں سے کوئلے بنائے جاتے تھے۔ وہ لکڑیاں خود کسی خوشبودار درخت کی ہوتی تھیں، پھر جلی ہوئی لکڑیوں کو کوئلہ بنانے کے لئے جب بجھاتے تھے تو عرق گلاب جس میں مشک کافور، عرق بید مشک، پرانی شراب وغیرہ چیزیں ملی رہتی تھیں، اسی پانی کو چھڑک چھڑک کر آگ ٹھنڈی کی جاتی تھی۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کم از کم امراء کا بالائی طبقہ ان امیرانہ چونچلوں میں ضرورت

مبتلا ہوگیا تھا۔ ہندوستان تک کا جب یہ حال تھا کہ ابوالفضل کی ایک دعوت کا نقشہ شاہ نواز خان نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ یہ خداوند خاں دکنی کی ضیافت کا قصہ ہے۔ لکھا ہے کہ:

''خداوند خاں دکنی کے ہر ہر نوکر (جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہوگی عموماً وہ گورنری کے عہدوں پر سرفراز رہے تھے) کے سامنے نونو قاب پلاؤ اور ایک ایک مسلم بھنا ہوا بکرا اور سوسو چپاتیاں رکھی گئیں اور خود خداوند خاں کے سامنے بیسیوں رکابیاں چنی گئیں۔ جن میں مرغ، تیتر، بیٹر اور قسم قسم کی بھاجیاں، ترکاریاں تھیں۔ [صفحہ ۲۶۰]

ابوالفضل کی اسی دعوت کے سلسلہ میں شاہ نواز خان مصنف مآثر الامراء نے جو خود اورنگ آباد کے رہنے والے تھے عجب فقرہ لکھا ہے۔ یعنی خداوند خاں کے سامنے بجائے مسلم بکرے کے مرغ، تیتر وغیرہ پرندوں کی پلیٹیں جو رکھی گئیں تو ان کو سخت ناگوار گذرا اور دسترخوان سے یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے کہ:

"پیش ماکہ کباب مرغ آوردند ازروئے استھزاء و مسخریت بودہ"

ترجمہ: میرے سامنے مرغی کا کباب محض مجھ سے مذاق کرنے اور میری توہین کے لئے رکھا گیا۔

گویا ان کو حقیر خیال کر کے بجائی بکری کے مرغی جیسی چھوٹی چیز دی گئی۔ لکھا ہے کہ اٹھ کر چلے ہی گئے۔ اور ابوالفضل سے اخیر وقت تک صاف نہ ہوئے۔ حالانکہ خود اکبر نے بھی سمجھایا کہ ہندوستان میں معزز مہمانوں کے احترام کا یہی طریقہ ہے۔ لیکن ان کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ والد خداوند خان کے گو ایرانی مشہدی تھے، لیکن ماں ان کی حبش تھیں اور یہ کیفیت ان میں اپنی والدہ ہی کی طرف سے منتقل ہوئی ہوگی۔ مگر مجھے تعجب ہے کہ شاہ نواز خاں نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد خدا جانے یہ فقرہ آخر میں کیوں لکھا ہے کہ:

''ازین ست کہ در ہندوستان اہل دکن بحماقت وسخافت عقل

شهرت دارند"
[صفحہ ۲۶۰]

جیش حماقت کو نہ معلوم کیوں انہوں نے بلاوجہ دکن کی طرف منسوب کر دیا۔

اور اس قسم کے واقعات مثلاً پیر محمد خاں شیروانی کے متعلق کہا ہے کہ:

"روزانه هزار قاب بر دستر خوانش می کشیدند"

[مآثر الامراء صفحہ ۶۷۱ ج ۳]

صفاری بادشاہ عمرو بن لیث کے متعلق الفخری نے لکھا ہے کہ "چھ سو اونٹ پر اس کا سفری باورچی خانہ چلتا تھا۔
[صفحہ ۲۳۲]

اس میں علاوہ طعامی عیاشیوں کے ممکن ہے کہ غرباء پروری کا جذبہ بھی ان لوگوں کے سامنے ہو۔

اور یہی حال لباس کا تھا۔ اس میں بھی افراط کی ابتداء کا الزام لوگوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر ہی لگایا ہے۔ بلکہ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ جن دنوں امیر معاویہؓ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے شام کے والی تھے، اسی زمانہ میں ایک دفعہ مدینہ اس حال میں پہنچے کہ ایک خوبصورت سبز جوڑا ان کے بدن پر تھا۔ ان کے اس لباس کو دیکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نگاہیں اٹھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ درہ لئے ہوئے سیدھے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سر پر پہنچے اور:

"فجعل ضرباً بمعاوية"

فاروقی درہ ادھر مسلسل عمل میں مصروف تھا اور ادھر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ فقرہ نکل رہا تھا:

"الله الله یا امیر المؤمنین فیم فیم"؟

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کا جواب بھی صرف درے سے دے رہے تھے۔ جب دھیمے ہوئے تو اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ آخر اس بے چارے نوجوان میں کیا بات آپ نے دیکھی جو درے کا مستحق قرار دیا؟۔ جواب میں آپ نے صرف اشارہ کیا۔

راوی کا بیان ہے کہ اس سے سمجھا گیا کہ دماغ میں کچھ بلندی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی کا ازالہ مقصود تھا۔ حضرت عمرؓ کے اشارے سے یہی بات لوگوں کی سمجھ میں آئی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امیر معاویہؓ نے بعد بنی امیہ کے امراء جواب بنی امیہ کے شہزادے کہلاتے تھے، لباس میں بہت زیادہ آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ مگر اس میں بجائے کیفیت کے کمیت ہی پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عہد تک زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

ہشام بن عبدالملک کے لباسی تکلفات

ہشام بن عبدالملک کے متعلق ''عقد الفرید'' وغیرہ بھی لباسی تکلفات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی کپڑوں کی کثرت ہی کا زیادہ تر پتہ چلتا ہے۔ مثلاً یہ کہ حج میں جب ہشام گیا تھا، تو سات سو اونٹوں پر اس کے ذاتی مصرف کے کپڑے لدے ہوئے تھے۔

[عقد الفرید، صفحہ ۲۶۶ ج ۲]

اسی طرح جو قمیصیں وہ پہنتا تھا۔ جب گننے والوں نے انہیں گنا تو واللہ اعلم بالصواب بتایا گیا کہ ایک لاکھ بیس قمیصیں نکلیں۔ اور دس ہزار ریشمی آزار بند تھے۔ [المستطرف صفحہ ۴۰ ج ۲]

بنی آدم کے لباس کا سفر پتے سے سونے چاندی تک

لیکن اس کے بعد پھر جن نفاستوں اور نزاکتوں کا مسلسل اضافہ ان سلاطین اور امراء نے لباس میں کیا انہیں کون بتا سکتا ہے۔ سونے اور چاندی کے تاروں سے مزرکش کئے ہوئے کپڑے تو خیر کس شمار و قطار میں تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ جواہرات اور موتیوں کو ان کپڑوں میں طرح طرح سے کھپانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ ترکی بادشاہ مراد نے شاہ جہاں کو جو تحائف میر ظریف کی معرفت بھیجے تھے۔ ان میں ایک عباء تھی جو مروارید صادق سے بنی گئی تھی۔ خیال تو کیجئے کہ بنی آدمؑ نے پتوں سے لباس کے مسئلہ کو شروع کیا۔ جیسا کہ قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ پھر شاید چمڑوں سے ستر پوشی کا کام لوگوں نے لیا۔ تب اون پر آئے۔ اون سے روئی اور کتان تک پہنچے، آخری پرواز ریشم تھی، لیکن بادشاہوں اور ان کی درباریوں نے سونے چاندی

کے تار کھچوا کر ریشم اور اون کے ساتھ ان کو شریک کیا اور آخری انتہا اس کی یہ ہوئی کہ عبائے مردار ید دوزتک بات پہنچ کر رہی۔ [ماثر الامراء، صفحہ ۱۱ ج ۱]

آدم علیہ السلام کی اولاد جب تکلف کی طرف بڑھتی ہے تو جہاں تک جس چیز کو وہ پہنچا کر رہے کم ہے۔

المقریزی نے ابن طولون والی مصر کی پوتی قطر الندیٰ جو خلیفہ معتصد باللہ سے بیاہی گئی تھی۔ اس کے جہیز کی جو فہرست لکھی ہے اور جو کچھ اس میں تھا وہ تو خیر تھا ہی۔ میں تو ان الفاظ کو پڑھ کر دنگ ہو گیا کہ:

''جہیز کی اسی فہرست میں ہزار ازار بند تھے جن میں ہر ازار بند کی قیمت دس دس اشرفیاں (اور وہ بھی مصری اشرفیاں تھیں۔)'' [مقریزی، صفحہ ۳۱۹ ج ۱]

قریب قریب ڈھائی سو روپے کا ایک ازار بند اس حساب سے پڑتا ہے۔ انتہاء ہے اس زر مستی کی؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کے تکلفات سلاطین و امراء ہی کی حد تک محدود تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی غلط ہے کہ عوام اس زمانہ میں فقر مدقع (کمر توڑ دینے ولے) افلاس میں مبتلا تھے۔ گزشتہ مثالیں غالباً میرے بیان کی تائید کے لئے کافی ہیں۔

مسلمانوں کا کھانے اور پہننے میں معیار

بہر حال غیر ضروری مصارف کے متعلق تو میں نہیں کہتا لیکن عام ضروریات زندگی، خورد نوش، لباس، مکان وغیرہ کی حد تک عام مسلمانوں کا ایک معیار ضرور قائم ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ یہی تھی۔ یعنی باوجود مذہب اور دین ہونے کے اسلام نے رفاہی اور ریاستی زندگی سے صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کو روکا نہیں تھا بلکہ روکنے والوں کو قرآن میں ڈانٹا گیا ہے۔ پوچھا گیا ہے کہ ''الطیبات من الرزق'' یعنی صاف ستھرے پاکیزہ کھانوں اور آرائش و زیبائش کے لئے جن چیزوں کو خدا نے پیدا کیا ہے، ان کو حرام کرنے والے کون ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ خود صحابہ اور صحابہؓ کے بعد بھی عمومی طور پر لوگوں کو طعام و لباس میں بھی وہی حال تھا، جو میں نے مکانوں کے سلسلہ

میں مسلمانوں کے نقطہ نظر کو بیان کیا ہے۔ لوگ اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے، لیکن حدود سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ عبدالکریم ابوامیہ مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے بدن پر موٹے اون کا لباس ہے تو میں نے کہا کہ:

"هذازى الرهبان وان المسلمين اذا تزاوروا تجملوا"

ترجمہ: یہ تو تارک الدنیا عیسائی فقیروں کا بنا ہے۔ مسلمانوں کو تو چاہئے کہ باہم ایک دوسرے سے جب ملاقات کریں تو اسی وضع میں ملنا چاہئے، جس سے جمال کا اظہار ہو۔

[طبقات ابن سعد صفحہ ۸۲ ج ۷]

صوفیہ اسلام کے سرخیل خواجہ بصری کے حوالہ سے طبقات ہی میں ہے، لکھا ہے کہ ان کی مجلس میں ان لوگوں کا ذکر ہوا جو فقیرانہ خرقہ اور گودڑ پہنتے ہیں تو آپ نے فرمایا:

"اكنوا الكبر فى قلوبهم واظهروا التواضع فى لباسهم والله لاحدهم اشد عجبا بكسائه من صاحب مطرف بمطرفه"

ترجمہ: دلوں میں کبر اور برائی کے جذبہ کو چھپائے ہوئے ہیں اور بظاہر فروتنی اور خاکساری ظاہر کرتے ہیں۔ خدا کی قسم اپنے خرقہ پر ان میں ہر ایک اسی درجہ نازاں ہے، جتنا کہ ایک دوشالے والا ایک دوشالے پر ناز کرتا ہے۔ [طبقات ابن سعد ص ۱۳۳ ج ۷]

مدینہ کے فقہائے سبعہ جن کے متعلق لوگوں نے اس تجربہ کو مشہور کیا ہے اور کم از کم میں نے تو اس تجربہ کو صحیح پایا ہے کہ ان کے مبارک اسماء کو لے کر درد سر والے کو اگر دم کیا جائے تو فوراً درد سر میں کمی ہو جاتی ہے۔ ان میں سے حضرت عروہ اور حضرت قاسم کے متعلق ابن سعد نے لکھا ہے کہ حضرت عروہ روزانہ غسل کے عادی تھے۔ ملحفہ جو اوڑھتے تھے تو وہ ہلکے زعفرانی رنگ کی ہوتی تھی۔ لیکن اتنی نفاست سے وہ رنگی جاتی تھی کہ ایک دینار رنگوائی کا معاوضہ ادا کرتے تھے۔

[ابن سعد صفحہ ۱۳۳ ج ۵]

عہد صحابہ میں خز کپڑے کی مقبولیت

عہد صحابہؓ میں ایک خاص قسم کا کپڑا جس کا نام خز تھا، بہت مقبول ہوا۔ طبقات ابن سعد سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی صحابی ایسے تھے جو اس کپڑے کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کپڑے کی قیمت بھی کافی ہوتی تھی۔ ابن سعد ہی میں ایک جگہ خز کے مطرف کا دام ساتسو درہم بتایا گیا ہے۔ [صفحہ ۵۴ ج ۵]

خز کی تشریح

خز کی تشریح میں لوگ مختلف ہیں۔ لیکن طبقات ابن سعد سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سدی (بانا) تو اس کا ریشم (حریر) کا ہوتا تھا اور لحمہ (تانا) اس میں مختلف چیزیں مثلاً سوت یا کتان یا اون استعمال کرتے تھے۔ پھر اون کی نوعیت بھی مختلف ہوتی تھی۔ جن جن جانوروں کے اون خصوصی طور پر نرم اور ملائم ہوتے تھے۔ انہی کا تاگا بنا کر تانا بنایا جاتا تھا۔ اسی لئے بعض لوگ لکھ دیتے ہیں کہ نر خرگوش کا اون ہوتا تھا۔ بعض لکھتے ہیں کہ بحیرہ خزر اور ترکوں کے ملک سے لومڑیوں کے بال سے جو تاگا بنایا جاتا تھا۔ اس سے اس کا تانا تیار ہوتا تھا۔ بعضوں نے بعض دریائی جانوروں کا بھی نام خز کے سلسلے میں لکھا ہے جن کے بال لمبے لمبے ہوتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ تانے میں سب ہی چیزیں استعمال کرتے تھے۔ اونی خز کو سردیوں میں اور سوتی وکتانی کو گرمیوں میں استعمال کرتے ہوں گے۔ کیونکہ ہر زمانے میں دیکھتے ہیں کہ خز استعمال کرتے تھے۔ اس کپڑے کا رنگ بھی مختلف ہوتا تھا۔ یعنی جس قسم کا رنگ لوگ پسند کرتے تھے، اسی قسم کا رنگ چڑھا دیا جاتا تھا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر صحابہ اور تابعین اس خز کے کپڑے کو بکثرت استعمال کرتے تھے، حضرت قاسم کے حالات میں لکھا ہے کہ:

> ''کبھی کبھی برآمد ہوتے اور ان کا جبہ بھی خز کا، چادر بھی خز ہی کی، عمامہ بھی خز ہی کا اور عمامہ کے نیچے ٹوپی بھی خز ہی کی ہوتی''۔

حالانکہ اسی طبقات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام سوتی کپڑوں کی قیمت اس زمانہ میں بھی قریب قریب وہی تھی، جو آجکل ہے یعنی لنگی سوتی تین درم میں اور کرباسہ راز یہ جس سے کرتہ قمیص وغیرہ بناتے تھے، کل بارہ درم میں بیچا جاتا تھا۔ [دیکھو طبقات ابن سعد ص ۸۲ ج ۷]

سچ تو یہ ہے کہ تین درم یعنی قریب قریب بارہ آنے میں سوتی لنگی آج بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

عام استعمالی کپڑوں کی ان ہی ارزانیوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے عہد میں ستر پوشی کے مسئلہ میں بھی کسی ملک اور کسی زمانہ میں کسی قسم کی شکایت کی روایت کتابوں میں نہیں ملتی۔ رہا کھانے پینے کی چیزوں کا سوال، ان کی ارزانیوں کا ذکر تو پہلے بھی آچکا ہے۔ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے، مسلمانوں میں فواکہ اور فواکہ کے بعد گوشت، مچھلی، یہ ان کی مرغوب غذائیں معلوم ہوتی ہیں۔ ابن حوقل ہو یا الہمدانی یا خردادبہ ہو یا اصطخری، ان سب کی کتابیں مسلمانوں کی عام آبادیوں کی اس خصوصیت سے بھری ہوئی ہیں۔ یعنی ہر جگہ بتاتے ہیں کہ مختلف قسم کے میووں اور پھلوؤں کے باغات سے وہ گھری ہوئی ہیں۔ تھوڑی بہت تفصیل اس کی گذشتہ اوراق میں آپ پڑھ بھی چکے ہیں۔

اور یہی حال ان مویشیوں کا ہے، جن کا گوشت عموماً مسلمان استعمال کرتے تھے۔ پکانے میں بھی خاص لطافت و پاکیزگی کا خیال رکھا جاتا تھا۔

حضرت حسن بصریؒ کا کھانے میں معمول

سرتاج صوفیہ خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تک جیسے حضرات غذائی لطافتوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ طبقات میں ہے کہ بیان کرنے والے بیان کیا کرتے تھے کہ:

"کان الحسن یشتری لحماً کل یوم بنصف درھم وقال ما شممت مرقة قط اطیب ریحاً من مرقة الحسن"

ترجمہ: حسن بصری روزانہ نصف درہم کا گوشت خریدا کرتے تھے۔ ان کے

شوربے کی جیسی خوشبو میں نے کسی شوربے میں نہیں پائی۔ [طبقات ابن سعد ص ۱۲۱ ج ۷]

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب بصرہ اپنے تمدن وعمران کی انتہائی نقاط تک گویا پہنچ چکا تھا۔ لیکن گوشت کی ارزانی کا اس سے اندازہ کیجئے کہ خواجہ حسن بصری جن کا کنبہ بھی اچھا خاصا تھا، نصف درہم کا گوشت دونوں وقت کے لئے ان کے یہاں کافی ہوجاتا۔ قریب قریب دو آنے یومیہ کا اوسط پڑتا ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گوشت اس زمانے میں مسلمانوں کی روزمرہ کی غذا میں شریک ہو چکا تھا۔ اگرچہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ روزانہ گوشت کھانے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ صحابی کو ایک دفعہ آپ نے ڈانٹا بھی تھا۔ [تیسیر الوصول]

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بتدریج یہی رواج غالب آ گیا جو قریب قریب اس وقت تک جاری ہے۔

طبقات ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ نفاست پسند حضرات عام بازاری گھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ عامر بن عبداللہ بن عبدالقیس کے ذکر میں ابن سعد ہی نے نقل کیا ہے کہ گھی کے متعلق ان سے جب دریافت کیا گیا تو بولے کہ:

"اکل من ھھنا و اشار الی البادیۃ وھاھنا و اشار الی الجبل"

ترجمہ: میں یا تو اس گھی کو کھاتا ہوں جو یہاں سے آتا ہے اور بادیہ (صحراء) کی طرف اشارہ کیا یا جو گھی وہاں سے آتا ہے اور پہاڑ کی طرف اشارہ کیا۔ [طبقات ابن سعد صفحہ ۷۵ ج ۷]

سبزی اور ترکاریوں کا استعمال

اسی طرح بعض لوگ عام کھیتوں کی ترکاریاں اور بھاجی بھی اس لئے استعمال نہیں کرتے تھے کہ ان کے کھیتوں میں غلاظت وغیرہ کھاد کے طور پر ڈالی جاتی ہے۔ رفیع بن مہران ابوالعالیہ کے ذکر میں ابن سعد نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اپنے باغ سے ان کے پاس ترکاریاں بھیجیں جو بغیر کھاد کے اگائی جاتی تھیں، تو ان کو انہوں نے شوق سے لیا،

اور ایک صاحب سے عام ترکاریوں اور بقول کے متعلق فرمایا کہ:

"تنبت فی منبت خبیث تعلم ماھو ؟ قلت ماھو ؟ قال الخرء والبول وخرق الحائض" [طبقات ابن سعد، صفحہ ۸۴]

ترجمہ: یہ ترکاریاں نہایت گندی جگہوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ مخاطب سے پھر پوچھا کہ وہ گندگی کیا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ غلاظت، پیشاب، حیض وغیرہ۔

لیکن سنن بیہقی میں حضرت سعد بن وقاص فاتح ایران رضی اللہ تعالی عنہ کے متعلق یہ روایت نقل کی ہے کہ اپنی زمین کا کھاد خود اپنی پیٹھ پر لاد کر لے جاتے اور ڈالتے اور فرماتے کہ کھاد کا ایک تھیلا گیہوں کا ایک تھیلا ہے۔ میری کتاب "اسلامی معاشیات" میں اس قسم کی چیزیں تفصیل سے ملیں گی۔

شکر کو ڈلی کی شکل میں ڈھال لینے کا رواج

ابوالعالیہ الریاحی کا شمار اگرچہ کبار تابعین میں ہے، لیکن ابتداء میں یہ بھی موالی میں تھے۔ بعد کو ان کی مالکہ عورت نے ان کو آزاد کر دیا تھا۔ پھر علم حاصل کیا اور بڑے آدمی ہوئے۔ مزاج میں بڑی لطافت تھی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ کھاد کی پیدا کی ہوئی ترکاریاں نہیں کھاتے تھے۔ ان ہی کے حال میں یہ بھی لکھا ہے کہ "شکر" جو یہ استعمال کرتے تھے وہ مختلف مہر لگی ہوئی پڑیوں میں محفوظ رہتی تھی۔ لکھا ہے کہ:

"بسکر مختوم بفص الخاتم واعطاہ عشر سکرات"

ترجمہ: ملازم مہر زدہ پڑیوں میں شکر کی ڈلیاں لایا۔ تب آپ نے دس ڈلیاں شکر کی ملازم کو عطا کیں۔ [ایضاً صفحہ ۸۳ ج ۷]

اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ شکر کو ڈلی کی شکل میں ڈھال لینے کا رواج اسی زمانے میں ہو چکا تھا اور یہ پہلی صدی ہجری کے واقعات ہیں۔ گویا دنیا جس زمانے میں صرف راب اور گڑ میں چپکی ہوئی تھی، مسلمانوں کی لطافت طبعی نے اس کو صفائی میں ترقی کے اس آخری زینے تک اسی

زمانے میں پہنچادیا تھا جس سے آگے اس میں اس وقت تک ترقی نہیں ہوئی ہے۔ جرجی زیدان تک نے یہ مانا ہے۔

چینی کی اشاعت مسلمانوں کے ذریعہ

اور ''برٹانیکا انسائیکلو پیڈیا'' میں ''شوگر'' پر جو مقالہ ہے اس سے یہ فقرہ اس نے نقل کیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے:

''سارے عالم میں شکر کی عام اشاعت مسلمانوں ہی کے ذریعہ سے ہوئی۔ مسلمانوں ہی نے اس کے اصلی وطن (ہندوستان) سے اس کو فارس پہنچایا اور پھر کارخانے قائم کر کر کے اس کی مختلف قسمیں انہوں نے پیدا کیں۔ جن کی اس سے پہلے کوئی نظیر موجود نہیں تھی''۔

یعنی گنے سے رس نکال کر اس کو پکانا، پکا کر راب اور گڑ بنانے کی صنعت یہ تو ہندوستان میں بہت زمانے سے جاری تھی۔ لیکن اس سے آگے قدم ہندوستان نے نہیں بڑھایا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت تک بھی اس مسئلہ میں اپنے پرانے ہی مقام پر ہے۔ عام طور پر دیسی طریقہ سے ہندوستان میں گڑ اور راب زیادہ سے زیادہ کچی کھانڈ تک لوگ بناتے ہیں۔ لیکن یہ راز کہ گنے کے اس عرق میں بلوریت تک پہنچنے کی صلاحیت ہے بہ ظاہر اس کے موجد مسلمان ہی معلوم ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ پہلی صدی ہجری میں اس کو ارتقاء کی اس منزل تک پہنچادیا تھا۔

مسلمانوں کے اس عہد حیات میں ان کی زندگی کا جو نظام تھا، ان سیاحوں کی زبانی اس کے قصے سن سن کر آج بھی منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ مقدسی سابور نامی ایک ایرانی علاقہ کا ذکر ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ اس خطہ کے ایک ایک باغ میں کھجور، زیتون، ترنج، خرنوب، اخروٹ، بادام، انجیر، انگور، بیر، گنے، بنفشہ، چنبیلی، الغرض مذکورہ بالا سب طرح کے فواکہ پھل، پھول تم کو نظر آئیں گے۔ نہروں کو ان باغوں میں رقص وکناں پاؤ گے۔ آبادیاں قریب قریب ہیں۔ میل ہا میل

تم درختوں کی چھاؤں میں چلے جاؤ گے، پھر اس زمانہ میں نان بائیوں کی دکانوں کا جو نظم اسلامی ممالک میں قائم تھا، اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"ہر تین میل میں نان بائی کی تم کو دکان یقیناً ملے گی اور وہیں پر بقال کی دکان بھی ہوگی"۔ [المقدسی صفحہ ۴۴۴]

اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"وللشوائين دكاكين على حدة" [ایضاً صفحہ ۴۴۰]

ترجمہ: کباب والوں کی دکانیں الگ رہتی ہیں۔

اور سچ تو یہ ہے کہ قوموں میں جب زندگی ہوتی ہے تو اس زندگی کے آثار ہر شعبہ میں محسوس ہوتے ہیں۔

ایران کی لذیذ ترین مچھلی

غذاؤں ہی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بات ایران کے شہر دارابجرد کے متعلق لکھی ہے کہ خدا جانے یہاں کے باشندوں نے کہاں سے مچھلیوں کی ایک ایسی قسم ڈھونڈ نکالی تھی کہ ابن حوقل کہتا ہے:

"بدارا بجرد حوت من الخندق المحيط بالبلد فيه لاشوك فيه ولا عظم ولا فقار لكن له فلوس" [ابن حوقل، صفحہ ۲۸]

ترجمہ: دارابجرد شہر کے چاروں طرف جو تالاب ہے اس میں ایک خاص قسم کی مچھلی ہوتی ہے جس میں نہ کانٹے ہوتے ہیں، نہ ہڈیاں، نہ ریڑھ کی ہڈیاں، لیکن بالائی جسم پر سے چھلکے (فلوس) ہوتے ہیں۔

اور طرفہ لطیفہ جو ابی حوقل کا ذاتی تجربہ ہے یہ ہے کہ کھانے کے بعد اس نے یہ فیصلہ دیا کہ:

"وهو عندی الذّ السموك"

ترجمہ: تمام مچھلیوں میں یہ مچھلی میرے خیال میں لذیذ ترین مچھلی ہے۔

یہ ایک ایسے شخص کا بیان ہے کہ جسے ہم جہانیاں جہاں گشت کہہ سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ فلوس (چھلکے) والی مچھلیوں کی یہ خصوصیت یقیناً عجیب ہے، کیونکہ بغیر فلوس کی مچھلیوں میں کبھی یہ دیکھا گیا ہے کہ ان میں کانٹے کم ہوتے ہیں، لیکن اتنی نہیں ہوتیں، بلکہ امامیہ فرقہ کے مسلمان تو ان کو مچھلی ہی نہیں سمجھتے۔ اسی لئے کھانے سے احترام کرتے ہیں۔

ضرورت کہیے یا جستجو اور تلاش، کن کن چیزوں کو نہیں پیدا کر دیتی۔ گھاس کھانے والے یا نباتات خور جانوروں کے متعلق یہ کتنی عجیب بات ہوگی کہ گوشت اور مچھلی ان کی غذا بنا دی جائے۔

لیکن ابن حوقل ہی نے حضر موت کے علاقے مہرہ کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:

''مہرہ (عرب کے جس علاقے کا نام ہے) اس کے مرکزی شہر کا نام الشحر ہے۔ یہ بالکل بنجر اور بن کھیتی کا اجاڑ بیابان ہے۔ ان لوگوں کی زبان بھی کچھ نامفہوم سی ہے۔ ان کے ملک میں نہ تو نخلستان ہی ہیں اور نہ کسی قسم کی کھیتی، ان کی ساری دولت بس اونٹ ہیں اور بھیڑ بکریاں۔''

مہرہ کے مویشیوں کی خوراک

سوال یہ ہے کہ آخر ان مویشیوں کو وہ کھلاتے کیا تھے۔ اس کا جواب ابن حوقل نے دیا ہے کہ:

''یہ اپنے اونٹوں اور اپنے تمام مویشیوں کو ایک قسم کی مچھلی کھلاتے ہیں۔ جو چھوٹی چھوٹی ہوتی ہے۔ نام اس مچھلی کا ورق ہے۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۳۲]

لیکن اس لحمی خوراک کا ان کی مویشیوں پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ اس کا بھی جواب سنئے۔ وہی لکھتا ہے کہ:

''ان کے یہاں بختی قسم کے جو اونٹ ہیں، وہ اپنی چال میں بھی اور محنت و جفاکشی میں بھی دنیا کے تمام بختی اونٹوں سے بہتر ہیں۔''

یہ حال تو اونٹوں کا ہوا۔ بھیڑ بکریوں کے دودھ کی کیفیت یہ ہے کہ:

''ان ہی بکریوں اور بھیڑوں کے دودھ اور مچھلیوں سے ان کی زندگی ہے۔ ان کے سوا روٹی یا اس قسم کی دوسری غذاؤں سے وہ قطعاً ناواقف ہیں۔''

[ابن حوقل، صفحہ ۳۲]

خورد نوش کی اس بحث کو ختم کرتے ہوئے، کھانے پینے کی تہذیب جو اس زمانہ میں مسلمانوں میں مروج تھی، اس کا ذکر بھی سن لیجئے۔

فارس کے دستر خوان اور باورچی خانے

فارس کے ذکر میں ابن حوقل نے لکھا ہے:

''عام طور پر سلیقہ شعاری اور وضع کی پابندی ایک عام دستور ہے۔ نیز باورچی خانوں اور دستر خوانوں کے متعلق خاص سلیقہ سے کام لیا جاتا ہے۔''

یہ سلیقہ کیا تھا؟ اس کی تفصیل ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''کھانا عموماً گھروں میں کثرت سے پکتا ہے اور دستر خوانوں پر بھی جو کھانے چنے جاتے ہیں، ان کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے۔ لزوماً ہر کھانے میں میٹھا اور پھلوں کا ہونا ناگزیز ہے۔ دستر خوان بچھنے سے پہلے مٹھائیاں اور میوے پیش کئے جاتے ہیں۔ کھانے کے وقت دستر خوان پر گفتگو میں اس کا خاص لحاظ کیا جاتا ہے کہ شریفانہ درجہ سے گری ہوئی کوئی بات زبان سے نہ نکلے۔ بے حیائیوں کے اعلانیہ اظہار سے سخت پرہیز کیا جاتا ہے۔ گھروں کو بھی اور دستر خوانوں کو بھی ہمیشہ پاک و صاف رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں گویا باہم ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۲۰۶]

اسلام کی بنیادی تعلیم اعتدال

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا عام طبقہ خواہ خالص اسلامی تعلیم سے جس حد تک بھی دور ہوتا چلا جارہا ہو، لیکن اعتدال کے جس نقطۂ عدل پر اسلامی تعلیمات کی بنیاد قائم ہے اسی کا اثر یہ تھا

اور میں تو خیال کرتا ہوں کہ اب تک اسی کے آثار باقیہ کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا کی قوموں میں بعض اقوام کو اگر ایک طرف اس حال میں دیکھا جا رہا ہے، کہ کھانے میں اب تک انہوں نے درخت کے ان پتوں کے استعمال کو ترک نہیں کیا ہے، جن پر شاید نسل انسانی کے ابتدائی طبقات نے کھانا کھانے کی ابتداء کی ہوگی، پینے میں اب بھی بجائے گلاس اور پیالے کے ہاتھ کے چلوؤں سے پانی پینے کی مشق ان کا ایک دلچسپ مشغلہ بلکہ شاید آرٹ ہو۔ پہننے میں پتوں کے لباس کو تو انہوں نے چھوڑ دیا ہے، لیکن بے سلے کپڑوں کے پہننے پر ان کا اصرار اب تک باقی ہے۔ رہنے میں اس وقت تک ان کے بڑے سے بڑے خاندان کے لئے ایک دو کوٹھریاں کافی ہیں۔ بجائے دیواروں کے حجاب اور آڑ کا کام زیادہ تر رات کی تاریکیوں سے لیا جاتا ہے۔

الغرض زندگی کے تمام شعبوں میں پستی اور تنزل کا جو آخری نقطہ ہو سکتا ہے اس وقت تک اس پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اس سے ہٹنا نہیں چاہتے۔ ان ہی کے مقابلہ میں بعض دوسری قومیں ہیں کہ آلو کی ایک قاش گوشت کی ایک ایک بوٹی کے لئے مستقل پلیٹ کی کھانے میں ان کو ضرورت ہے۔ پانچ چھ آدمیوں کی ٹولی اس وقت تک کھانے کی میز پر بیٹھ نہیں سکتی۔ جب تک چالیس پچاس پلیٹوں کا نظم نہ کر لیا جائے۔ یہی حال لباس کا ہے کہ صبح و شام دوپہر الغرض دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں معمولی معمولی تغیرات پر خاص خاص وضع کے لباسوں کا بدلنا ان کے یہاں ضروری ہے۔ جن کپڑوں میں جاگتے ہیں، ان ہی میں سونا ان کے لئے ناممکن ہے۔

مکان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک جوڑے کے لئے بھی ایسا مکان کافی نہیں ہو سکتا جس میں سونے، بیٹھنے، کھانے، آرائش و زیبائش، ملاقات اور خدا جانے کن کن چیزوں کے لئے الگ الگ کمرے نہ ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سابق الذکر قوموں کی پست زندگی کے مقابلہ میں انہوں نے اپنے عوام و خواص کی زندگی کو بلندی کے ایک ایسے نقطہ پر پہنچا دیا ہے کہ وہاں تک پہنچنے کی کوششوں نے ان کی زندگی کو ان پر دوبھر بنا دیا ہے۔ گویا باہر کی اس حیثیت کی تعمیر سے اندر کو ایک دوامی جہنم کے

قالب میں ڈھال دیا ہے۔

مگر آپ دیکھ رہے ہیں، زندگی کے ان ہی شعبوں میں مسلمانوں کا اول سے آخر تک کیا حال رہا ہے۔ اس سلسلہ میں بطور مثال کے مسلمانوں کے مکان اور لباس ہی کو لیجئے۔ جس کے واقعات اور مشاہدات کافی حد تک گذر چکے ہیں۔

کپڑے کی حیرت انگیز پائیداری

بہر حال مکانوں کے متعلق مسلمانوں کا اس زمانہ میں جو عام مذاق تھا، یعنی اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ بنانے والے پر خلود کے مغالطہ میں مبتلا ہو جانے کا الزام قائم نہ ہو اور یہ کہ ویرانی کے بعد ان کے کھنڈروں کی شکل ڈراؤنی نہ بن جائے۔ ٹھیک اسی کے مقابلہ میں لباس کے متعلق ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاں تک پائیداری اس میں پیدا ہو سکتی تھی، اس کے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ابن حوقل وغیرہ نے اس زمانہ میں کپڑوں کے جو حالات بیان کئے ہیں، اگر ان پر اعتبار کیا جائے تو اس کے گویا یہ معنی ہوں گے کہ اپنی پوری زندگی میں تین چار دفعہ سے زیادہ لباس کی تیاری کی جھنجھٹوں میں مبتلا ہونے کی ان لوگوں کو شاید ضرورت نہ ہوتی ہوگی۔ آپ خود خیال کیجئے، اسی ابن حوقل کا بیان ہے کہ کسی ایک جگہ نہیں، بلکہ اس زمانے میں مختلف ممالک مثلاً یمن، عدن اور ایران کے مختلف شہروں میں ایسے کپڑے بنے جاتے تھے کہ ان کی بقا کی مدت:

"اقله من خمس سنين الى عشرين سنة"

ترجمہ: پانچ برس سے بیس برس تک ہوتی تھی۔ [صفحہ ۲۲۳]

بیس سال تک جو کپڑے باوجود کثرت استعمال کے نہ پھٹتے ہوں تو خود سوچئے کہ اس کا مطلب کیا ہوا۔ آدمی کی اوسط عمر ساٹھ سال اگر فرض کی جائے تو تین دفعہ سے زیادہ کیا لباس بنانے کی اس کو ضرورت ہوگی؟ اور کم از کم پانچ سال جن کپڑوں کی زندگی کی مدت اس نے بتائی ہے، شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ ان مقامات کے یہ کپڑے جو گھٹیا قسم کے ہوتے ہوں گے، ان کی پائیداری کی مدت پانچ سال ہوتی ہوگی۔

ان ہی کپڑوں کے سلسلہ میں ابن حوقل نے خراسان کے شہروں اور وہاں کے مختلف مصنوعات کا ذکر کرتے ہوئے سمرقند کے قریب ایک جگہ ویذار نامی تھی، اس کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس کی خصوصیت ہی یہ بیان کی ہے کہ مشہور سوتی کپڑا جو عموماً بازاروں میں ''ویذاری'' کے نام سے مشہور ہے وہ یہیں تیار ہوتا ہے۔ اس موقعہ پر جب میں پہنچا تو ہدایہ کا خیال آ گیا۔ مختلف مقامات میں اس کتاب کے اندر بعض مسائل کے تذکرے کے سلسلہ میں ''ثوب ویذاری'' کا صاحب ہدایہ نے ذکر کیا ہے۔ شروح وحواشی والے تو صرف اتنا لکھ کر گذر جاتے ہیں کہ ''ایک مقام ہے جس کی طرف یہ کپڑا منسوب ہے، لیکن ابن حوقل سے اس کی تفصیل معلوم ہوئی۔ اس نے لکھا ہے کہ:

> ''دراصل یہ ایک قسم کا ''قطنی'' (کوٹن) کپڑا ہے۔ سمرقند سے چھ میل پر ایک شہر ویذار نامی آباد ہے، اسی میں یہ بنایا جاتا ہے۔ اس کپڑے کی خوبی یہ ہے کہ بغیر دھوئے یوں ہی کارخانے سے نکلنے کے بعد بھی اس کو لوگ پہنتے ہیں۔''

جس سے معلوم ہوا کہ اس زمانے میں سوتی کپڑوں کو استعمال سے پہلے عموماً ان کو دھلوانا شاید ضروری تھا۔ بہر حال، اس کے بعد اس کپڑے کی خصوصیتوں کو بیان کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ:

> ''رنگ اس کا ہلکا مائل بہ زردی ہوتا ہے اور اس میں خاص قسم کی نرمی ہے۔ چھونے میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کپڑا ذرا موٹا اور دبیز ہے۔''

اسلامی عہد کے کپڑوں کی ایک یادگار جسے حکومت آصفیہ نے حال میں کچھ دن سے نئی زندگی عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسے ہمرو کہتے ہیں اور آج کل اورنگ آباد (دکن) میں کچھ دنوں سے حکومت کی حوصلہ افزائیوں کی وجہ سے پھر تیار ہونے لگے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ کچھ اس قسم کی بناوٹ اس کی ہوتی ہے کہ پھٹنے کا اس کے کوئی احتمال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں نے تو لوگوں کو دکھا ہے کہ بالآخر تنگ آ کر ہمرو کی شیروانیاں کسی کو وہ دے دیتے ہیں۔ کیونکہ آپ خواہ کچھ کیجئے

بکسی طرح استعمال کیجئے، وہ نہ گھسنے کا نام لیتے ہیں اور نہ مسکنے کا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اسی قسم کی چیز ان علاقوں میں بنتی تھی۔

اور آخر میں سب سے بڑی خصوصیت اس کی بھی یہی بیان کی ہے اور خود اپنا ذاتی تجربہ لکھا ہے کہ:

''میں نے خود ایک سے زائد کپڑے اس کے پانچ پانچ سال تک استعمال کئے ہیں''۔

خدا جانے پانچ سال کے بعد بھی وہ پھٹتے تھے یا تنگ آ کر جیسے اس قسم کے کپڑوں کو آخر کسی کو لوگ دے دیا کرتے ہیں، ابن حوقل بھی کسی کو دے دیا کرتا ہوگا''۔

خیر یہ سب تو اپنی جگہ ہے، مجھے اس سلسلہ میں جس چیز کا پیش کرنا مقصود ہے، وہ ابن حوقل کا یہ فقرہ ہے:

"ولیس بخراسان امیر أووزیر اوقاض اوخاصی اوعامی او جندی، الا یلبس الثیاب الو یذاریة" [ابن حوقل، صفحہ ۴۰۳]

ترجمہ: خراسان میں نہ کوئی ایسا امیر ہے، نہ وزیر ہے، نہ قاضی ہے، نہ دفتری کارندہ، نہ عامی، نہ فوجی آدمی جوان ویذاری کپڑوں کو استعمال نہ کرتا ہو۔

کپڑے یا جن چیزوں سے کپڑے بنتے تھے، ان کے متعلق بعض جزئی باتوں کا ابن حوقل نے کہیں کہیں اور بھی تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً شیبر فارس کے ایک قصبہ کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ لکھتے ہوئے کہ یہاں منبر بھی ہے، وہ کہتا ہے کہ:

''اسی قصبہ میں کتان سے ایک خاص قسم کا کپڑا بنایا جاتا ہے، جس کے متعلق بالاتفاق لوگ کہتے ہیں کہ عطر اور خوشبو کا اثر اپنی نرمی اور خوبی سے جس قدر جلد اور دیر تک قبول کئے رہتا ہے۔ یہ بات کسی اور کپڑے میں نہیں پائی جاتی''۔

[ابن حوقل، صفحہ ۱۷۵]

اسی طرح مختلف مقامات کے ذکر میں جہاں دوسرے مصنوعات کا تذکرہ کیا ہے،

وہیں کپڑوں کی خاص خاص قسم جہاں جہاں بنتی تھی ان کو بھی بتاتا چلا گیا ہے۔ مثلاً تستر کے ذکر میں لکھتا ہے:

''یہیں وہ مشہور دیباج (ریشمین کپڑا) بنتا ہے جو ساری دنیا میں برآمد ہوتا ہے اور بیت اللہ کے لئے ایک پردہ یہیں سے بن کر جاتا تھا۔'' [صفحہ ۱۷۴]

یا مرو کے ذکر میں لکھتا ہے کہ:

''یہاں سے ابریشم اور ابریشم کے کووے برآمد کئے جاتے ہیں اور یہیں سے مرو کی وہ خاص روئی بھی برآمد ہوتی ہے، جس کے بنے ہوئے کپڑے مرو کی طرح سارے جہان میں مشہور ہیں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ہے بھی یہ روئی حد سے زیادہ نرم۔ مرو میں اس روئی سے کپڑے بھی بنے جاتے ہیں اور دنیا کے مختلف حصوں میں روانہ ہوتے ہیں۔ [ابن حوقل، صفحہ ۳۱۶]

کابل اور بصنیٰ کی پارچہ بافی

کابل کے ذکر میں یہی ابن حوقل لکھتا ہے کہ:

''یرتفع من کابل ثیاب حسنة من قطن یعمل منها سنبیات وتدخل الی الصین وتخرج الی خراسان وتبعث بالسند واعمالها''

ترجمہ: کابل سے بہترین سوتی کپڑے باہر بھیجے جاتے ہیں۔ سنبیات (ان ہی کابلی کپڑوں سے) بنتے ہیں۔ چین بھی جاتے ہیں اور خراسان کی طرف بھی روانہ ہوتے ہیں۔ سندھ اور اس کے ملحقہ علاقوں میں بھی بھیجے جاتے ہیں۔ [ابن حوقل، صفحہ ۳۲۸]

اگر ابن حوقل اونی کپڑوں کا ذکر کرتا تو شاید مجھے تعجب نہ ہوتا۔ گرچہ اس وقت تو یہ بھی اچنبھے ہی کی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ آنکھیں یہ دیکھنے کے لئے تو ترس ہی گئی ہیں، جیسا کہ ابن حوقل ہی نے خوزستان یعنی آہواز، تستر، جند سابور وغیرہ ایرانی شہروں کا جو علاقہ ہے، اسی میں بصنیٰ نامی بھی ایک آبادی تھی۔ وہ بھی پارچہ بافی میں مشہور مقام تھا۔ اسی کے متعلق لکھا ہے کہ:

"وبصنی تعمل السنورا المشھورة فی جمیع الارض المکتوب علیھا عمل بصنی" [صفحہ ۱۷۵]

[ابن حوقل، صفحہ ۳۲۸]: بصنی میں وہی پردے بنتے ہیں جو روئے زمین میں مشہور ہیں۔ ان پردوں پر لکھا ہوا ہوتا ہے۔ "عمل بصنی"

کاش! پھر آنکھیں ''میڈ ان مانچسٹر'' اور ''میڈ ان لنکاشائر'' کی جگہ ''عمل کابل'' کپڑوں پر خواہ وہ اونی ہی ہوتے لکھا دیکھیں۔ لیکن اونی تو اونی یہ مسلمان سیاح اپنی چشم دید گواہی یہ ادا کرتا ہے کہ کابل میں روئی کے کپڑے اتنی کثیر مقدار میں تیار ہوتے تھے جو وہاں کی مقامی ضروریات سے بچنے کے بعد ایک طرف مشرق بعید میں چین تک جاتے تھے اور خراسان و ہندوستان کی ضرورت بھی ان سے پوری ہوتی تھی۔ کیا اب وہی کابل ہے؟ یقیناً اس کی زمین بھی وہی ہے اور ان کا آسمان بھی وہی ہے اور کیا تعجب ہے کہ اسی سرزمین میں آسمان پھر اس تماشے کے دہرانے کا موقعہ عطا کرے۔

لیکن سوچ پوچھیے تو یہ ''مصنوعات'' کے عنوان کے تحت درج ہونے کی چیزیں ہیں اور ان کے لئے الگ مضمون، بلکہ شاید کتاب کی ضرورت ہے۔ انہی جغرافیائی مورخین کی کتابوں میں اس کا بہت مواد ہے۔ طبیعت اگر کبھی موزوں ہوئی تو ممکن ہے کہ اس کام کو میں کبھی کر دوں۔ ورنہ امید ہے کہ کوئی اور صاحب تھوڑی سی محنت برداشت کر کے اس کام کو پورا کر دیں گے۔ اس وقت تو صرف لباس اور کھانے پینے کا ذکر ہو رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا تمدنی اشتراک مسئلہ لباس میں پایا جاتا تھا۔ یہی کیفیت ان کے اکل وشرب کی بھی ہے۔ جس کی ایک وجہ تو وہی تھی کہ اسلام نے جن چیزوں کے کھانے پینے کو حرام کر دیا تھا، عام اسلامی ممالک میں وہ حرام سمجھی جاتی تھیں۔

مسلمانوں میں شراب سے بے رغبتی

ہاں بعض بدبخت سلاطین اور امراء نے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اور تو کسی چیز میں نہیں،

لیکن ''شراب نوشی'' میں افسوس ہے کہ اپنے آپ کو اسلامی حدود پر قائم نہ رکھا اور ان ہی باتوں کو بتنگڑ بنا کر مورخین، خصوصاً مغربی مورخین نے مزے لے لے کر پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان تمام کتابوں میں جن کا میں ذکر کرتا چلا آرہا ہوں۔ ان کے مصنفین نے ہر طرح کی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ کسی جگہ کے مسلمانوں کی شراب خوری کا بھی انہوں نے تذکرہ کیا ہو۔ بلکہ ابن حوقل کا ایک لطیفہ اس موقعہ پر قابل ذکر ہے۔ ہندوستان ہی کے ساحلی شہروں کا تذکرہ کرتے ہوئے یعنی ماہل، سندان، صیمور، کھمبات، جہاں ظاہر ہے کہ اس وقت تک اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ صرف تھوڑے سے مسلمان آباد ہو گئے تھے۔ ان ہی کے ذکر میں یہ لکھتے ہوئے کہ:

''ان شہروں میں جامع مسجدیں پائی جاتی ہیں اور مسلمان اسلامی احکام کی پابندی اعلانیہ کرتے ہیں۔''

آگے یہ بیان کیا ہے کہ:

''ان شہروں میں ناریل کے درخت بھی ہیں۔ اسی ناریل سے سرکہ اور شراب بناتے ہیں، جس سے نشہ بھی پیدا ہوتا ہے اور المزر بھی یہ لوگ استعمال کرتے ہیں جو مصر والوں کا نبیذ ہے۔''

لیکن معاً اس قصے کے بعد ہی وہ لکھتا ہے کہ:

''لا واللہ ما اعرفه ولا رأیته ولا ادری ای شئی هو ولا کیف کیفیته''

[ابن حوقل، صفحہ ۲۳۱]

[ابن حوقل، صفحہ ۳۲۸]: خدا کی قسم میں اس کو نہیں جانتا اور نہ اس کو دیکھا ہے اور نہ اس سے واقف ہوں کہ وہ ہے کیا چیز اور اس کا مزہ کیسا ہے؟

یہ فقرہ اس کے قلم سے بے ساختہ نکل گیا ہے۔ میں نے جب اس کو پڑھا تو خیال آیا کہ مسلمانوں کے شہروں اور آبادیوں میں شراب نوشی اگر واقعی اسی قدر عام ہو چکی تھی جیسا کہ موجودہ زمانے کے مورخین لکھتے ہیں۔ خصوصاً اسلامی تمدن کے علم کے مدعی اعظم جرجی زیدان نے

اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ:

''لیکن مسلمانوں کا عام گروہ سو وہ تو مسکرات اور نشہ آور چیزوں میں ڈوبا ہوا تھا اور ان کی مختلف قسموں کو وہ استعمال کرتا تھا۔ یہی حال ان کا ہر زمانے میں تھا۔ یعنی ان دنوں میں بھی جب ان کے حکام مسکرات سے پرہیز کرتے تھے۔ پھر خیال کرنا چاہئے کہ ان کے حکام ہی جب پینے لگے تو اب عوام کو کون روک سکتا تھا۔'' [التمدن الاسلامی، صفحہ ۱۲۴ ج ۵]

یہاں کیا؟ ہر جگہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان لوگوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر یہی غلطی کی ہے۔ وہ مسلمان سلاطین اور امراء پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام امت کو قیاس کر لیتے ہیں۔ لیکن میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اس وقت بھی یہی کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی صحیح ذہنیت کا ان لوگوں کو اندازہ نہیں ہے۔

اب آپ دیکھئے کہ ابن حوقل جیسا آدمی جس کی زندگی کا اکثر حصہ سیر و سیاحت ہی میں بسر ہوا ہے، وہ شہروں، قصبوں، دیہاتوں، الغرض ہر قسم کی آبادیوں میں گھومتا رہا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ عام مسلمانوں میں شراب نوشی کا رواج اگر اسی طریقہ سے ہوتا جیسا کہ اسلامی تمدن کے اس مدعی علم نے دعویٰ کیا ہے تو اس کی نظر سے شراب کبھی نہ گذرتی اور اس کے حالات سے وہ اتنا ناواقف ہوتا؟ جیسا کہ اس نے بیان کیا ہے اور بالفرض مان لیا جائے کہ اس کا یہ بیان غلط سہی، حالانکہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس شدت کے ساتھ شراب کے متعلق اپنی ناواقفیت کا اظہار یقیناً اس کا ایک بین ثبوت ہے کہ عام مسلمانوں کو اس سے سخت نفرت تھی اور ان ہی کے جذبات کی رعایت سے وہ بے ساختہ ان الفاظ کے لکھنے پر مجبور ہوا ہے۔

عام مسلمانوں میں شراب نوشی کا عمومی رواج کسی اسلامی ملک میں کبھی نہیں رہا ہے۔ یوں چھپ چھپا کر پینے والے پیتے ہیں۔ لیکن کھلے بندوں دوسری جائز چیزوں کی طرح مسلمانوں نے شراب اور نشہ آور چیزوں کو کبھی استعمال نہیں کیا ہے۔ ہاں! نبیذ کا رواج بعض ممالک میں رہا

ہے۔لیکن اس کو الخمر کہنا غلط ہے اور یہ ایک شرعی مسئلہ ہے، جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ نبیذ کو شراب قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے سرکہ کو کوئی شراب ٹھہرائے۔ کیونکہ سرکہ ہو یا شراب یا نبیذ، ایک ہی چیز کے مختلف مدارج کی تعبیر ہے۔ صفات کے بدلنے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔

بہر حال دروغ بیانی کی تہمت خواہ مخواہ ایک شخص پر جوڑنے کی ضرورت نہیں۔ خصوصاً ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ابن حوقل نماز روزے کا بھی پابند تھا۔ وہ بلغار جو روس کے قریب دریائے اتل پر تاتاری مسلمانوں کا قدیم پرانا شہر ہے، ابن بطوطہ نے تفصیل کے ساتھ جس کا حال اپنے سفرنامے میں بیان کیا ہے، اسی شہر کے متعلق اوقات نماز کا جو مسئلہ ہے، اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن حوقل نے بھی لکھا ہے کہ:

> ''گرمیوں میں ان لوگوں کے یہاں رات اتنی ہی مختصر ہوتی ہے کہ ۶ میل بھی آدمی آسانی سے چل نہیں سکتا کہ صبح ہو جاتی ہے اور میں نے اس کا خود مشاہدہ کیا ہے، جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ میں سردیوں کے موسم میں ان لوگوں کے پاس پہنچا تھا، دن ان لوگوں کا اتنا ہی مختصر اس زمانے میں تھا کہ دن کی چاروں نمازیں (فجر، ظہر، عصر، مغرب) اس طرح ہوتی تھیں کہ مسلسل ایک نماز کے بعد دوسری نماز ہم اس طرح پڑھتے جاتے تھے کہ درمیان میں صرف اذان اور اقامت کا وقفہ ہوتا تھا۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۳۸۵]

گویا اس کے معنی یہی ہوئے کہ چاروں نمازیں ایک ساتھ ان لوگوں کو پڑھنی پڑتی ہوں گی۔ اور اس کے بعد رات ہو جاتی ہوگی۔ اس وقت عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہو جاتے ہوں گے۔ زندگی کا نظام ان لوگوں کا بھی کوئی ہوگا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ آخر اتنی لمبی چوڑی رات کیسے گذارتے ہوں گے۔ بہ ظاہر کاروبار زیادہ تر راتوں ہی کو انجام دیتے ہوں گے۔

بہر حال میرے نزدیک یہ قطعاً غلط خیال ہے کہ سلاطین اور امراء کی شراب نوشی پر قیاس کر کے یہ حکم لگا دیا جائے کہ عموماً مسلمان بھی منکرات میں ڈوبے ہوئے تھے۔

سسلی کے مسلمانوں کی عادات قبیحہ

ہم دیکھتے ہیں، اسی ابن حوقل کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس قسم کے جزئیات تک کو تو بیان کرتا ہے، مثلاً سسلی کے مسلمانوں کا حال بیان کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے:

''یہاں کے باشندے کثرت سے پیاز کھاتے ہیں۔ ان لوگوں کے حواس کی خرابی کا سبب بھی پیاز خوری ہے۔ بالکل کچی پیاز یہ چباتے رہتے ہیں۔ ان میں ایسا کوئی نہیں ہے جو کچی پیاز روز نہ کھاتا ہو، بلکہ ہر گھر میں صبح وشام یہ پیاز کھاتے رہتے ہیں، اوپر سے نیچے تک باشندوں کے ہر طبقہ میں اس کا عام رواج ہے۔ دراصل اسی چیز نے ان کے تخیل کو بگاڑ دیا ہے۔ اسی نے ان کے دماغوں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ حواس ان کے ٹھکانے نہیں رہے۔ عقلیں ان کی الٹ پلٹ گئی ہیں۔ سمجھ بگڑ گئی ہے۔ چہرے کی رونق بھی اسی کے استعمال نے اڑا دی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ واقعات کی صحیح صورت ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۸۷]

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس نے پیاز کے متعلق اتنی باتیں لکھی ہیں، جن لوگوں میں شراب نوشی کی عام عادت وہ پاتا، کیا اس کا ذکر ترک کر دیتا۔ میرے خیال میں ان لوگوں کا ذکر نہ کرنا یقیناً اس کی دلیل ہے کہ عام مسلمانوں میں شراب نوشی کا عمومی رواج کسی اسلامی ملک میں کبھی نہیں رہا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اچھی بات ہو یا بری، مسلمان مورخین چونکہ محض واقعات کا اظہار اپنا فرض سمجھتے تھے، کسی خاص مضامین کو پیش نظر رکھ کر کتابیں نہیں لکھا کرتے تھے۔ جیسا کہ اس زمانے کا دستور ہے۔ اس لئے وہ کسی چیز کو نہ چھپاتے ہیں اور نہ واقعات کو بڑھ کر نمک مرچ لگا کر بیان کرنے کے وہ عادی ہیں۔ آپ دیکھئے یہی ابن حوقل ہے، مغربی افریقہ کے شہر سوس کے مسلمانوں میں اس نے جو باتیں دیکھی تھیں بے کم وکاست بیان کر دیں۔

سسلی کے دو فرقے اور ان کے درمیان اختلافات

وہ لکھتا ہے کہ:

''اس شہر کے باشندے دو فرقوں میں منقسم ہیں ایک موسویہ کے نام سے مشہور ہیں اور موسیٰ بن جعفر کے معتقد ہیں۔ ان کے مزاج میں سختی اور طبیعت میں گنوار پن پایا جاتا ہے اور دوسرا فرقہ سنیوں کا ہے، جو امام مالکؒ کے پیرو ہیں۔''

اس کے بعد جو واقعہ ہے ان الفاظ میں اس کا اظہار کرتا ہے۔

''ان دونوں فرقوں میں رات دن لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اور دوامی خونریزی ان میں جاری رہتی ہے، ان کی ایک ہی مسجد ہے جس میں دونوں فرقے کے افراد اپنی اپنی نمازیں جدا جدا ادا کرتے ہیں جب ایک فرقہ والے نماز ادا کر لیتے ہیں، تب دوسرے فرقے والے آتے ہیں۔ اذان دیتے ہیں اور اقامت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ گویا ان کی مسجد میں دس اذانیں، اور دس اقامتیں ہوتی ہیں۔ ان میں جو مالکی ہیں وہ موسویوں سے (جو شیعہ ہیں) طبیعت کی سختی میں اور اخلاق کی خرابی میں اسی قدر بڑھے ہوئے ہیں، جتنی ان کو فراغبالی حاصل ہے۔ جہل اور غصہ میں حد سے گذر جاتے ہیں۔'' [صفحہ ۲۶]

اسی سے مسلمان مورخین کی سادگی اور صداقت کا اندازہ ہوتا ہے اور جیسے اس نے سوس کے مسلمانوں کا یہ حال بیان کیا ہے۔ اگرچہ اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کے مذہبی جھگڑوں کی نوعیت مسلمانوں میں بعض خاص خاص مقدمات ہی تک محدود تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا ہے کہ سوس کے سوا ابن حوقل یا اسی سلسلہ کے دوسرے مورخین نے اسلامی فرقوں کے باہمی اختلافات کے نتائج کے متعلق اس قسم کی باتیں کہیں اور بیان کی ہیں۔ یعنی خونریزی تک نوبت پہنچ جاتی ہو۔ میری نظر سے اس کی نظیر کسی دوسرے اسلامی ملک کے متعلق نہیں گذری ہے۔ ہاں! سسلی

ہی کے منحوس مسلمانوں کی پیاز خوری کی بدعادت کے سلسلے میں اسی ابن حوقل نے ایک بات یہ ضرور لکھی ہے۔ یعنی پہلے تو یہ بیان کیا ہے کہ سسلی کے مسلمانوں کی کثرت آبادی کا اندازہ ان کی اس مسجد سے ہوتا ہے:

''جس کا میں نے اندازہ کیا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ بھر جانے کی صورت میں سات ہزار اور کچھ زائد نمازیوں کی گنجائش اس مسجد میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسجد میں، میں نے دیکھا کہ نماز کے لئے ۳۶ صفوں سے زیادہ صفیں قائم ہوتی ہیں اور ہر صف میں ۲۰۰ آدمیوں سے زیادہ گنجائش نہیں ہے۔''

لیکن اسی کے ساتھ اس نے بیان کیا ہے کہ:

''اس شہر میں اسی مسجدیں ہیں، جن میں کچھ تو اپنی اصل حالت میں قائم ہیں اور کچھ شہید ہو گئی ہیں۔ ان سے شہر بھرا پڑا ہے۔ فصیل کے اندر اور فصیل سے باہر، عام محلوں میں ہر جگہ مسجد ہی مسجد ہے۔''

آخر میں مساجد کی کثرت کی وجہ یہ بیان کرتا ہے، وہیں کے ایک عالم، جن کا ابو محمد القفصی الفقیہ الوثقی نام تھا اور غالباً ابن حوقل کے میزبان تھے، ان ہی سے مسجدوں کی کثرت کی وجہ اس نے پوچھی کہ اتنے قریب قریب میں لوگوں نے یہاں کیوں بلاضرورت مسجدیں تعمیر کی ہیں تو اس سے کہا گیا کہ:

''یہاں کے باشندوں کے دماغ میں نخوت کی ہوا بھری ہوئی ہے۔ اسی لئے ان میں ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ اس کی مسجد الگ ہو۔ کسی دوسرے کی شرکت اس میں نہ ہو۔ بس خود اور اس کے گھر کے لوگ اور خدام و حاشیہ نشینوں کے سوا اس میں کوئی دوسرا نہ رہے۔''

پھر اپنی چشم دید شہادت بیان کرتا ہے:

''بسااوقات دو حقیقی بھائی جن کے مکانوں کی دیواریں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، لیکن ہر بھائی کی مسجد الگ ہے۔ ہر ایک نے اپنے لئے الگ مسجد تعمیر کرائی ہے۔'' [صفحہ ۸۴]

پھر ان ہی فقیہ صاحب کے متعلق (جن کا ابن حوقل مہمان تھا) بیان کرتا ہے کہ:

''ایک تیر کے پرتاب کے فاصلہ میں دس مسجدیں مجھے نظر آئیں، ان ہی مسجدوں میں ایک مسجد تو وہ ہے جس میں ابو محمد القفصی نماز پڑھتے ہیں اور بیس قدم کے فاصلہ پر اس مسجد سے ایک اور مسجد ان ہی فقیہ صاحب کے صاحبزادے کی ہے۔ یہ مسجد صاحبزادے صاحب کے لئے تعمیر کرائی گئی ہے تاکہ اس میں وہ تعلیم حاصل کرے۔ لیکن دراصل غرض ان میں سے ہر ایک کی طرف یہ ہے کہ فلاں کی مسجد کے نام سے یہ مسجد مشہور ہو۔ اس کے سوا اور کوئی دوسری نیت نہیں ہوتی۔'' [صفحہ ۸۴]

خراسانی مسلمانوں کا دینی جذبہ

میں نے غالباً پہلے بھی ابن حوقل کے حوالہ سے لکھا ہے، یعنی ایک طرف تو وہ اس زمانہ کے خراسانی مسلمانوں کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ:

''جہاد کرنے میں ان خراسانی مسلمانوں سے اپنی طاقت وقوت، جوش کے لحاظ سے اسلامی ممالک میں کوئی ملک ان کے جوڑ کا نہیں ہے۔''

کبھی لکھتا ہے کہ:

''ان میں جن لوگوں کا حکومت سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ ان کا بھی حال یہ ہے کہ باوجود اتنی بعد مسافت کے حج کا انتہائی ذوق ان لوگوں پر غالب ہے۔ صحراء کے (جو خراسان اور عرب کے درمیان واقع ہے) قطع کرنے میں ان سے زیادہ جری کوئی نہیں ہے۔''

مسلمانوں کے زوال کے آثار

بہر حال ان کی شجاعت، بہادری، مہمان نوازی، دینداری کی تعریف کرتے ہوئے ان ہی کے مقابلہ میں وہ اندلس میں چوتھی صدی کے مسلمانوں کا حال ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ یعنی ان کی رفاہیت و دولت و ثروت سب کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے کہ:

''اس جزیرے کا یہ عجیب حال معلوم ہوتا ہے، تعجب ہوتا ہے کہ ان کا قبضہ اس ملک پر باقی کیسے ہے؟ یعنی عقلیں ان کی اتنی کوتاہ ہیں اور قوت، دلیری، بہادری، شہسواری، بے جگری، اس قسم کے تمام صفات، جن کی ضرورت میدان جنگ میں لڑنے والوں سے مقابلہ کرتے وقت پڑتی ہے، ان سے انہیں دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔''

پھر انہیں اندلسی مسلمانوں کی پیشانی کی لکیروں کو پڑھ کر جو باتیں اس کے خیال میں آئیں، ان کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''مغرب میں اگرچہ دولت و امارت کے لحاظ سے ان قرطبہ والوں کے برابر کسی دوسری جگہ کے لوگ نظر نہیں آتے، ان کے لباس بہترین ہیں، زیوروں کی ان کے یہاں کثرت ہے۔ اگرچہ دیکھنے میں وہ کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے، مگر باوجود اس کے اس شہر کی فوج میں مجھے کچھ ایسی بات نظر نہیں آئی جو آنکھوں کو بھی معلوم ہو۔ نہ ان بے چاروں کی شہسواری آتی ہے، نہ اس کے قواعد و قوانین سے یہ واقف ہیں۔ نہ بہادری کا کوئی جذبہ ان میں پایا جاتا ہے۔''

پھر چند سطروں کے بعد لکھتا ہے:

''ان کے لباس بڑے پاکیزہ صاف ستھرے ہیں۔ زندگی بڑے عیش و تنعم کی ہے اور عوام تک کو حاصل ہے۔ قریب قریب ہر ایک ان میں خدام سے کام لینے کا عادی ہے۔ بہت کم ان میں ایسے ہیں جو ایک گھر سے دوسرے گھر یا

شوہر اپنے گھر سے بیوی کے گھر بغیر سواری کے جاتا ہو، اور سواری بھی بڑی شان وشوکت کی ہونی چاہیے۔ یہ لوگ محنت اور پیدل چلنے کے بالکل عادی نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مزدور اور نچلے طبقے کے لوگ پیدل چلتے ہوں تو چلتے ہوں، لیکن سواری میں ان کی زیادہ تر خچر استعمال ہوتے ہیں خچروں کے متعلق یہاں کے باشندوں میں مقابلہ جاری ہے اور جس کے پاس جتنے زیادہ خچر ہوں، اس پر اسے ناز ہوتا ہے۔''

پھر ان خچروں کے متعلق کچھ دوسری باتیں کہ کہاں سے لائے جاتے ہیں اور کہاں کہاں یہ پیدا ہوتے ہیں۔ آخر میں لکھتا ہے:

''میں نے خچروں کو اس شہر میں دیکھا کہ ان کی قیمت پانچ پانچ سو دینار تک پہنچ جاتی ہے۔ باقی سو، دو سو اشرفیوں کی قیمت والے تو ان کی نہ حد ہے نہ شمار، مگر یہ لوگ خچروں میں یہ نہیں دیکھتے کہ چلنے میں تیز ہے یا نہیں۔ یا چال اس کی کیسی ہے، بلکہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جسم ان کے بھاری بھرکم ہیں اور نقش ونگار ان کے کیسے ہیں۔ دیکھنے میں خوبصورت معلوم ہوتے ہیں یا نہیں۔ پیٹھ ان کی اونچی ہے یا پست، ہڈے پنجے مضبوط ہیں یا نہیں۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۷۹]

مسلمان مورخین کی انصاف پسندی

اگرچہ کچھ غیر ضروری امور کا ذکر یہاں آ گیا۔ لیکن مجھے دو باتیں ثابت کرنی تھیں، ایک تو مسلمان مورخوں کے طریقہ بیان کی خصوصیت کا اظہار مقصود تھا۔ یعنی محض اس لئے کہ اپنی قوم کا حال چونکہ ہم بیان کر رہے ہیں، اس لئے وہ ایسا نہیں کرتے کہ صرف ان کے اچھے پہلو کو نمایاں کر کے کمزور پہلوؤں پر ان کے پردہ ڈال دیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جس علاقے کے مسلمانوں میں جو باتیں ان کی نظر آتی ہیں، بلا رو رعایت وہ ان کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور دوسری بات جس سے ان کی بصیرت اور روشن ضمیری کا ثبوت ملتا ہے۔

مسلمانوں کی تباہی کے اسباب

سسلی اور اندلس کے مسلمانوں میں تباہی کے آثار کا احساس ہے جو ان کو اسی زمانہ میں ہو چکا تھا۔ جس کا تماشہ چند ہی دنوں بعد دیکھا گیا اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان جس علاقے میں بھی تباہ ہوئے ہیں۔ اپنے ہی ہاتھوں تباہ ہوئے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری کا زمانہ، اندلس اور سسلی کے مسلمانوں کا وہ زمانہ تھا کہ عروج کے بعد زوال کی طرف وہ تیزی کے ساتھ جا رہے تھے۔ بظاہر ابھی ان کی شان وشوکت میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اسلامی مورخ کی نگاہوں کے سامنے ان کا انجام جھانک رہا تھا۔ بخلاف خراسان کے مسلمانوں کے کہ ان کے اقبال کا آغاز تھا۔ نتائج نے دونوں کے متعلق ان مورخین کی رائے کی تصدیق کی۔ بعد کو خراسانی مسلمانوں کو بھی وہی عوارض لاحق ہوئے جن میں مغرب کے مسلمان مبتلا ہو چکے تھے۔ پھر ان کا انجام بھی ان کے سامنے آ گیا:

﴿وما ظلمناھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون﴾

ایک موقعہ پر ابن حوقل قدرت کے اس اٹل قانون یعنی:

﴿فاکثروا فیھا الفساد فصب علیھم ربک سوط عذاب﴾

ترجمہ: پھر بگاڑ کو انہوں نے بڑھا دیا (یعنی غالب کر دیا) پس برسائے تیرے رب نے ان پر عذاب کے کوڑے۔

خود بھی اعادہ کیا ہے اور اپنی چشم دید شہادت اس نے پیش کی ہے۔ جب اس بحث کی طرف بھٹکتے ہوئے میں آ ہی گیا ہوں تو اس کا ذکر بھی کیوں نہ کر دوں، واقعہ بڑا عبرتناک ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ابن حوقل جب آذربائیجان پہنچا ہے اور اس علاقے کے سب سے اہم مرکزی شہر اردبیل میں داخل ہوا ہے تو اس وقت وہاں اس کو عجب تماشا نظر آیا۔ لکھتا ہے کہ:

''اس شہر کے اردگرد ایک عجیب وغریب فصیل کی دیوار محیط تھی۔ لیکن ۳۳۱ھ میں اس عجیب وغریب شہر پناہ کو سالار مرزبان بن محمد بن مسافر نے توڑ پھوڑ کر

زمین کے برابر کر دیا۔"

اور خود نہیں توڑا بلکہ عبرت کا مقام ابن حوقل ہی کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ مرزبان بن محمد بن مسافر نے جب اس شہر پر حملہ کیا اور شہر والوں نے تنگ آ کر امان مانگی تو صلح کے شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس شہر کے باشندے اپنے ہاتھوں سے اپنے شہر کی اس فصیل کو توڑ دیں گے۔ جو ان کے کبر و ناز کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اس کا بیان ہے کہ:

"پھر خود اس شہر کے بڑے بڑے تاجر اور خوشحال باشندوں کے ہاتھوں سے یہ دیوار تڑوائی گئی اور اس طور پر منہدم کرائی گئی کہ شہر کے معززین، ارباب جاہ و جلال اپنے ہاتھوں میں پھاوڑے لئے ان ہی کپڑوں میں جو عطر میں بسے ہوئے ہوتے آتے، ان کے ساتھ شہر کے تاجر بھی ہوتے، دیوار کو گراتے اور اپنی قیمتی طیلسانوں اور عباؤں اور جبوں میں بھر بھر کر مٹی اور پتھر پھینکتے، حالانکہ ان میں اس بوجھ کے اٹھانے کی صلاحیت بھی نہ ہوتی۔ اس لباس میں جس میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے۔ اس کام کو انجام دینا پڑا، تا آنکہ پوری دیوار اس طرح غائب ہوگئی کہ گویا اب اس کا یہاں پتہ بھی نہیں ہے۔ اور اس کے بعد ان کے پاس جو کچھ تھا وہ بھی رفتہ رفتہ سالار کے شدید مطالبات کی بنیاد پر ختم ہو گیا۔"

اس دردناک قصے کو بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے:

"یہ سب جو کچھ بھی ہوا، درحقیقت خود اس شہر کے باشندوں کے طرز عمل کا نتیجہ تھا۔ ان میں بدترین قسم کا تمرد اور بری طرح کی سرکشی پھیل گئی تھی۔ دھوکہ اور فریب کو انہوں نے اپنا شعار بنالیا تھا۔ ان لوگوں نے شیطان کے دامن کو تھاما تھا۔ عصیان اور شورش کو انہوں نے اپنا طریقہ کار بنالیا تھا، مسافروں کا مال ان کے یہاں لوٹا جاتا تھا اور ان بے چاروں کا خون گویا مباح تھا۔"

آخر میں اس شہر کے باشندوں کی اخلاقی تباہی کا ایک جزئی قصہ بھی نقل کیا ہے۔ لکھا ہے کہ:

''ایک سے زیادہ آدمیوں نے مجھے یہ قصہ سنایا ہے کہ اس زمانہ کا حال یہ تھا کہ قصاب کی دکان پر لوگ گئے ہیں۔ جو گوشت وہ دے رہا ہے اگر خریدار کے منہ سے اتفاقاً یہ نکل گیا کہ بجائے اس کے دوسرے عضو کا گوشت دو بس قصاب آپے سے باہر ہو جاتا اور بے چارے خریدار کی چادر پھاڑ کر اس کی دھجیوں کو گوشت پر ڈال دیتا یا کبھی خریدار کی آستین نوچ لیتا یا اس کے رومال کو پرزے پرزے کر کے شرارت اور بدمعاشی سے بجائے گوشت کے اسی کو گوشت پر ڈال دیتا۔ یہ تھا ان لوگوں کے طغیان اور سرکشی کا حال۔''

ابن حوقل نے اس کے بعد لکھا ہے کہ:

''پس خدائے حلیم کے حلم نے کچھ دن ان لوگوں کو ڈھیل دی، لیکن کب تک، آخر قدرت کے قانون کی چکی گھومی اور یہ شہر اپنے منہ کے بل گر پڑا ہے۔ یعنی جس حال میں تھا، اس حال کے لحاظ سے گویا کھنڈر ہی بن گیا ہے'' [ابن حوقل، ص ۲۳۸]

اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے حقوق

مگر اسی کے ساتھ جہاں دوسرے قسم کے واقعات نظر آئے ہیں، انہیں بھی بیان کرتا ہے۔ آرمینیہ میں جب پہنچا ہے تو وہاں کے حالات درج کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ اس علاقے میں زیادہ تر عیسائی آباد ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں بنی امیہ و بنی عباس والوں ہی کے زمانے سے کچھ معاہدات ہو گئے ہیں اور ان ہی معاہدات کی بنیاد پر یہ اب تک اپنے وطن پر قابض ہیں۔ البتہ معاہدات کے رو سے جو مطالبات ان کے ذمے عائد کئے گئے ہیں۔ انہیں ادا کرتے ہیں۔ خراج کے طور پر ہر سال حکومت میں مقررہ رقم پیش کرتے ہیں۔ پھر کچھ اور حالات کا تذکرہ کرنے کے بعد اس نے لکھا ہے کہ:

''۳۲۵ھ تک یہ میرا مشاہدہ ہے کہ ان سے جو معاہدہ کیا گیا ہے اور جن جن

باتوں کی ذمہ داری لی گئی ہے، ان کی پوری پوری پابندی کی جاتی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مذکورہ بالا سن تک میں نے دیکھا کہ اس علاقے کے غلاموں کو بغداد میں نہیں خریدا جاتا اور نہ کوئی ان کی خریداری کو جائز سمجھتا ہے۔ جس کی وجہ وہی ہے کہ ان سے عقد ذمہ کا معاہدہ ہے۔ [ابن حوقل صفحہ ۲۴۵]

مسلمانوں پر غلام اور لونڈیاں بنانے کا ایک غلط اعتراض

موجودہ تاریخ کی کتابوں میں ایک ایسا نقشہ مسلمانوں کے تمدن کا کھینچا گیا ہے کہ وہ ساری دنیا کی قوموں کو زبردستی پکڑ پکڑ کر لاتے ہیں اور اپنا غلام اور اپنی لونڈیاں ان کو بناتے ہیں، مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ غلام اور لونڈی بنانے کا رواج مسلمانوں میں ضرور تھا، لیکن اس کے بھی کچھ قوانین تھے، قاعدے تھے، اور مسلمان ان کی پابندی کرتے تھے، جس کی ایک معمولی سی شہادت ابن حوقل کا بھی بیان ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ آج بھی جب یہی دیکھا جا رہا ہے کہ لوگ بڑے بڑے کارخانے جو قائم کرتے ہیں یا کانوں کی کھدائیوں کا کام اور اسی قسم کے دوسرے کاروبار جو کرتے ہیں تو لاکھوں لاکھ انسانوں کو ان کے گھر سے، در سے، ماں سے، باپ سے چھڑا کر ہی تو مزدوروں کی شکل میں کام لیتے ہیں۔ آپ ان علاقوں میں چلے جائیں جہاں اس قسم کے کاروبار کے مراکز قائم ہیں۔ انسانوں کی بھیڑ نظر آئے گی۔ جن کو کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں کے تھے، کس قوم کے تھے، پیٹ بھرنے لگا۔ زندگی کی ضرورتیں پوری ہونے لگیں۔ بس وہیں رہ پڑے۔ بھول کر بھی ان کو نہ اپنا وطن یاد آتا ہے نہ اقربا و اعزہ کا خیال آتا ہے۔ اپنے حالات میں مست رہتے ہیں۔ کیا واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی ان غلاموں اور لونڈیوں کا یہی حال تھا؟ بلکہ سچ پوچھیے تو ان مزدوروں سے وہ زیادہ بہتر حال میں عموماً ہوتے تھے۔ کیونکہ جس سے ان کا تعلق ہو جاتا تھا اس گھر کے وہ ایک ممبر بن جاتے تھے۔ ان کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ جیسے گھر کے کسی آدمی سے کیا جاتا ہے۔ ان کی بیماری، آزاری، ہر حال میں ان کا آقا ان کی خبر لیتا تھا۔

ان کی شادی بیاہ، ان کے بچوں کی پرورش، سب کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ غلام بھی اپنے آقاؤں کے بہی خواہ بن جاتے تھے۔ یہی بہی خواہیاں بسا اوقات ان کو بلند سے بلند مقام تک پہنچادیتی تھیں۔ اس زمانے کی تاریخ پڑھیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ غلامی بھی عروج اور ارتقاء کا ایک راستہ بنا ہوا تھا۔ اسی راہ سے معمولی معمولی مناصب ہی نہیں بلکہ وزارت اور کتنے بادشاہی کے مقام تک ترقی کر کے پہنچے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس لحاظ سے ان غلاموں کا حال موجودہ زمانے کے کارخانوں کے مزدوروں سے یقیناً بہتر تھا۔ استثنائی حالات کا میں نہیں کہتا۔ لیکن عمومی طور پر مسلمان اپنے غلاموں کے ساتھ اچھا ہی برتاؤ کرتا تھا۔ اسی طرح ذمی اقوام جو مسلمانوں کی حکومت میں عہد ذمہ کو قبول کر کے آباد تھے، ان کا حال تو بسا اوقات عام مسلمانوں کے مقابلہ میں قابل رشک ہوتا تھا۔ ابن حوقل جب سمرقند کے علاقے میں پہنچا ہے تو خود اس کو بھی دیکھ کر حیرت ہوگئی۔ یعنی یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مسلمانوں کے جلال و جبروت کا پھریرا اس علاقے میں اڑ رہا تھا۔ لیکن ان ہی دنوں میں وہ بیان کرتا ہے کہ "ساوُدار" کا ایک خطہ ہے جو عیسائیوں سے آباد اور معمور ہے۔ اس خطہ میں ان کا ایک بڑا مجمع بسا ہوا ہے۔ ان کے یہاں متعدد کلیسے ہیں جن میں میں نے عراق کے بعض عیسائیوں کو بھی پایا۔ انہوں نے ان کلیساؤں کا انتخاب اس لئے کیا ہے کہ یہاں کی خوشگوار آب و ہوا میں زندگی گذارنے کا موقعہ ملے۔ ان کلیساؤں پر اوقاف ہیں۔ وہ بلند مقامات پر بنے ہوئے ہیں۔ دریائے سغد کی طرف سب کا رخ ہے۔ اس مقام کا نام "یوزکرد" ہے۔ ساوُدار جس کا میں نے ذکر کیا کہ اس میں عیسائی آباد ہیں، اس کے مختلف کشادہ و وسیع حصے ہیں سب میں نہریں جاری ہیں جو مزارع میں بہ بہ کر گرتی ہیں۔ درمیان میں ان میدانوں کے بڑا پرفضا حسین منظر ہے۔ بکثرت ہر طرف ہر قسم کے شکار کے جانور کلیلیں کرتے رہتے ہیں۔ بڑا آباد سرسبز علاقہ ہے۔ زندگی کی تمام مسرتوں سے معمور ہے۔ [ابن حوقل، صفحہ ۳۷۲]

آپ دیکھ رہے ہیں کہ سمرقند تک میں اس زمانہ میں نصرانی کتنے آرام اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔

بہر حال جہاں اردبیل کے مسلمانوں کی بے آئینی کا حال اس نے بیان کیا ہے۔ اسی کے ساتھ آپ دیکھ رہے ہیں، جہاں کے باشندے آئین وقانون کے پابند ہیں ان کا اظہار بھی اس نے کردیا ہے۔

کتاب گو اب ختم ہورہی ہے، لیکن ان مسلمان سیاحوں کی ان کتابوں میں دلچسپ او رمفید معلومات کا بھی ایک ذخیرہ باقی ہے۔ ممکن ہے کہ ''معلومات'' کے کسی دوسرے حصہ میں ان کا ذکر کیا جائے، لیکن اسی حصہ کو ختم کرتے ہوئے چند باتیں اور سن لیجئے۔

ایران اور پارسی قوم

عام طور پر مشہور کردیا گیا ہے کہ ایران پر مسلمانوں کے قبضہ ہونے کے ساتھ ہی پارسی قوم اس ملک میں باقی نہیں رہی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں ان کا ایک بچا کھچا قافلہ ہندوستان آکر پناہ گزین ہوگیا۔ جس سے اس وقت تک اس قوم کا دنیا میں نام ونشان باقی ہے۔ مگر یہ تو سنا جارہا ہے، پر دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ یہ ہے۔ ابن حوقل جو چوتھی صدی ہجری میں ایران آیا ہے۔ لکھتا ہے:

> ''فارس کا کوئی شہر اور کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جس میں آتشکدے نہ ہوں اور مجوسی (پارسی قوم) اس ملک کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۱۸۱]

اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران سے بالکلیہ نیست ونابود ہوجانے کا جو افسانہ مشہور کیا گیا ہے۔ کتنا بے بنیاد افسانہ ہے۔ باقی یہ سوال کہ چوتھی صدی ہجری تک ایران کی یہ سب سے بڑی اکثریت آخر زمانہ میں اکثریت کی شکل میں کیوں باقی نہ رہی۔ یہ الگ سوال ہے۔ جس کے جواب کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ سردست مسلمانوں سے خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں سے صرف اس قدر کہنا ہے کہ جس اکثریت سے وہ ڈر رہے ہیں، کاش! بجائے اس کے ڈر کے خدا کا ڈر اپنے دل میں پیدا کرتے تو ایران کی اس اکثریت کا جو حشر اس ملک میں ہوا۔ میں یقین

دلانا چاہتا ہوں کہ چاہیں تو ہندوستان میں بھی وہ اس تماشے کو دیکھ سکتے ہیں:

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر چاہے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

لیکن اپنے ''اسی سامان'' کا نام مسلمانوں نے عجمی تصوف رکھ چھوڑا ہے اور جو چیز خاص ان کے گھر کی تھی۔ اس کے متعلق مغالطہ میں مبتلا کئے گئے ہیں کہ باہر سے ان کے گھروں میں وہ داخل ہو گئی تھی۔

آتش کدوں کی راکھ سے سیاہی کا کام

خیر اس قصہ کو تو چھوڑیے میں ایران کی اسی مجوسی اکثریت کا ذکر کر رہا تھا۔ دلچسپ بات اسی سلسلہ میں ابن حوقل ہی نے لکھی ہے۔ یعنی مجوسیوں کے ان آتش کدوں سے مسلمانوں نے استفادہ کی عجیب راہ پیدا کی تھی کہ لکھنے پڑھنے کے لئے سیاہی کی جو ضرورت ہوتی تھی، نیز کپڑوں کی رنگوائی میں بھی آتشکدوں میں جمع ہونے والی سیاہیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ یہ لکھنے کے بعد کہ:

''فارس کے علاقے میں دوات کے لئے بھی اور رنگ کے لئے بھی، بہترین روشنائی اور سیاہی ملتی ہے۔ اتنی بہتر کہ چین سے جو سیاہی آتی ہے اس سے تو خیر فارس کی سیاہی بہتر نہیں ہے، لیکن اس کے سوا روئے زمین میں ایسی سیاہی نہیں ملتی۔''

پھر یہ بتاتے ہوئے کہ سیاہی کا یہ ذخیرہ کہاں سے حاصل کیا جاتا ہے، وہی رقمطراز ہے:

''دوات والی روشنائی یا رنگ میں جو سیاہی کام آتی ہے، دراصل یہ اس آگ سے حاصل کی جاتی ہے، جو مجوسیوں کے آتشکدوں میں قدیم زمانے سے جلتی چلی آرہی ہے۔'' [ابن حوقل، صفحہ ۲۱۵]

آخر میں لکھتا ہے:

''ظاہر ہے کہ یہ سیاہی کیا ہے؟ دھوئیں کے سوا اور بھی کچھ ہے؟''

کون کہہ سکتا ہے کہ آتشکدوں کی سیاہیوں سے جو روشنائی تیار ہوتی تھی، اس سے مسلمان کن کن چیزوں کو لکھتے تھے۔ اگر قرآن اور اس کی تفسیریں، حدیث اور اس کے شروح، فقہ اور اس کے فتاویٰ و متون کی کتابوں کی کتابت میں یہی روشنائی استعمال ہوتی تھی تو شرک کے نتائج سے توحید کی اشاعت و تبلیغ کا یہ کام دلیل ہے، اس بات کی کہ مخالف سے مخالف شے کو بھی اسلام کی تائید کا ذریعہ بنا لینے میں ان پرانے مسلمانوں کو کیسی عظیم مہارت حاصل تھی، رحمۃ اللہ علیہم، ارزقنی اللہ اتباعہم۔

فرغانہ کی معدنیات اور پتھر کا کوئلہ

اسی سلسلہ کی ایک چیز اور ہے، ابن حوقل ہی اس کا بھی راوی ہے۔ فرغانہ (ترکستان) کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھنے کے بعد کہ:

''اس علاقے میں سونے چاندی کے متعدد معادن ہیں۔ نیز نقاد اور اخسکیت کے علاقوں سے طلاء اور نقرہ برآمد ہوتا ہے۔ نیز پارہ بھی بکثرت یہاں کے پہاڑوں سے نکالا جاتا ہے۔ زفت (ڈامر) اور جراغسنگ بھی یہاں کی کانوں سے لوگ نکالتے ہیں۔ ان ہی معدنوں سے لوہا بھی اور رانگ بھی نکلتا ہے۔''

الغرض اسی قسم کی معدنی پیداواروں کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتا ہے کہ اسی خطہ میں:

''اسبرہ نامی جو جگہ ہے وہاں ایک پہاڑ ایسے سیاہ پتھروں کا ہے جو جلتے ہیں۔ ٹھیک کوئلہ کی طرح آگ کو قبول کرتے ہیں۔''

ابن حوقل کی اسی عبارت پر فارسی زبان میں ایک نوٹ بھی درج ہے۔ یعنی:

''در اسبرہ کوھہائے چند ہست کہ آں کوھہا مانند فحم سوختہ می شود واز سنگہائے آں کوہ برس ہر خروار بیک درھم مے

فروشند" [ابن حوقل، صفحہ ۳۹۷]

ترجمہ: اسی اسبرہ میں چند پہاڑ ہیں جن کے پتھر کوئلہ کی طرح جل اٹھتے ہیں۔ ان پتھروں کو لوگ اس حساب سے فروخت کرتے ہیں۔ یعنی ایک خروار (بارخر) ایک درم میں۔

پتھر کے کوئلوں کا سب سے پہلے استعمال

یہ چوتھی صدی ہجری کا مشاہدہ ہے، لیکن کہنے والوں کو کیا کہئے۔ جب کہتے پھرتے ہیں کہ پتھر کے کوئلوں کے استعمال سے یورپ ہی نے دنیا کو واقف کیا ہے۔ اس سے پہلے لوگ اس کے استعمال سے ناواقف تھے۔ حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ پتھر کے ان کوئلوں کی خرید و فروخت کا عام رواج فرغانہ میں اس زمانہ میں تھا اور چین میں بھی جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں اور پتھر کے ان کوئلوں کے متعلق ابن حوقل ہی کے فارسی حاشیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

"چوں سوختہ مے شود فحم آں را با آب مختلط و ممتزج می کنند و
جامہا را بدوں سپید کنند و بجائے صابوں بکا برند"۔

ترجمہ: جب پتھر کا یہ کوئلہ جل جاتا ہے تو اس کو پانی میں لوگ گھول دیتے ہیں اور اسی پانی سے کپڑے کو صاف کرتے ہیں۔ صابن کی جگہ اسی کو استعمال کرتے ہیں۔

میں تو نہیں جانتا کہ پتھر کے ان کوئلوں کے اس استعمال کا اب بھی دنیا میں رواج باقی ہے یا نہیں؟

بندرگاہ عمان کی ایک اسٹرائک

اور کن کن باتوں کو سوچئے کہ آج سمجھا جاتا تھا کہ مزدوروں یا تاجروں یا مختلف کاروبار والوں کے ہاتھ میں اسٹرائک کا حربہ نیا حربہ ہے، جو یورپ نے مظلوموں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے دیا ہے۔ لیکن سنئے، بزرگ بن شہریار اپنی عجائب الہند میں راوی ہے۔ قصہ تو طویل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ایک یہودی اسحاق نامی عمان کی بندرگاہ میں دلالی کا کام کیا کرتا تھا۔ اتفاقاً کسی دوسرے یہودی سے اور اس سے جھگڑا ہو گیا۔ عمان سے بھاگ کر اسحاق ہندوستان چلا آیا۔ جس

وقت ہندوستان آیا تھا اس کے پاس کل پونجی دوسو اشرفیاں تھیں، لکھا ہے کہ عمان سے تیس سال تک وہ غائب رہا۔ ۳۰۰ ہجری میں وہ عمان پھر واپس ہوا اور بڑے تزک و احتشام سے واپس ہوا۔ خود اپنا جہاز تھا جس پر تجارتی سامانوں کے ساتھ عمان کی بندرگاہ پر پہنچا۔ خلیفہ مقتدر باللہ عباسی کا زمانہ تھا۔ خلیفہ کی طرف سے عمان کی بندرگاہ کا کمشنر اس زمانے میں احمد بن ہلال تھا۔ لکھا ہے کہ احمد بن ہلال کے ہاتھ اس یہودی نے ایک لاکھ مثقال وزن میں تو صرف مشک ہی فروخت کیا تھا اور بھی ہزار ہا ہزار روپے کی مختلف چیزیں مختلف لوگوں کے ہاتھ اس نے فروخت کیں۔ اس کی دولت کی رفتہ رفتہ شہرت بغداد پہنچی۔ لوگوں نے سازش کا جال اس کے خلاف بچھایا اور مقتدر باللہ کو اس پر آمادہ کیا کہ اس یہودی کے مال کا جائزہ لے۔ مقتدر کا آدمی عمان پہنچا اور احمد بن ہلال کے نام جب مقتدر باللہ کا خط اس یہودی کے بھیج دینے کے لئے موصول ہوا۔ لیکن بس یہی سننے کی بات ہے کہ بلا وجہ ایک تاجر کے متعلق حکومت نے جو بدنیتی کا ارادہ کیا تھا اس سے مقابلہ کرنے کی تدبیر کیا اختیار کی گئی۔ بزرگ بن شہریار نے لکھا ہے کہ:

"غلقت الاسواق وکتبت المحاضر وشهد فيها الغرباء والقاطنين بانه متى حمل" هذا اليهودى انقطعت المراكب عن عمان وهرب التجار وانذر الناس بعضهم بعضاً ان لايطرق احدسا حلاً من سواحل العراق ولا يامن ذو مال على ماله"

ترجمہ: دکانیں بند کردی گئیں اور خلیفہ کے نام معروضے لکھے گئے۔ جن پر باہر والوں کے بھی اور خاص عمان کے باشندوں کے بھی دستخط تھے۔ ان معروضوں میں لکھا گیا تھا کہ اس یہودی تاجر کو اگر بغداد زبردستی لوگ لے جائیں گے تو جہازوں کی آمد و رفت عمان کی بدرگاہ پر قطعاً روک دی جائے گی۔ تاجر بھاگ جائیں گے۔ لوگ اس خبر کو پھیلائیں گے کہ عراق کے ساحل پر کوئی نہ جائے اور نہ کسی مال والے کو اپنے مال کی حفاظت کی ضمانت باقی رہے گی۔

اسی قسم کی طویل عبارت کے بعد آخر میں خلیفہ کے نام کے اس میموریل میں لکھا تھا کہ:

"اس بندرگاہ عمان میں بڑے بڑے تجار اور ثروت و دولت والے اس اعتماد

پر مقیم ہیں کہ امیر المومنین کے عدل وانصاف پر ان کو بھروسہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خلیفہ تاجروں کی خاص طور پر نگرانی کرتا ہے اور بری نیت ان تاجروں کی دولت پر جو لوگ رکھتے ہیں ان کو اس کی تلوار نے مایوس بنا رکھا ہے۔"

بہرحال اسٹرائک کے اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقتدر کا جو آدمی بغداد سے آیا تھا یہودی کے چھوڑ دینے پر مجبور ہوا۔

میری غرض اس واقعہ کے ذکر سے یہی ہے کہ اسٹرائک اور ہڑتال کے جس طریقہ کو مغربی طریقہ احتجاج قرار دیا جارہا ہے۔ چاہئے کہ لوگ اس کی بھی نظر ثانی کریں اور اسی پر کیا غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا ایک طوفان ہے جسے مختلف راہوں سے یورپ نے دنیا میں پھیلا دیا ہے۔ لوگوں کا مطالعہ اگر وسیع ہو تو اس قسم کی بہت سی غلط فہمیوں کا وہ ازالہ کر سکتے ہیں۔

مختلف ممالک اسلامیہ کی لسانی خصوصیات

ان مسلمان سیاحوں کی کتابوں میں ایک دلچسپ چیز یہ ہے کہ بعض مقامات کی لسانی خصوصیات کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اس کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ اس علاقے میں زیادہ تر لوگ کن ناموں کو پسند کرتے ہیں۔ مقدسی کو اس کا بہت شوق ہے بلکہ اسی نے ایک مستقل باب اپنی کتاب میں اس کا باندھا ہے کہ ناموں کو بگاڑنے کے مختلف اسلامی ممالک میں اس زمانے میں کیا طریقے تھے۔

مثلاً نیشاپور والوں کی لسانی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ گو زبان تو ان کی فارسی ہے، لیکن خواہ مخواہ اکثر الفاظ میں سین کا اضافہ ان کی عام عادت ہے۔ مثلاً بکفتی کو بکفتسی، بخردی کو بخریدی، بجفتی کو بجفتسی، اسی طرح الفاظ کو کھینچنے کا بھی خاص عارضہ ہے۔ خصوصا ی کا اضافہ ان کے لہجہ میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ مثلاً بگو کو بیگو، بشو کو بیشو، اسی نے مرو والوں کے متعلق بھی لکھا ہے:

"فیہ طولا ومد"

ترجمہ: ان کی زبان میں بڑی کھینچ تان ہے۔

بخارا والوں کے متعلق بھی اکثر شکایت ہے کہ خواہ مخواہ بلا ضرورت الفاظ بڑھاتے ہیں۔ مثلاً مردے کی جگہ یکے مردے کہیں گے۔ سمرقند والوں کی زبان کی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ وہ کاف اور قاف کی بھرمار زیادہ کرتے ہیں۔ مثلاً بگروم کو بقروقم، بکفتم کو بقفسم کہتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مقصد اس کے ذکر سے اسلامی سیاحوں کی جزرسی کی توجہ دلانی ہے۔ اہواز والوں کی زبان کی خصوصیت مقدسی نے یہ بتائی ہے کہ فارسی میں عربی الفاظ کے ٹھونسنے کی عادی ہیں۔ مثال دی ہے کہ این کتاب وصلاً کن، این کار قطعاً کن۔ [المقدسی صفحہ ۴۱۸]

ناموں میں تصرف کی عادت

ہندوستان کے بھی مختلف صوبوں میں ناموں کی تراش و خراش کا کافی رواج ہے۔ غالباً ترخیم کے ناموں کو بگاڑنے کا عربی طریقہ تھا۔ مقدسی نے لکھا ہے کہ:

''علی، حسن، احمد، ناموں کو بگاڑ کر رے والے علکا، حسکا، حمکا کہتے ہیں۔ اور ہمدان والے احمدلا، محمدلا، عیشلا، ساوہ والے ابوالعباس کو ابوالعباسان، حسن کو حسان، جعفر کو جعفران کہتے ہیں۔'' [مقدسی صفحہ ۳۹۸]

مختلف علاقوں کے خصوصی نام

ایک باب مقدسی نے یہ بھی باندھا ہے۔ مثلاً لکھتا ہے کہ:

''قم والے عموماً اپنی کنیت ابوجعفر رکھتے ہیں اور اصفہان والے ابومسلم، قزوین والے ابوالحسین۔''

ضمیمہ

دیوبند اور اکابر دیوبند

ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی

میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے کتب خانہ میں ایک کتاب دیکھنے پہنچا، اتفاقاً ہمارے یہاں کے استاد حدیث محترم مولانا محمد انور بدخشانی کے فرزند مولوی محمد عمر انور سلمہ اللہ تعالیٰ آئے اور فرمانے لگے مولانا مناظر احسن گیلانی (۱۸۹۲ء-۱۹۶۷ء) کی کتاب ''ہزار سال پہلے'' جدید ترتیب کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ کرنی ہے، میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا کہ مولانا گیلانیؒ نے اپنے منصب کا کام نہیں کیا، ایسے کام اور اہل علم کرتے، پھر کیا تھا چہرے کا رنگ بدل گیا، میں طلبہ اور اہل علم سے اس قسم کی بات کرجاتا ہوں اور خود بلا میں گرفتار ہوتا ہوں، یہی یہاں ہوا، میں نے عرض کیا انہیں مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۴۸ھ-۱۲۹۷ھ) کی کتابوں پر لکھنا تھا، یہ کام یہی کرسکتے تھے جو افسوس ہے کہ نہ ہوسکا، بس حکم دیا کہ اس پر آپ کچھ لکھیں، میں نے عرض کیا یہی باتیں لکھوں گا، وہ اس پر راضی ہوگئے، مجھ پر کام کا بوجھ رہتا ہے ''ضغث علی ابالہ'' بوجھ پر اور بوجھ سہی، قہر درویش بر جان درویش، چار پانچ دن کا وعدہ کیا لیکن میرے بیٹے ڈاکٹر حافظ محمد ثانی سلمہ کی شادی کا زمانہ تھا وعدہ پورا نہ کرسکا، ارادہ تھا صفحے دو صفحے لکھ کر جان چھوٹ جائے گی، لیکن میرے لیے قضا و قدر کے فیصلے کچھ اور ہوتے ہیں۔

مادر علمی کی صدا

میں نے مولانا گیلانیؒ پر لکھنے کے لیے قلم پکڑا تو میری مادر علمی یوں گویا ہوئی، مولانا گیلانیؒ میرے سپوت تھے، انہوں نے شروع سے میرا خیال رکھا، آخر عمر میں سوانح قاسمی لکھ کر

میرا حق ادا کیا، تو ان پر لکھنے بیٹھا مجھے بھول گیا، ذرا میری طرف دیکھ! تو نے عمر کاٹی مجھے مڑ کر بھی نہ دیکھا، تو جے پور (راجستان ہندوستان) سے یہاں آنے والا پہلا طالب علم تھا، جب داخلہ کے لیے یہاں پہنچا میں نے تجھے مہمان خانے میں ٹھہرایا، سترہ دن تیری مہمان نوازی کی، تجھے احاطہ مولسری کمرہ نمبر ۲۶ میں جگہ دی، پانچ برس یہاں رہا، مولسری کے کنوئیں سے تجھے ٹھنڈا پانی پلاتی رہی، تیرے عزم وحوصلہ کو بڑھاتی رہی، تو نے شرح ملا جامی سے دورہ تک یہاں پڑھا، میں نے تجھے حضرت مدنیؒ (۱۲۹۶ھ-۱۳۷۷ھ) کا پکا پھل کھلایا، تجھے اس لائق بنایا کہ تو نے پاکستانی یونیورسٹیوں میں جامعہ کراچی میں ''اسلامی کتب خانے عہد عباسی میں'' لکھ کر اس جامعہ سے علم کتب خانہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا دروازہ کھولا، اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۳ء میں ختم ہوگیا، لیاقت نیشنل لائبریری، جامعہ کراچی اور بیرو یونیورسٹی کانو، پھر نائجیریا میں تو نے عمر بسر کی، آخر میں تجھے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری (۱۳۲۶ھ-۱۳۹۸ھ) ٹاؤن کراچی جو پاکستان میں چوٹی کے علماء کا مرکز ہے اس کے بانی بھی میرے سپوت تھے، ۱۴۰۸ھ میں مفتی ولی حسن ٹونکی (۱۹۲۳ء-۱۹۹۵ء) کے ساتھ کہ وہ بھی میرے ساختہ پرداختہ تھے شعبہ تخصص فی الفقہ الاسلامی میں تحقیقاتی مقالات کا مشرف بنوایا، پھر تخصص فی علوم الحدیث کے منصب پر تقرر کرایا، میں نے عرض کیا میں آپ کی نسبت وتعلق کو کہیں فراموش نہیں کرسکا، آپ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے میں ۱۹۵۷ء سے ''معارف'' اعظم گڑھ وغیرہ علمی رسالوں میں آپ کی نسبت سے لکھتا رہا ہوں، وہ کہتی رہی تو نے ابتک مجھ پر لکھنے میں دیر کیوں کی میرے یہاں تاخیر بھی جرم ہے، بات سچ تھی، تاخیر پر معافی مانگی، پھر حکم ہوا لکھ! آخر لکھنا شروع کیا:

عدو کے سامنے آزماتے ہیں وفا میری
قضا کا سامنا ہے آبرو رکھ لے خدا میری

تاریخ دارالعلوم دیوبند کے بنیادی ماخذ

① دارالعلوم دیوبند پر سب سے پہلے سید محبوب رضوی (المتوفی ۱۹۷۹ء) نے تاریخ دیوبند لکھی، جو ۱۹۵۲ء-۷۲ ۱۳ھ میں ادارہ تاریخ دیوبند سے شائع کی گئی تھی، یہ نہایت مختصر کتاب ہے، اب سنا ہے یہ دو جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔

② اس کے بعد ہمارے استاد قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند (۱۳۱۵ھ-۱۴۰۳ھ) نے دارالعلوم دیوبند لکھی جو ۱۳۸۵ھ-۱۹۶۵ء میں دفتر دارالعلوم دیوبند کی طرف سے شائع کی گئی تھی۔

یہ دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی، اس کی تاسیس، وجہ تاسیس، تعلیمی، تبلیغی، انتظامی اور عام افادی کوائف واحوال کا مختصر مگر جامع مرقع ہے۔

③ مکمل تاریخ دارالعلوم دیوبند کتب خانہ مرکز علم وادب آرام باغ کراچی سے شائع کی گئی ہے جس میں مذکورہ بالا دونوں کتابیں اور بعض وہ کتابیں جو صد سالہ جوبلی کے موقع پر شائع کی گئی تھیں اس میں یکجا کی گئی ہیں۔

④ محمد عبدالرشید ارشد نے ماہنامہ الرشید کا دارالعلوم دیوبند نمبر (جلد ۴، شمارہ ۲، ۳) ۱۳۹۶ھ میں شائع کیا، جو گوناگوں معلومات سے آراستہ ہے۔

⑤ انوار قاسمی، یہ انوار الحسن شیرکوٹی (۱۹۰۶ء-۱۹۶۹ء) کی تالیف ہے جو ۱۳۹۲ھ میں شائع کی گئی تھی۔

⑥ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانشگاہ پنجاب لاہور ۹ / ۶۱۰ (دیوبند-دیوبندی)۔

⑦ جامعة ديوبند الاسلامية فی ضوء المقالات البنورية، عربی میں مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار (۱۹۹۷ء) نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی سے ۱۴۰۰ھ-۱۹۸۰ء میں شائع کیا تھا۔

لیکن دارالعلوم دیوبند کی تاریخ اور اس کی خدمات اور کارناموں کے متعلق علمی وتحقیقی

کتاب مرتب نہیں ہو سکی، جس کی خدمات کا دائرہ اور اس کے عالمگیر اثرات کا علمی و تحقیقی جائزہ قاسمیوں پر قرض ہے، ممکن ہے ہندوستان میں اس پر کام ہو رہا ہو یہاں وہ کتابیں آتی نہیں ہیں اس لیے اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔

دارالعلوم دیو بند اور اکابر دیو بند

دیو بند میں جن ارباب صدق وصفا نے پندرہ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ، ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو مدرسہ دارالعلوم کی بنیاد رکھی تھی ان کی فطرت میں گلے از گلزارے صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم اجمعین کی پانچ خوبیاں ودیعت کی گئی تھیں، ان کی زندگی صحابہ وتابعینؒ کے نقش قدم کا نمونہ تھی، چنانچہ فقیہ وامام شام ابوعمرو اوزاعی (۸۸ھ-۱۵۷ھ) نے ان پانچ خوبیوں کو بحسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

"خمسة كان عليها الصحابة والتابعون ،لزوم الجماعة ، واتباع السنة ، وعمارة المساجد، والتلاوة والجهاد"

[تاریخ دیو بند محبوب رضوی صفحہ ۷۵، ادارہ تاریخ دیو بند ۱۹۵۲ء]

ترجمہ: صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم جن پانچ باتوں کی پابندی کرتے تھے وہ ہیں: ① نماز باجماعت (کا اہتمام)۔ ② اتباع سنت۔ ③ مسجد کو نماز اور تعلیم سے آباد رکھنا۔ ④ قرآن پڑھنا (پڑھانا)۔ ⑤ جہاد کرنا۔

① ان ارباب مہر ووفا کی زندگی انہی پانچ باتوں کی پابندگی میں گزری ہے، اس کے آثار یہاں کے پڑھنے پڑھانے والوں میں بھی میری طالب علمی کے زمانے تک نمایاں نظر آتے تھے، یہاں کے نامور شیوخ حدیث اور استادوں کا انہی پانچ باتوں پر عمل زندگی کا طرۂ امتیاز تھا اور ان کی دنیوی شہرت وناموری، علمی وتحقیقی کامیابی وکامرانی اور روحانی ترقی کا یہی راز ہے۔

② اسی طرح ان کی سرشت میں صحابہ وتابعینؒ کے علوم کی ترویج واشاعت بھی ودیعت کی گئی تھی، چنانچہ انہوں نے زندگی بھر یہی خدمت سرانجام دی، ایک ایسی جابر وظالم حکومت کے

زیر نگیں رہ کر جس کی حدود سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، صحابہ وتابعین ؒ کے علوم کی ایسی ترویج واشاعت کی جس کی نظیر کہیں مشکل سے ہی ملے گی، صحابہ وتابعین کے علوم کی تفصیل مؤرخ اسلام علامہ شمس الدین ذہبیؒ (۶۷۳ھ-۷۴۸ھ) کی زبانی سنئے، وہ فرماتے ہیں:

"فما ظنك بعلم المنطق والجدل وحكمة الأوائل التى تسلب الايمان وترث الشكوك والحيرة التى لم تكن والله من علم الصحابة ، ولا التابعين ، ولا من علم الأوزاعى ، والثورى ، ومالك ، وأبى حنيفة ، وابن ابى ذئب ، وشعبة ، بل كانت علومهم القرآن والحديث والفقه والنحو وشبه ذلك.[1]

ترجمہ: تمہارا کیا خیال ہے علم منطق، جدل اور حکمت اوائل فلسفہ وغیرہ کے متعلق جو ایمان کو برباد کرتے، شکوک وشبہات پیدا کرتے اور حیرت میں ڈالتے ہیں، واللہ یہ صحابہ وتابعین کے علوم نہ تھے اور نہ امام اوزاعی، امام ثوری، امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام ابن ابی ذئب اور امام شعبہ کے علم سے ان کا کوئی لگاؤ اور تعلق ہے، بلکہ ان کے علوم ① قرآن ② حدیث ③ فقہ ④ اور نحو اور اسی جیسے ادبی علوم تھے۔[2]

شیوخ واساتذۂ دیوبند کے بنیادی علوم بھی یہی تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں منطق وفلسفہ پڑھایا جاتا تھا مگر اس کی حیثیت ثانوی تھی، انہوں

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱/ص ۲۰۵

[2] حافظ شمس الدین ذہبیؒ المتوفی ۷۴۸ھ نے فقہ رائے واجتہاد کو صحابہ وتابعین ؒ کے علوم میں شمار کیا ہے، راقم سطور نے (اس موضوع پر) ایک نہایت مبسوط مقالہ لکھا تھا جو "السیرۃ" انٹرنیشنل کراچی (شمارہ ۶ و ۷ رمضان ۱۴۲۲ھ اور ربیع الاول ۱۴۲۳ھ) میں شائع ہوا ہے، جس کا عنوان "عہد رسالت میں صحابہؓ کی فقہی تربیت" ہے، الحمد للہ ارباب فکر ونظر نے اسے پسند کیا، ان شاء اللہ یہ مقالہ مزید معلومات کے ساتھ جلد کتابی صورت میں منظر عام پر آجائے گا، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

نے اصل میں صحابہ وتابعینؒ کے علوم کی آبیاری کی اور انہیں از سرِ نو زندہ کیا، ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء، اور ان علوم میں وہ جوہر دکھائے جس کی نظیر ہندوستان میں کم ہی کہیں ملے گی، اور خوبی یہ ہے کہ سید انور شاہ (۱۲۹۲ھ-۱۳۵۲ھ) کے علاوہ دیگر اکابر شیوخ حدیث کو کتابیں کہاں میسر تھیں، انہیں اصلاح وارشاد، یادِ الٰہی، مہمان نوازی اور تعلیم وتدریس اور دیگر ملکی امور سے فرصت کہاں تھی پھر بھی وہ حدیث کی جو توجیہ کرتے ہیں وہ کتابوں میں کہاں نظر آتی ہیں؟ حضرت گنگوہیؒ (۱۲۴۴ھ-۱۳۲۳ھ) اور شیخ الہند (۱۲۶۸ھ-۱۳۳۹ھ) کی درسی امالی اس امر کی شاہد عدل ہیں، حضرت تھانوی (۱۲۸۰ھ-۱۳۶۲ھ) کی بیشتر نکتہ رسی بھی ایسی ہی ہے جو کتابوں کی مرہون منت نہیں۔

④ صحابہ وتابعینؒ کی ان باتوں کے خلاف جب کہیں کوئی تحریک اٹھی اس کے خلاف سب سے پہلے علماء دیوبند سربکف میدان میں اترے، قدیم وجدید تمام فتنوں کی جڑ انہی پانچ باتوں کے خلاف سرگرمیوں میں پنہاں و پوشیدہ ہیں، عقائد کا اختلاف، بدعات، اخلاقی بے راہ روی، اسلامی قوانین کی خلاف ورزیاں، ان کا مذاق اڑانا، نصابی کتابوں اور اسلامی اقدار میں رنگ آمیزی کرنا اور جہاد کے نام سے بیزاری سب کی بنیاد اور جڑ انہی پانچ باتوں کی خلاف ورزی کا پرتو ہیں، جب تک قوم ان باتوں پر عمل پیرا نہیں ہوتی وہ اقوام عالم میں اپنی شناخت برقرار نہیں رکھ سکتی، نہ سربلندی و سرفرازی حاصل کر سکتی ہے، چاہے وہ ایٹم بم بنائے، چاہے آسمان پر کمندیں ڈالے، اس لیے کہ اس کے دل میں وہ ایمان نہیں جو آخرت کی جواب دہی کے لیے بے چین رکھے، وہ ریت کی ایک دیوار ہے:

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
هرگز بمنزل نخواہد رسید

ان ارباب صدق وصفا کی صحابہ وتابعینؒ کے نقش قدم کی پیروی و پابندی ان کے علوم سے وابستگی و شیفتگی کے باوجود انہوں نے نہایت جانفشانی اور اخلاص سے تدریسی خدمات انجام دیں، اللہ تعالیٰ نے ان میں ایسی روشنی اور کشش پیدا کی کہ ہندوستان کے صدیوں سے آباد مرکز علم

بھی ماند پڑ گئے، ایشیاء ہی نہیں بلکہ افریقہ، یورپ اور امریکہ اور بہت سے ممالک سے طلبہ اس مدرسہ کا رخ کرنے لگے تھے، اب بھی آتے ہیں باوجودیکہ اب وہاں دیوبندیوں نے اپنے مدرسے کھول رکھے ہیں، ہندوستان میں نہیں جاتے تو پاکستان آتے ہیں۔

یہ بات نہ تھی کہ اکابر دیوبند اور دارالعلوم کے مسند نشین منطق، فلسفہ وحکمت سے بے بہرہ تھے، انہیں ان علوم میں بھی مہارت حاصل تھی اور وہ جس خوبصورتی سے منطق کے فقرے اور جملے اپنے درس میں استعمال کرتے تھے شاید ہی کوئی کرتا ہو۔

شیخ الہندؒ کے درس بخاری میں صلوۃ الکسوف کی بحث میں جو حدیثیں آتی ہیں ان میں آتا ہے کہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلاف معمول تلاوت لمبی کی، رکوع وسجدے بھی بہت لمبے کیے، اتنے لمبے کہ صحابہؓ نے بار بار رکوع سے کھڑے ہو کر آپ کو دیکھا اور آپ کو رکوع میں پایا۔

یہ روایتیں صحیح سند سے آئی ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی رکوع کیے ہیں، سید انور شاہؒ نے دوران سبق پوچھا اس سے تو تعدد رکوع ثابت ہیں، حضرت شیخ الہندؒ نے یہ اعتراض سنتے ہی برجستہ فرمایا: ''تم اجلی البدیہیات'' کو نظری بنانا چاہتے ہو؟ ہر نماز میں ایک رکوع ہے یہاں بھی ایک ہوگا''۔ پھر انور شاہ نے سبق میں کوئی سوال نہیں کیا۔

کتب خانہ

میری طالب علمی کا زمانہ ایسا تھا جب دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں کتابیں مقفل (Lock and key) میں رکھی جاتی تھیں، اس سے پہلے بھی یہی دستور تھا، یعنی طلبہ کو نصابی کتاب کے علاوہ کتب خانہ کی کسی اور کتاب کے استعمال کی اجازت تھی نہ کتب خانے میں آنے کی، بلکہ کتب خانہ کے دروازے پر ایک لمبی تپائی پڑی رہتی تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ درسی کتاب آغاز سال میں ایک مرتبہ لے جائیں، اور اختتام سال امتحان کے بعد اس تپائی پر واپس کر کے گھر چلے جائیں، کتب خانہ میں داخل نہ ہوں، کتابیں صرف استادوں کے استعمال

میں رہتی تھی، کسی حاشیہ اور شرح سے استفادہ کی اجازت طالب علم کو نہ پہلے تھی، نہ میرے زمانے میں اٹھی تھی، میں جب تک وہاں رہا اس عرصہ میں کسی مہمان کو کتب خانہ دکھانے لے جاتے تو پھر کہیں کتابوں پر نظر پڑتی۔

میں اپنے وطن جے پور (راجستان) سے چھٹیاں گزار کر شوال میں جاتا، مجھے درسی کتابوں کے ایسے نسخے ملتے تھے جس میں چورخی حاشیہ ہوتے تھے، وہ کتابیں اپنی عمر کے دن گن رہی ہوتی تھیں، انہی کو پڑھتا رہتا تھا، میرے ہم سبق، مولانا فیض علی شاہؒ، زکی کیفیؒ، مولانا سید حامد میاںؒ (بانی جامعہ مدنیہ لاہور)، مولانا محمد سالم (مہتمم دارالعلوم وقف دیو بند) وغیرہ تھے، ان کے پاس کتابوں کے اچھے نسخے ہوتے تھے، یہ شروع دنوں میں کتابیں لیتے تھے۔

کتب خانے میں مطالعہ پر پابندی

طلبہ کو کتب خانہ میں کتابوں کے استعمال پر پابندی کی بہت سی وجوہ ہوسکتی ہیں:

① جگہ کی کمی۔ ② عملہ کی کمی۔ ③ طلبہ کی کثرت۔

④ مطالعہ کی اجازت کی صورت میں اسباق سے غفلت۔

⑤ غیر موضوع کی کتابوں میں وقت کی بربادی۔

⑥ کتابوں کے استعمال میں بے احتیاطی۔

بہر حال جو بھی توجیہ کی جائے وہ دل کو نہیں لگتی، طلبہ جب کتابوں کے نام اور مصنفین کے مراتب اور ان کے طبقات سے بے بہرہ رہیں گے انہیں علم کی ہوا کہاں سے لگے گی؟ ذہین زکی طلبہ آئندہ پڑھانے کی خاطر درسی کتاب شوق سے یاد کرتے تھے، اس سے ان کی معلومات کتاب کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتی تھی، انہیں لکھنے کا کوئی موقع نہ ملتا تھا اس لیے کہ لکھنے کے لیے کتابیں ہونی چاہئیں انہیں یہ سہولت میسر نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ دیو بند سے اہل قلم خال خال ہی نکلے ہیں مدرسین کی ہر جگہ کثرت ہے۔

علمی تربیت کی ہر شعبہ میں بہت کمی ہے، ذہین زکی طلبہ کو درسی کتابیں زبانی یاد ہوتی

تھیں، لیکن فن پر نظر نہ ہوتی تھی نہ آئندہ اس کی کوئی راہ نظر آتی تھی، اس لیے کہ اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ ذاتی کتابیں خریدیں، اکثر کے پاس صحاح ستہ تک نہیں ہوتی تھی۔

استادوں کی درسی امالی میں نقائص کی بنیادی وجہ کتب خانوں سے کتابوں کے استعمال پر پابندی ایک اہم عنصر تھا اور ہے، دار العلوم دیوبند کے کتب خانے سے استفادہ کی اجازت نہ تھی ، اس لیے طلبہ مشکوۃ المصابیح اور دورۂ حدیث کے سبق میں شیخ الحدیث اور اساتذۂ حدیث کی درسی تقریریں لکھتے رہتے تھے، یہی وہ مطالعہ میں رکھتے اور کام نکالتے تھے۔

درسی تقریریں

یہی وجہ ہے کہ حضرت گنگوہیؒ (۱۲۴۴ھ-۱۳۲۳ھ) اور شیخ الہندؒ (۱۲۶۸ھ-۱۳۳۰ھ) کی درسی امالی میں بہت سی توجیہیں نہایت مختصر اور الہامی ہوتی تھیں، ذہین فطین طلبہ سمجھ کر لکھتے تھے ان سے صحاح ستہ حل ہوجاتی ہے ، چنانچہ مولانا یحی کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ ”(۱۲۸۸ھ-۱۳۳۴ھ) نے حضرت گنگوہیؒ کی درسی تقریریں سمجھ کر لکھی تھی ، ان میں کتابوں کے حوالے نہیں تھے، وہ طبع زاد تھیں باسانی قید تحریر میں آگئی تھیں وہ درست ہیں۔

درسی امالی لکھنے میں خرابی یہ ہے کہ ذرا بھی ذہن ادھر ادھر ہوا مطلب تک رسائی ممکن نہیں رہتی، شیخ الہندؒ کی درسی تقریروں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے، دو چار زود نویس اور نہایت ذہین و مستعد طلبہ کی درسی کاپیاں سامنے رکھی جائیں تو غور کرنے سے مطلب تک رسائی ہوجاتی ہے ورنہ مطلب کی ترجمانی ایک دو کاپیوں سے پوری نہیں ہوتی ، شیخ الہندؒ کی اردو درسی تقریروں کا مجموعہ شائع کیا گیا تھا، ایک مجموعہ راقم سطور کے کتب خانے میں بھی موجود ہے، اس سے زیادہ صاف اور بہتر نسخہ قاری سید شریف احمد تھانوی زید مجدہ کے پاس موجود ہے، ایڈٹ کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

ان درسی تقریروں میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ طلبہ کی یہ املائی کاپیاں استاد کی نظر سے نہیں گزرتی ہیں، اس لیے ان میں بہت سی خامیاں رہ جاتی ہیں اور عقیدت مند ایسے ہی انہیں

شائع کرتے ہیں، نووارد طلبہ انہیں خریدتے اور کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ کاپیاں قابل اعتماد نہیں ہیں۔

مولانا محمد چراغؒ (۱۳۱۴ھ-۱۴۰۹ھ) نے سید انور شاہؒ کی ترمذی کی تقریر لکھی اور اس کا ایک نسخہ حضرت شاہ صاحبؒ کو پیش کیا گیا، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موصوف کو دیکھنے کا وقت نہ ملا اس لیے تقریظ بھی نہیں لکھی ایسی صورت میں وہ قابل اعتماد و مستند کیونکر قرار پاسکتی ہے۔

بخاری کی درسی تقریر ''فیض الباری'' چونکہ سید انور شاہؒ کی نظر سے نہیں گزری اس میں نقائص موجود ہیں، ضرورت ہے کہ اس پر بالغ نظر ارباب فکر ونظر کی ایک جماعت غور کرے اور اس کے مراجع دیکھے، پھر اسے شائع کیا جائے، بلاشبہ اس پر علامہ شیخ محمد زاہد الکوثریؒ (۱۲۹۶ھ-۱۳۷۱ھ) نے نظر ڈالی ہے، وہ علامہ کی طائرانہ نظر ہے، موصوف نے بہت سی غلطیاں دور کی ہیں، پھر بھی اس پر کام کی ضرورت ہے، آپ نے دیکھا طلبہ پر کتب خانہ میں کتابوں کے دیکھنے پر بندی نے کیا گل کھلائے ہیں؟

مولانا گیلانیؒ نے سید محمد انور شاہؒ سے جب صحیح مسلم پڑھی درسی تقریر بھی لکھی، انہیں اس امر کا اعتراف ہے کہ یہ اچھی طرح نہیں لکھی جاسکی، اس لیے کہ ان کی درسی تقریر لکھنا مشکل ترین کام تھا، ان کی درسی تقریر کو ضبط تحریر میں لانا طالب علم کے بس کی بات نہ تھی، پھر بھی علمی جواہر پاروں سے مرصع تھی، وہ انہیں جان سے زیادہ عزیز تھی، مولانا گیلانیؒ کی یہ درسی تقریر کسی طالب علم نے اڑالی، مولانا گیلانیؒ نے بہت واویلا کیا لیکن فائدہ نہ ہوا، انہیں عمر بھر اس کا قلق رہا، یہ دکھ بھری کہانی جب یاد آتی تو فارسی کا یہ شعر بڑی حسرت سے پڑھتے تھے:

آنچہ از من گم شدہ گر از سلیماں گم شدے
ہم سلیماں ، ہم پری ، ہم اہرمن بگریستے

امالی صحیح مسلم کا یہ مجموعہ کسی طرح علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۱۳۰۵ھ-۱۳۶۹ھ) کے ہاتھ آگیا تھا، موصوف نے فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں اس سے استفادہ کیا اور امالی کا حوالہ بھی دیا ہے، ہمیں مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے توسط سے یہ مجموعہ علامہ شبیر احمد عثمانی کے چھوٹے بھائی فضل احمد

عثمانی سے دیکھنے کے لیے ملا تھا، گو یہ مجموعہ زیادہ ضخیم نہیں مگر علامہ سید انور شاہؒ کے علوم کا آئینہ دار اور بہت سے علمی فوائد سے آراستہ ہے۔

آج کل کتابوں کی بھرمار ہے، کسی درسی امالی کو کیونکر سندی حیثیت حاصل ہو سکتی؟ جب کوئی اعتراض کیا جاتا ہے شیخ الحدیث اور استاد حدیث یہ کہہ کر چھوٹ جاتا ہے کہ یہ طالب علم نے لکھا ہے، میں نے نہیں لکھا، جہاں استاد یہ کہیں غور فرمائیں! ان کاپیوں کی بھلا کیا حیثیت ہے؟ پھر یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ ایسے استادوں کی کاپیاں جنہوں نے عمر بھر کبھی کوئی تحقیقی کتاب نہیں لکھی کوئی تحقیقی مقالہ پیش نہیں کیا اسے کبھی سند کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے؟ اس زمانے میں بعض درسی تقریروں میں اہل علم کی تحقیقات بغیر حوالہ درج کی جانے لگی ہیں، اس سے لائق شاگردوں کی نظر میں استاد کا وقار مجروح ہوتا ہے۔

اکابر دیوبند کی زندگی

دیوبند کے ان خاصان خدا کی زندگیاں بھی صحابہ وتابعینؒ کی سادگی، بے تکلفی، تواضع وانکساری، ایثار وقربانی، ہمدردی اور اخلاص ورضائے الٰہی میں ایک گونہ نسبت رکھتی تھیں، ان کے گھر میں نہ کوئی خادم ہوتا تھا نہ کوئی طالب علم رہتا تھا، بس ایسے اللہ والے تھے کہ گھر کا کام کاج بھی خود کرتے تھے، نیا آنے والا انجان مکان پر آتا ان کا برتاؤ اور رہن سہن دیکھتا وہ ان نفوس قدسیہ کو گھر کا خادم سمجھ بیٹھتا تھا، چنانچہ مولانا معین الدین اجمیریؒ (۱۲۹۹ھ-۱۳۵۹ھ) جو مولانا برکات احمد ٹونکی (۱۲۸۰ھ-۱۳۴۷ھ) کے نامور شاگرد اور معقولات کے زبردست عالم تھے، دلی آئے، شیخ الہندؒ سے ملاقات کے لیے دیوبند پہنچے ان کے مکان پر آئے اور دستک دی، اس کی داستان اپنے شاگرد مولانا منتخب الحق پروفیسر وصدر شعبہ اسلامیات جامعہ کراچی کی زبانی سنئے، جو موصوف نے اپنے شاگرد مولانا ڈاکٹر محمد مظہر بقا کو سنائی تھی، فرماتے ہیں: مجھ سے میرے استاد مولانا منتخب الحق صاحب نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ مولانا معین الدین صاحب اجمیریؒ دلی آئے تو حضرت شیخ الہند کی زیارت کے لیے دیوبند بھی پہنچے، گھر پہنچ کر زنجیر کھٹکھٹائی تو ایک صاحب باہر آئے ان سے

مولانا معین الدین مرحوم نے کہا کہ حضرت شیخ الہند سے کہہ دو کہ اجمیر سے معین الدین آیا ہے، ان صاحب نے مولانا معین الدین کو اندر بلا کر ڈیوڑھی میں پڑے ہوئے پلنگ پر بٹھایا، پھر اندر سے گڑ اور پانی لائے، اور ان کے پاس بیٹھ کر ان کی تواضع کرنے لگے، تھوڑی دیر ہوئی تو مولانا معین الدین نے کہا میاں! ہم نے تم سے کہا کہ حضرت شیخ الہند کو ہماری آمد کی اطلاع کر دو اور تم اب تک ہمارے پاس بیٹھے ہو، ان صاحب نے جواب دیا اگر شیخ الہند سے آپ کی مراد محمود الحسن ہے تو یہ نام تو اس خاکسار کا ہے۔

مولانا محمود حسن کے یہاں دعوت

مولانا سید عبد الحئی لکھنوی اکابر دیوبند کے برتاؤ، حسن اخلاق، تواضع وانکساری کے متعلق ''دہلی اور اس کے اطراف'' میں لکھتے ہیں: مولانا ذوالفقار علی صاحب اور اکثر بزرگان دیوبند بیٹھے ہوئے تھے، مولانا ذوالفقار علی صاحب نے نہایت فراخدلی سے ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا، اور مل کر صدر مقام میں باوجود ہم لوگوں کی معذرت کے بٹھایا، اس کے بعد فرمایا کہ جس وقت میں نے سنا کہ رائے بریلی سے کوئی صاحب آئے ہیں تو میں سمجھ گیا تھا کہ صاحبزادے ہونگے کیونکہ علم سے ان لوگوں کو ہمیشہ سے مناسبت ہے، پھر انہوں نے ایسی باتیں شروع کیں جس کو سن سن کر شرم وندامت سے ہمارے سر جھکے جاتے تھے، اور جتنے وہاں بیٹھے تھے انہوں نے ایسا اظہار عقیدت کیا کہ ہم کو ان بزرگوں کے حسن ظن پر حیرت ہے، ہم لوگوں کی مخدومیت اور اپنی خادمیت کا اظہار ہر ہر بات پر فرماتے تھے۔

سب سے زیادہ شکایت اس بات کی تھی کہ آپ سرائے میں کیوں ٹھہرے؟ کیا آپ ہم کو اپنا خادم نہیں سمجھتے، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ سرائے میں رہیں، مولوی محمود حسن صاحب نے کہا کہ کل میں نے بہت اصرار کیا لیکن انہوں نے مانا نہیں، مولانا ذوالفقار علی صاحب نے کہا کہ آپ نے ان کے انکار کو تسلیم ہی کیوں کیا؟ آخر کو آدمی سرائے بھیجا گیا اور اسباب اٹھوا منگایا۔

حافظ احمد (۱۲۷۹ھ-۱۳۴۷ھ) کا اصرار

اس عرصہ میں کھانا آیا، نہایت اہتمام کے ساتھ کھانا پکوایا گیا تھا، کھانے کے بعد مولوی ذوالفقار علی صاحب نے اپنے ہاتھ سے اور مولوی محمود حسن صاحب نے بستر بچھا کر کہا کہ آپ قیلولہ فرمائیں، ارادہ اسی وقت روانگی کا تھا، مگر حافظ احمد صاحب خلف الرشید مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ نے نہایت اصرار کے ساتھ شب کی دعوت کی نسبت فرمایا، ان کی استدعا ایسی تواضع وانکسار کے ساتھ تھی کہ مجبوراً فسخ عزیمت کرنی پڑی۔

اکابر دیوبند کی تواضع

ان سب بزرگوں نے نہایت افسوس کے ساتھ ذکر کیا کہ آپ دو دن سے آئے ہوئے ہیں، بارش کی وجہ سے ہم لوگوں کو اطلاع نہیں ہوئی، ورنہ سرائے میں حاضر ہوتے اور آپ نے باوجود اس بات کے جاننے کے کہ دیوبند میں سب ہمارے خادم ہیں یہاں فروکش ہونے سے گریز کیا، وہ یہ باتیں کررہے تھے اور ہم شرم وغیرت کے مارے عرق عرق ہوئے جاتے تھے، اے اللہ! ان بزرگوں کا یہ حسن ظن اور ہماری یہ حالت! ان کی یہ حسن عقیدت اور ہماری یہ شامت اعمال! ان میں وہ مسکنت اور غربت ہم میں یہ خودداری اور نخوت! ان میں وہ سادگی اور بے تکلفی ہم میں یہ تکلف اور سیہ مستی!

این الثری میں الثریا ، نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا.

ستمبر ۱۹۴۷ء میں کراچی آیا تو ایک سال یہاں گزرا، ۱۹۴۸ء میں جب میں کراچی سے دیوبند اپنی تعلیم پوری کرنے گیا تو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے ملنے مظاہر العلوم سہارنپور گیا، ظہر کی نماز میں ملاقات ہوئی، بھائی صاحب مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کا سلام پیش کیا، فرمایا واپس کب جاؤ گے؟ میں نے عرض کیا کل جاؤں گا، فوراً ایک صاحب سے کہا ان کے کھانے کا انتظام کرنا یہ کل جائیں گے، اور مجھ سے فرمایا تم مغرب کے بعد میرے پاس اوپر حجرے میں آنا

، میں ظہر کے بعد ان کے یہاں سنن ابوداود کے سبق میں جا بیٹھا، مغرب بعد حجرے میں حاضر ہوا، یہ میری ان کے حجرے میں پہلی اور آخری ملاقات تھی، شیخ الحدیث قد آور خوبصورت اور فربہ تھے، ڈاڑھی سفید ہوگئی تھی، تہ بند اور کرتا زیب تن تھا، حجرے میں داخل ہوا ایک لکڑی کا سادہ اسٹول جس پر پالش بھی نہ تھی رکھا تھا، اس پر چند کتابیں رکھی تھیں، ایک مشکوۃ کا نسخہ تھا، ایک چارپائی جس کا بان اتنا ڈھیلا اور نیچا تھا کہ اس کے اور حجرے کے فرش کے درمیان ایک بالشت سے کم فاصلہ رہ گیا تھا، چارپائی پر ایک دری پڑی تھی، شیخ اس پر بیٹھتے مطالعہ کرتے اور سوتے تھے، یہ شان تھی سہارنپور کے شیخ الحدیث کے حجرے کی، تکلف ونمائش کا یہاں نام نہ تھا، ان آنکھوں نے ایسے بزرگوں کو دیکھا ہے، میری طالب علمی کے زمانے میں ایسے پاک نفوس تھے شہرت اور ہردلعزیزی جن کے قدم چومتی تھی، ذرا صحابہ وتابعینؒ کی زندگی پڑھئے! کیا تھی اور وہ کیا کر گئے انہیں دیکھئے! کیا ذخیرہ علمی چھوڑا لوگوں کی کیسی زندگی سنواری، شیخ الحدیث کی ''آپ بیتی'' اس کی منہ بولتی تصویر ہے۔

جہاد

صحابہ وتابعین خلق خدا کو اسلام کی نعمتوں سے مالا مال کرنے اور دین الٰہی کا بول بالا کرنے کے لیے جہاد کرتے تھے، اکابر دیوبند نے مسلمانوں کی سلطنت کو بحال کرنے اور انگریزوں کو یہاں سے نکالنے کے لیے شاملی میں جہاد کیا، ان میں سے بعض مجاہدین نے میدان کارزار میں گولیاں کھائیں اور جام شہادت نوش کیا، بعض کو دنیا میں بھی جام شہادت کے منھ سے چھو جانے کی چاشنی عمر بھر چاہتے رہے تھے، ان میں ایک مولانا مظہر نانوتویؒ (۱۲۳۲ھ-۱۳۰۲ھ) بھی تھے، چنانچہ ''علمائے مظاہر علوم سہارنپور اور ان کی علمی ودینی خدمات'' میں موصوف کے متعلق منقول ہے: مولانا الحاج مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی (۱۳۲۲ھ-۱۴۱۷ھ) سرپرست مدرسہ عالیہ مظاہر علوم ومفتی اعظم دارالعلوم دیوبند بیان کرتے ہیں کہ:

''مجھ سے ہردوئی میں ایک شخص نے بیان کیا کہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب

زبان بہت کثرت کے ساتھ اپنے ہونٹوں پر پھیرتے رہتے تھے، کسی کے اصرار کے ساتھ دریافت کرنے پر فرمایا کہ ۱۸۵۷ء میں میں بھی جہاد میں شریک تھا، میرے گولی لگی، میں گر گیا، اسی حال میں دیکھا کہ حوریں شربت کے گلاس لیے ہوئے آئیں اور شہداء کو پلانا شروع کر دیا، ایک گلاس میرے سامنے بھی لایا گیا، میں نے جس وقت اس کو منھ سے لگایا اور میرا لب تر ہوا تو دوسری نے یہ کہہ کر وہ گلاس ہٹالیا کہ ابھی اس کی حیات باقی، یہ ان میں سے نہیں ہے، وہ لذت ہونٹوں پر اب تک باقی ہے جو مجھے چین نہیں لینے دیتی"۔

تجارت و حسن معاملہ

صحابہ و تابعینؒ کی تجارت بھی عبادت تھی، ان کا لین دین نہایت صاف ہوتا تھا، دھوکا اور فریب ان کے یہاں نہ تھا وہ چیز کی اچھائی برائی پہلے بتاتے پھر بیچتے تھے، اس لیے ان کی تجارت میں برکت خوب تھی، معاشرہ بھی ترقی کی راہ پر گامزن تھا، انسان کی آزمائش کا ذریعہ اس کی تجارت اور لین دین ہے، اس میں اگر وہ سچا رہا تو قابل اعتبار اور لائق اعتماد ہے ورنہ کچھ نہیں۔

اکابر دیوبند کا طرز معاشرت ان کے بتائے ہوئے اصول پر قائم تھا، یہ حسن معاملہ کا بہت خیال رکھتے تھے، ان کی تجارت دیانتداری وانصاف پر مبنی تھی، یہ خریدار کو چیز کی اصل حقیقت سے پہلے آگاہ کرتے تھے، اس امر کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ سید محمد انور شاہؒ کا رسالہ "فاتحہ خلف الامام" دیوبند سے شائع کیا گیا، اس میں دقیق علمی بحثیں آگئی تھیں، ہر پڑھا لکھا مولوی ان کے سمجھنے سے قاصر تھا، اس لیے کتاب کے آخر میں اشتہار دیا گیا جو اس رسالے سے فائدہ اٹھانے کا اہل ہو وہی اسے خریدے، وہ اشتہار مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ (۱۲۹۴ھ-۱۳۶۴ھ) نے "کلیات شیخ الہند" کے سرورق کی پشت پر دیا تھا، ہدیۂ ناظرین ہے:

"فصل الخطاب" فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں محدثانہ تحقیقات اور عالمانہ مضامین کافی الحقیقت بے مثل رسالہ جو اکابر محدثین کی تحقیقات کا سچا نمونہ ہے

، دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے عربی زبان میں بکمال انصاف تحریر فرمایا ہے، بڑے بڑے علماء بھی مشکل سے سمجھتے ہیں، کم سواد مولوی طلب نہ فرمائیں"۔

[کلیات شیخ الہند، مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۴۰ھ]

کتابی دنیا میں مذکورۂ بالا اشتہار اس قسم کا پہلا اور آخری اشتہار ہے جس کی نظیر کہیں ملنا مشکل ہے۔

انہیں مذکورۂ بالا خصوصیات کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند اور اکابر دیوبند کو قبول عام وتام حاصل ہوا ہے اور اس کی برکات سے براعظموں میں ہر ایک براعظم ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ سب ہی برابر فیض پاتے رہے ہیں۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

مولانا گیلانی کی علمی خدمات

مولانا گیلانی کی علمی تحقیقی، تصنیفی اور تبلیغی مخلصانہ خدمات نے انہیں عوام وخواص کے ہر طبقہ میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا، اردو میں انہوں نے خود بھی اپنے متعلق بہت کچھ لکھا، "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں"، "احاطۂ دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن" اور "مکاتیب گیلانی" میں ان کی زندگی کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

ان کے ہم عصروں ادیبوں میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی (۱۸۹۱ء-۱۹۷۷ء)، مولانا علی میاںؒ (۱۹۱۴ء-۱۹۹۹ء)، سید صباح الدین عبد الرحمن مدیر "معارف" (متوفی ۱۹۸۷ء)، سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ، مولانا عبدالباری ندویؒ نے اور ان کے شاگردوں میں مولانا غلام محمد نے بہت کچھ لکھا ہے، اور مفتی دارالعلوم دیوبند مولانا ظہیر الدین مفتاحی نے "حیات مولانا گیلانی" لکھی۔

مولانا گیلانی کی مطالعہ میں عادت شریفہ یہ تھی کہ وہ جب کسی کتاب کا مطالعہ کرتے قلم اور رجسٹر ساتھ رکھتے تھے، جہاں کوئی کام کی بات نظر آتی فوراً اسے لکھتے، پھر آگے مطالعہ کرتے تھے، بعد میں گوناگوں معلومات کو عنوان اور موضوع کی مناسبت سے علیحدہ کر کے رکھتے، اور جب مواد اتنا ہو جاتا کہ کتاب یا مقالہ اور مضمون لکھ سکیں انہیں معلومات کو یکجا کر کے مضمون یا مقالہ تیار کرتے تھے، چنانچہ بلا تکلف کہہ جاتے ہیں کہ یہ کتاب میں نے اتنے دن میں اور وہ کتاب اتنی مدت میں لکھی ہے، کتاب ناشر چھاپتا اور کماتا تھا خود کبھی کسی سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا۔

مولانا گیلانی کے ترجمہ اسفار اربعہ پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی، یہاں اس کا ذکر کیا جاتا ہے، علامہ صدر الدین شیرازیؒ (۱۰۵۹ھ-۱۶۴۹ھ) کی "الاسفار الاربعۃ فی الحکمۃ" جلد و جلد ثانی جو متوسط تقطیع کے ۱۷۵۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اس کے سرورق پر صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ سرکار عالی لکھا ہوا ہے، اس کا ایک نسخہ میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے، یہ ترجمہ دار العلوم جامعہ عثمانیہ سرکار والی حیدر آباد دکن سے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا گیا تھا، اس کا حصہ اول جلد دوم کا ترجمہ جو ۶۸۷ سے ۱۷۵۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۱۳۵۹ھ میں ختم ہوا تھا اور ۱۹۴۲ء میں شائع کیا گیا تھا، مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مولانا گیلانی نے یہ ترجمہ اس زمانہ میں کیا جب وہ صدر شعبہ تھے، مولانا نے ابتداء میں آغاز ترجمہ کی تاریخ نہیں لکھی، اس لیے ترجمہ کتنے عرصہ میں کیا گیا اس کا پتہ نہیں لگتا، موصوف کے سوانح نگاروں نے بھی اس سے اعتناء نہیں کیا، موضوع کے متعلق صدر شیرازیؒ کے دیباچہ کے ترجمہ کو کافی سمجھا گیا، ترجمہ کی نسبت بھی کچھ نہیں کہا گیا، بظاہر وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کا تعلق علوم اوائل منطق و فلسفہ سے ہے، اب کسے دلچسپی ہے، یہ صحابہ و تابعین کے علوم میں داخل نہیں، مولانا گیلانی نے بھی اس سے تعرض نہیں کیا۔

مولانا عبد الحئی فرنگی محلی (۱۲۶۴ھ-۱۳۰۴ھ) نے منطق و فلسفہ کی کتابوں پر جتنی تعلیقات و حواشی لکھے شاید ہی ہندوستان کے کسی عالم نے اتنے حواشی و تعلیقات لکھی ہوں، لیکن کسی

محقق نے انہیں موضوع بحث نہیں بنایا، حالانکہ ہمارے ذہین ترین طبقہ کا یہ بڑا علمی سرمایہ ہے، مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کا بہت قیمتی وقت ان تعلیقات میں خرچ ہوا، ان کے سوانح نگاروں نے ان سے اعتناء نہیں کیا اور نہ وہ ان کی شہرت میں چار چاند لگا سکے، انہیں جو شہرت ملی وہ فقہ و فتاوی، اصول حدیث، اصول فقہ، علم رجال، موطا امام محمد کی شرح التعلیق الممجد اور الحصن الحصین کے حواشی سے ملی ہے۔

ادارۃ القرآن نے بھی مولانا عبدالحیٔ کے عربی رسائل شائع کیے ہیں جن کا تعلق فقہ وحدیث سے ہے، شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ (۱۳۳۶ھ-۱۴۱۷ھ) نے مولانا عبدالحیٔ فرنگی محل کے انہی رسالوں اور کتابوں پر تعلیقات لکھی ہیں جن کا تعلق علوم حدیث وعلم رجال سے ہے اور انہی تحقیقات وتعلیقات نے انہیں اسلامی ممالک میں متعارف کرایا ہے۔

مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں مقدمہ ابن الصلاح مطبع یوسفی لکھنو سے، کتاب الآثار امام ابوحنیفہؒ اور فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث محمد تیغ بہادر کے مطبع انوار محمدی لکھنو سے شائع کرائی، اس مطبع کی فتح المغیث کا نسخہ جامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن میں موجود ہے، اور کتاب الآثار بار دوم کا ایک نسخہ راقم سطور کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

موصوف نے سید شریف کے رسالہ اصول حدیث کی شرح ''ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی'' لکھی جو پہلی بار لکھنو میں خادم حسین المعروف بنادر حسین نے لکھنو سے ۱۳۰۴ھ میں شائع کی تھی، دسویں صدی ہجری میں شمس الدین محمد الحنفی التبریزی نے اس کی شرح ''الدیباج المذہب فی مصطلح الحدیث'' کے نام سے لکھی تھی وہ ۱۳۵۰ھ میں شائع کی گئی تھی، پھر المصطفی البابی نے ۱۹۵۲ء میں مصر سے دوبارہ شائع کی تھی، اب شرح تقی الدین ندوی کی تحقیقات سے دوبارہ شائع کی گئی ہے۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۱ء تک میں بھی دفتر معجم المصنفین (دارالشفاء اور عثمان شاہی حیدرآباد

دکن) میں اپنے والد منشی عبدالرحیم خاطر کے ساتھ رہا ہوں، یہاں کے دو سالہ قیام نے مجھے علم کا جویا بنایا، معجم المصنفین مولانا محمود حسن خان ٹونکی (۱۲۷۸ھ-۱۳۶۲ھ) نے جو مفتی ولی حسن ٹونکی کے دادا اور مولانا حیدر حسن خان شیخ الحدیث ندوۃ العلماء کے بڑے بھائی تھے عالم اسلامی کے پچاس ہزار مصنفوں کا تنہا تذکرہ مرتب کیا تھا، صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمن خان شیروانی کو جب کسی عالم کے تذکرہ کی جستجو ہوئی کہیں نہ ملا ان کے پاس ملا تو انہیں کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ہوا، انہوں نے اس کی اشاعت کے لیے میر عثمان علی خان والی حیدرآباد دکن کو آمادہ کیا، اس پر نظر ثانی اور اضافہ کے لیے جو عملہ رکھا گیا وہ چار فضلاء پر مشتمل تھا، مولانا عبدالرحمن چشتی بہاری، مولانا محمد عبدالرشید نعمانی، محمد کامل فاضل مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن اور مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی نگران تھے، مسودہ صاف کرنے کے لیے دو کاتب ان میں ایک میرے والد منشی محمد عبدالرحیم خاطر اور دوسرے رضوان علی کا تقرر ہوا تھا، علی میاں کے والد حکیم سید عبدالحئی لکھنوی نے کہا تھا (جیسا کہ مولانا نعمانی نے مجھ سے بیان کیا تھا) کہ ہندوستانی مصنفین کا تذکرہ میں لکھوں گا، چنانچہ معجم المصنفین میں ان کا ذکر نہ کریں، انہوں نے ہندوستان کے مصنفین کو معجم المصنفین میں ذکر نہ کیا، سید عبدالحئی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر میں ان کا تذکرہ لکھا ہے، افسوس ہے معجم المصنفین کی ابتدائی چار جلدیں بیروت سے شائع ہوسکیں تھیں، تقسیم ہند سے یہ سلسلہ بند ہو گیا، معلوم نہیں وہ مسودہ بھی محفوظ ہے یا ضائع ہو گیا۔

معجم المصنفین کے دفتر میں حیدرآباد دکن کے پروفیسر، علماء، فضلاء، شاعر اور ادیب سب کی آمدورفت رہتی تھی، یہاں مولانا گیلانی آتے اور چلے جاتے، پھر ان کا ذکر رہتا تھا، یہاں ان کی زیارت یاد نہیں، لیکن مجلس شوری دارالعلوم سے نکلتے ہوئے مولانا گیلانی کی بارہا زیارت ہوئی ہے، مولانا گیلانی نے جب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت" لکھی تو آٹھویں صدی ہجری کے علماء صوفیہ اور دانشمندوں اور دانشوروں کے حالات کی جستجو ہوئی اور نزہۃ الخواطر مخطوطہ منگا کر دیکھا تو مصنف کی محنت وکاوش اور کتاب کی اہمیت وافادیت نے انہیں اپنا گرویدہ

بنایا، مولانا گیلانی نے مولانا شیروانی سے کہہ کر اس کو دائرۃ المعارف العثمانیہ سے شائع کرنے کی کوشش کی، چنانچہ سب سے پہلے یہی حصہ شائع ہوا اور یہ نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے، اس کی اشاعت کی بدولت عالم اسلامی ہندوستان کے نامور ارباب علم واہل کمال سے واقف ہو سکا ،یہ کارنامہ بھی مولانا گیلانی کے حسنات میں سے ہے، شیخ الہند کے ایک جملے نے کہ آپ ''القاسم'' میں لکھا کریں انہیں لکھنے کا ایسا گرویدہ بنایا کہ وہ اردو زبان میں نت نئے موضوعات مفید معلومات کا ایسا قیمتی علمی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، اور اس باب میں ان کی وسعت معلومات دقت نظر نے ان کی منفردانہ شان کو ہمیشہ قائم رکھا، علمی ادبی اور دینی حلقے آئندہ بھی ان کی یاد کو زندہ رکھے گی، مولانا مجمع البحرین تھے، وہ خانوادہ خیر آبادی اور دیوبندی دونوں کے جامع تھے، وہ خانقاہی سلسلے میں قادریہ اور سہروردیہ دونوں میں مجاز تھے، دیوبندی رہ کر ''معارف'' جیسے علمی رسالے میں لکھتے تھے، حالانکہ ان کا انداز نگارش دارالمصنفین کے ارباب قلم سے یکسر مختلف تھا، اس لحاظ سے وہ ہر میدان میں اپنی شناخت جداگانہ رکھتے تھے، اور دونوں پر تنقید کرنے میں چوکتے نہ تھے، مولانا گیلانی کا رواں دواں قلم حدود وموضوع کی قید سے آزاد ہو کر اور بھی بحثیں کر گذرتا ہے، وہ موضوع سے سرمو انحراف کا قائل نہیں ہے، اس باب میں وہ امام ابن تیمیہ (۶۶۱ھ-۷۲۸ھ) کا قلم ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب سینکڑوں صفحات گھیر لیتی ہے، خوبی یہ ہے کہ لکھنے اور بات کہنے کا ڈھنگ ایسا ہی نرالا اور دلچسپ ہے کہ کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مولانا گیلانیؒ کی دقت نظر، نکتہ رسی اور ان کی تصنیفات کے متعلق ''میری علمی اور مطالعاتی زندگی'' میں رقمطراز ہیں:

> ''مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی کتابوں میں بڑی معلومات اور مواد ہے، بہت سے لوگوں کا ان کے مخصوص طرز تحریر، اور بات سے بات نکالنے کی وجہ سے جی نہیں لگتا، لیکن میرا ہمیشہ ان کی کتابوں میں جی لگا، اور اپنے علم میں اضافہ ہوا، خاص طور پر ان کی کتاب ''النبی الخاتم'' سیرت پر بڑی البیلی کتاب

ہے، اس طرح ان کی دوسری کتاب ''[ہندوستان میں مسلمانوں کا] نظام تعلیم وتربیت'' بڑی پر از معلومات اور موثر کتاب ہے، تیسری کتاب ''تدوین حدیث'' بڑی مبصرانہ اور نکتہ ورانہ تصنیف ہے، ان کا مضمون ''مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ'' بھی بڑی بصیرت و معلومات کا ذریعہ بنا، اور اس سے ان کے دوسرے مقالے جو ''الفرقان'' شاہ ولی اللہ نمبر میں شائع ہوئے تھے تاریخ ہند کے نئے نئے گوشے سامنے آئے''۔

محمد عبدالحلیم چشتی

یادداشت